www.paksociety.com
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
عید مبارک
ستمبر 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر،
نگہت سیما، اسما قادری، شیریں حیدر
اور دیگر مقبول مصنفات کے قلم سے دلکش افسانے
ناول اور ناولٹ اندر کے صفحات میں ملاحظہ کریں

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
انجم انصار

معاون
آمنہ حماد


## اداریہ


مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ — 15


## سلسلے وار ناول


عکس — عمیرہ احمد — 18
زندگی — ناہید سلطانہ اختر — 108


## مکمل ناول


مجھے ہے حکم اذاں — سکینہ فرخ — 148


## ناولٹ


کوئی شہر ایسا بساؤں میں — نگہت سیما — 60
راستوں کی تلاش میں — سدرۃ المنتہیٰ — 201


## افسانے


خود آگہی — اسما قادری — 52
ملن کی رات — کرن احمد — 101
یہی سچ ہے مگر — نظارت نصر — 141
سلام عید — زاہدہ پروین — 185
فریب محبت — شمیم فضل خالق — 223
سرپرائز — رفاقت جاوید — 237
میری عید تم سے ہے — عظمیٰ افتخار — 242
عید کہتے ہیں جسے — شیریں حیدر — 257


## خصوصی مضامین


خوشیوں سے بھرپور یادگار عید — شائستہ زریں — 270
آہ...... لبنیٰ عروج — انجم انصار — 276

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

## مستقل عنوانات


دین کی باتیں — ادارہ — 16
بہنوں کی محفل — مدیرہ — 278
پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید — 291
جلترنگ — انجم انصار — 295
میرا انتخاب — آمنہ حماد — 299
سند لیجیے — پاکیزہ بہنیں — 302
میں اکثر گنگناتی ہوں — صغریٰ زیدی — 304
خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں — 306
روحانی مشورے — ادارہ — 308
ہومیو کلینک — 310



**شعبہ اشتہارات**
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور افراز علی تابش 0332-4214400 رانا لے حمید 0323-2895528
ماڈل: ریا ............ میک اپ: روز بیوٹی پارلر ............ فوٹوگرافر: موسیٰ رضا
جلد 40 • شمارہ 06 • ستمبر 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •


پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE


www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

# بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مجھے کچھ کہنا ہے......!

عیدالفطر دراصل عالم اسلام اور مسلم امہ کے لیے ایک عظیم تحفہ ہے۔ یہ اہل ایمان کا وہ سالانہ مذہبی تہوار ہے جس کی خوشی بچے، بوڑھے، جوان سب ہی مناتے ہیں۔ یہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور انعامات کے شکرانے کا دن ہے۔ چونکہ بندگان خدا رمضان المبارک کے تمام مہینے میں عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے ہیں لہٰذا بندہ مومن کی عبادتوں اور بندگی کے طفیل اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عید سعید کی خوشیاں منانے کا ہر سال موقع فراہم کرتا ہے۔

عید کا تہوار اور دن صحیح معنوں میں ان لوگوں کے لیے خوشی اور راحت کا باعث ہوتا ہے جو پورے مہینے اللہ کی بندگی میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں، اپنے نفس کو پورے مہینے ہر قسم کی اخلاقی، معاشرتی برائیوں سے دور رکھتے ہیں۔ غرباء اور مساکین کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک رسمی تہوار نہیں ہے بلکہ یہ ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنی خوشیوں کے ساتھ دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنا عید کی حقیقی خوشی ہے۔ عیدالفطر کا پر مسرت تہوار اس عہد کی تجدید ہے کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہے اور ہم سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ نسلی، لسانی، علاقائی اور دیگر تفریقیں اسلام کے منافی ہیں، شرف انسانیت اور فضیلت کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے اور یہی حقیقت روزے کی اساس اور عید کی حقیقی روح ہے۔ دلی دعا ہے اللہ تعالیٰ اس مبارک دن کی رحمتوں اور برکتوں سے پوری مسلم امہ میں اتحاد و یگانت پیدا کردے اور آج اسی چیز کی بے حد ضرورت ہے۔ (آمین)

مدیرہ
انجم انصار

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

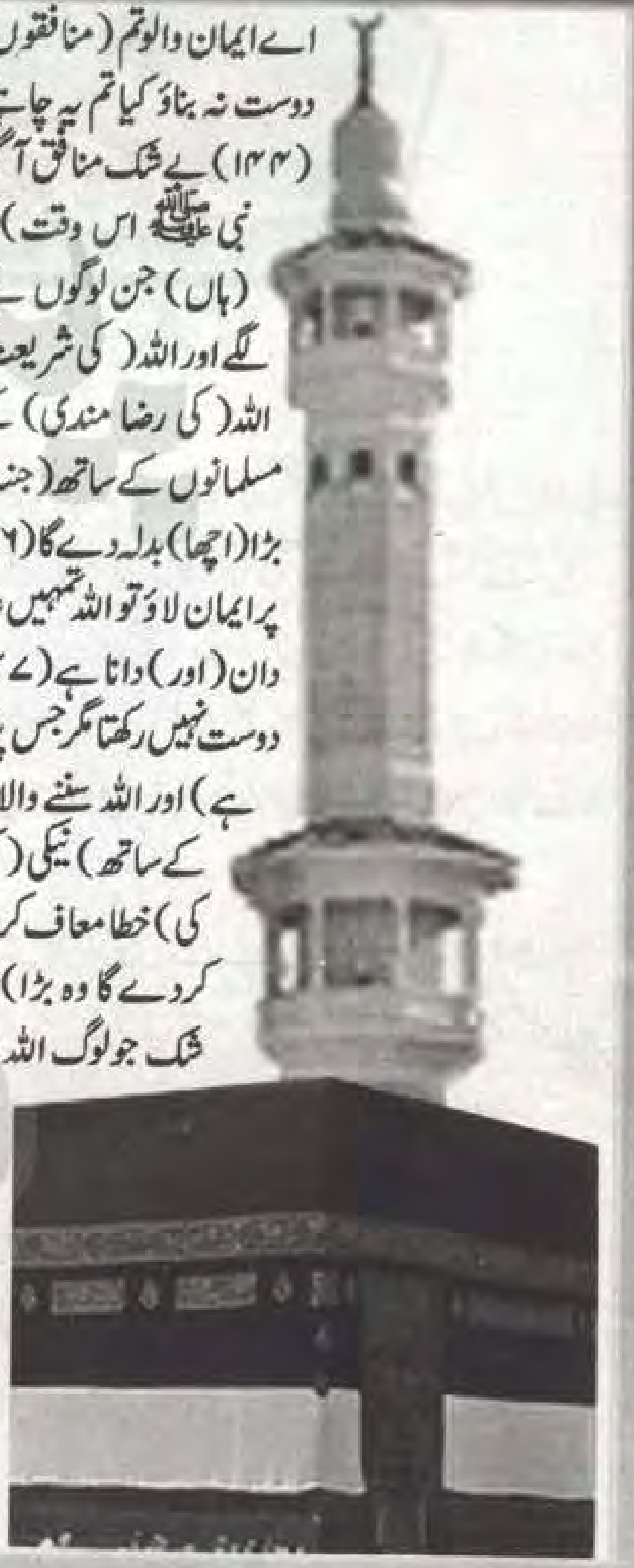

اے ایمان والو تم (منافقوں کی طرح) مسلمانوں کے سوا کافروں کو (اپنا) دوست نہ بناؤ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کا صریح الزام اپنے اوپر قائم کرلو (۱۴۴) بے شک منافق آگ کے نیچے کے طبقے میں ہوں گے اور (اے نبی ﷺ اس وقت) تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے (۱۴۵) مگر (ہاں) جن لوگوں نے (نفاق سے) توبہ کرلی اور نیک کام کرنے لگے اور اللہ (کی شریعت کو) انہوں نے مضبوط پکڑ لیا اور اپنے دین کو اللہ (کی رضا مندی) کے لیے (نفاق سے) خالص کرلیا تو وہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ (جنت میں) ہوں گے اور عنقریب اللہ مسلمانوں کو بڑا (اچھا) بدلہ دے گا (۱۴۶) (اے لوگو) اگر تم (اللہ کا) شکر کرو اور اس پر ایمان لاؤ تو اللہ تمہیں عذاب کر کے کیا کرے گا اور اللہ (تو بڑا) قدر دان (اور) دانا ہے (۱۴۷) اللہ بری گفتگو کے ظاہر کرنے (والے) کو دوست نہیں رکھتا مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو (اس کو ظالم کی برائی بیان کرنا جائز ہے) اور اللہ سننے والا (اور) دانا ہے (۱۴۸) (اور) اگر تم (لوگوں کے ساتھ) نیکی (کرو خواہ اس) کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا (کسی کی) خطا معاف کردو تو بے شک اللہ (بھی تمہاری خطائیں معاف کردے گا وہ بڑا) بخشنے والا (اور) قدرت والا ہے (۱۴۹) بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ میں اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کریں (یعنی اللہ پر تو ایمان لائیں اور اس کے پیغمبروں پر نہ لائیں) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کفر و ایمان کے درمیان ایک (دوسری) راہ نکالیں (۱۵۰)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۴۴ تا ۱۵۰)

---

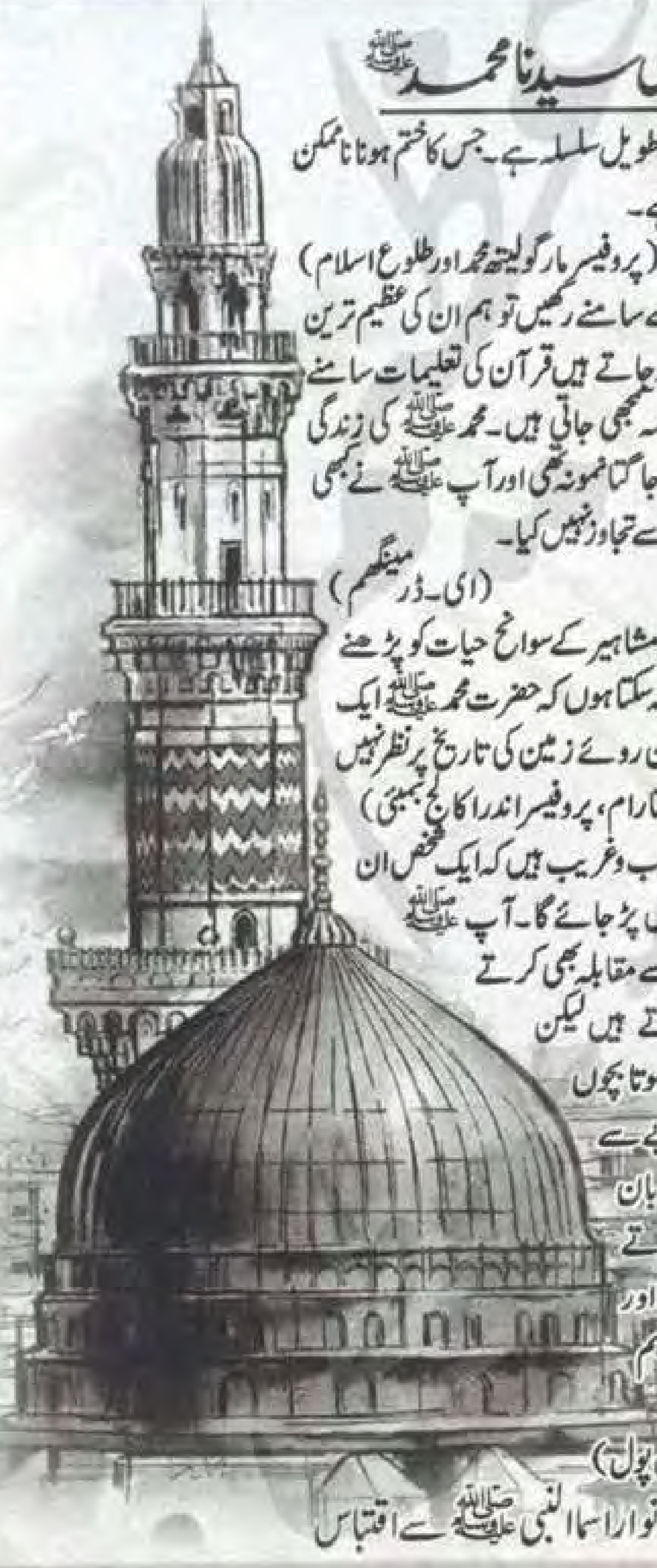

## آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

۷۔ محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت و تکریم ہے۔

(پروفیسر مارگولیتھ محمد اور طلوع اسلام)

۸۔ جو کچھ محمد ﷺ نے کر دکھایا۔ اسے سامنے رکھیں تو ہم ان کی عظیم ترین شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں قرآن کی تعلیمات سامنے رکھ لیجیے یا وہ خوبیاں جو سارے عالم میں مسلمہ سمجھی جاتی ہیں۔ محمد ﷺ کی زندگی قرآنی تعلیمات اور مسلمہ آفاقی سچائیوں کا جیتا جاگتا نمونہ تھی اور آپ ﷺ نے کبھی بھی اپنی گفتار اور اعمال کے ذریعے ان حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

(ای۔ ڈرمینگھم)

۹۔ میں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ مشاہیر کے سوانح حیات کو پڑھنے میں صرف کیا ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ ایک ایسے عظیم انسان ہیں کہ ان کے مقابلے کا انسان روئے زمین کی تاریخ پر نظر نہیں آتا۔

(مسٹر شانتارام، پروفیسر اندرا کالج بمبئی)

۱۰۔ آپ ﷺ کی صفات حمیدہ ایسی عجیب و غریب ہیں کہ ایک شخص ان کے اعمال کا اندازہ لگانا چاہے تو سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔ آپ ﷺ اپنی قوم کی نفرت کا شکار بھی ہوئے ہیں ان سے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ ہاتھوں ہاتھ بھی لیے جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کا خلق عظیم آپ سے کبھی جدا نہیں ہوتا بچوں کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اپنے تبسم آمیز رویے سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں نہایت میٹھی زبان میں بڑے لوگوں سے گفتگو کر کے ان کو مسرور کرتے ہیں نہایت صاف محبت، اعلیٰ درجے کی سخاوت اور شجاعت مردانہ ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم حضور ﷺ کی صفت و ثنا میں منہمک رہیں۔

(سٹینلے لین پول)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

www.paksociety.com

# عکس

قسط 14

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہوجائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



www.paksociety.com

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے، ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہر بانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میونسپلٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑھی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باربی ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی ممی کے ساتھ جاتی ہے۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ جواد کو پولیس نشے کی حالت میں پکڑتی ہے اور وہ عکس سے اپنا رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ نیوز چینل پر یہ خبر بار بار آتی ہے۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے۔ ایبک فاطمہ سے کہتا ہے کہ اس کی ممی اس سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ ایبک کی والدہ اسے کہتی ہیں کہ وہ اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھے فاطمہ کی روم میٹ خانزہ اسے بتاتی ہے کہ اس کی طرح ایبک کے بھائی ایزد نے بھی اس کی بہن سے اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ 26 سال بعد اس شیشے کو وہی دیکھ کر ایبک رک گیا تھا۔ شیر دل حیران تھا کہ وہ عکس مراد علی کو پہچان نہیں پایا۔ عکس اسی گھر میں آ گئی تھی لیکن وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا چاہتی تھی عکس مراد بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بغیر بتائے خیر دین کو بھی بلوا لیا تھا۔ چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے یہ بھی ان ہی سے ایک تھا۔ عکس خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرتی ہے۔ خیر دین پس و پیش سے کام لیتا ہے لیکن عکس اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتی۔ عکس، شہباز پر کیس کرتی ہے تو شیر دل اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ منزہ، شہر بانو کو فون کر کے کہتی ہیں کہ وہ شیر دل کو سمجھائے کہ وہ عکس کو کیس کرنے سے منع کرے۔ خیر دین کی طبیعت خراب ہونے پر شیر دل انتظام کر کے عکس کو سنگاپور سے پاکستان بھیجتا ہے اور اپنا موبائل بھی عکس کو دے دیتا ہے۔ موبائل پر شہر بانو کا میسج آتا ہے تو عکس فون آنے پر شیر دل کو بتا دیتی ہے۔ موبائل پر کسی مسز فاروقی کی کال آتی ہے اور وہ عکس کے نام بتانے سے پہلے ہی کہتی ہے کہ وہ عکس مراد علی ہے۔ عکس حیران رہ جاتی ہے اور شیر دل کا دوبارہ فون آنے پر اسے بتاتی ہے۔ شرمین مسز ایکنس سے ملتی ہے اور ان کے سب بتانے پر شہباز سے پوچھتی ہے کہ اس نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا لیکن شہباز چڑیا کو جاننے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ بات اتنی بڑھتی ہے کہ شرمین شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ شیر دل منزہ سے کہتا ہے کہ انہوں نے شہر بانو سے شیر دل کے منع کرنے کے باوجود بات کی اور شہر بانو نے شرمین کو سب بتا دیا۔ شہر بانو، شرمین سے پوچھتی ہے کہ اس نے طلاق کیوں لی لیکن شرمین بات ٹال دیتی ہے۔ شہر بانو بتاتی ہے کہ اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر دین کی خرابی طبیعت کا سن کر حلیمہ بھی آ جاتی ہے۔ عکس، حلیمہ سے جواد کے نہ ہونے اور خیریت نہ لینے پر افسوس کا اظہار کرتی ہے جواد کو فون کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کی ممی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ منزہ، بختیار شیر دل سے کہتی ہے کہ وہ عکس کو سسپنڈ کروائیں اور بختیار شیر دل یہ کام کر گزرتے ہیں۔ خیر دین کا دل عکس کے نکاح کی تقریب میں ویسے ہی خدشوں کا شکار تھا جیسے کسی بھی باپ کا اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت ہوتا ہے۔ شیر دل خیر دین کو دیکھنے اسپتال آتا ہے تو عکس اس کو منع کر دیتی ہے کہ وہ خیر دین کو کیس کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ شہر بانو واپس پاکستان آ جاتی ہے شیر دل، بختیار شیر دل کو بتاتا ہے کہ شہباز حسین نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی جب وہ نو سال کی تھی اس لیے شہباز حسین نے خیر دین کو جاب سے نکال دیا تھا۔ عکس، غنی حمید کو بتاتی ہے کہ اس کی منگنی ختم ہو گئی ہے، غنی حمید کیس کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ خیر دین، بختیار شیر دل کو ایبک کے والد کے طور پر جانتا تھا لیکن اس کی بیوی کو دیکھ کر وہ چونک جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)





اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی شہر بانو کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا...... گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی، وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھا دیے تھے...... ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوئی ہوئی چمک، بجھی ہوئی رنگت...... وقت نے ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے اپنے وجود اور اس چہرے پر بھی چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔

وہ آئینے میں خود کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی...... لیکن اس آئینے میں نظر آنے والا عکس اس نے کئی سال بعد دیکھا تھا...... ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو...... شیر دل کو...... آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملی تھیں پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا لیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح نظریں چراتے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی...... وہ زندگی جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے...... کئی سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ...... اور ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر...... ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار...... اور اس محبت کو کائی کی طرح اپنے وجود سے نوچتے ہوئے۔

شیر دل اس کے پاس سے گزر کر کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو نے سر اٹھا کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس آئینے کو اور اس گھر کو دیکھا۔

زندگی میں اس گھر سے زیادہ نفرت اسے کبھی کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوئی تھی...... نفرت شاید ایک بہت معمولی لفظ تھا اپنے ان احساسات کو بیان کرنے کے لیے جو وہ اس گھر کے لیے رکھتی تھی...... وہاں کی ایک ایک چیز کے لیے رکھتی تھی...... اگر کوئی اسے کبھی کہتا کہ دنیا میں وہ کون سی ایک جگہ تھی جسے وہ آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی تو شہر بانو اس گھر کا نام لیتی...... اور اس تمام نفرت کے باوجود شہر بانو وہاں آنے اور وہاں رہنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔

☆☆☆

بختیار شیر دل نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے خیر دین کے سامنے پڑی سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لیے بات کا آغاز کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈتے ہوئے انہیں بھی دانتوں پسینے آ گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی کے پاس معذرت کرنے کے لیے پہنچے تھے اور جس چیز کی معذرت وہ کرنا چاہتے تھے اس کا ذکر بھی زبان پر لاتے ہوئے وہ منوں بوجھ کے نیچے دب رہے تھے۔ وہ طبقاتی فرق پر یقین رکھتے تھے لیکن بے ضمیری پر نہیں۔ ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی منزہ نے ایک بار بھی خیر دین کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ بس بے تاثر چہرے کے ساتھ نظریں جھکائے اپنی کلائی میں موجود رولیکس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی رہی۔ بختیار شیر دل کو اسے خیر دین کے پاس معذرت کے لیے چلنے پر تیار کرنے کے لیے زندگی میں پہلی بار بہت سخت لفظوں کا استعمال کرنا پڑا تھا اور ان لفظوں نے منزہ کی خفگی کو جیسے بڑھا دیا تھا۔ شوہر کے غصے نے انہیں ہتھیار ڈالنے اور ان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ دل میں موجود کدورت کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ بختیار شیر دل جیسے ایک چور کو اس گھر میں اس مالک کے سامنے لے آئے تھے جس کے گھر میں ڈاکا ڈالا گیا تھا۔

"آپ کچھ لیں گے؟" غیر متوقع طور پر گفتگو کا آغاز خیر دین نے کیا تھا۔ وہ شاید ان کی مشکل بھانپ گیا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں...... thank you۔" بختیار نے بڑی شائستگی کے ساتھ انکار کیا۔ خیر دین نے ان کے انکار کے باوجود کارنر ٹیبل پر پڑا انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر ملازم سے چائے کے لیے کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ ہتک کی کوئی انتہا تھی جو منزہ اس وقت وہاں خیر دین کے سامنے بیٹھے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسی گھر میں ایک مہینہ اس کی

www.paksociety.com

اور اس کے بچوں کی خدمت کرتا رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کو استری کرنے سے لے کر اس کے جوتے صاف کرنے تک...... صبح اس کو بیڈ ٹی پہنچانے سے لے کر آدھی رات کو کسی بھی وقت طلب کیے جانے پر حاضر ہو جانے تک...... اور اس کی کبھی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ سکے...... وہ ہاتھ باندھ کر آتا تھا، ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا تھا اور اسی طرح ہاتھ باندھے سر جھکائے چلا جایا کرتا تھا اور اب وہ ان کے لیے اس گھر کے اس صوفے پر بیٹھ کر چائے آرڈر کر رہا تھا جہاں پر میزبان بیٹھا کرتا تھا اور اب وہ ان کے ساتھ انہی برتنوں میں چائے پیے گا جن برتنوں میں وہ پییں گے اور یہ سب اس کے اس احمق شوہر کی وجہ سے ہو رہا تھا جو 21 گریڈ کا ایک سیکریٹری ہوتے ہوئے 18 گریڈ کی ایک ڈپٹی کمشنر کے گھر اپنے ضمیر کی چبھن مٹانے آیا تھا۔

''idiot۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے شوہر کو کوسا۔ وہاں خیر دین کے برابر بیٹھنا منزہ کے لیے جیسے کوئلوں کی انگیٹھی پر بیٹھنے کے برابر تھا۔ اتنے سال اپنے بھائی کی جس عزت کو بچانے کے لیے وہ کامیاب جدوجہد کرتی آ رہی تھی وہ آج بیچ چوراہے نیلام ہونے چلی تھی اور اس کا سارا کریڈٹ اس کے ''باضمیر'' شوہر اور الو کے پٹھے بیٹے کو جاتا تھا۔

''میں اپنی فیملی کی طرف سے شہباز حسین سے ہونے والی ساری غلطیوں کے لیے معذرت کرنے آیا ہوں۔'' بختیار نے بالآخر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''شہباز اب اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ میں اسے ساتھ لے کر آپ کے پاس آتا۔ اس نے جو کچھ بھی آپ کے اور آپ کی نواسی کے ساتھ کیا وہ کسی بھی لحاظ سے کسی اچھے انسان کا رویّہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے طرزِ عمل کے لیے آپ سے کتنا شرمندہ ہوں آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔'' آنسو خیر دین کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح ایک لمحے میں اُمڈ آئے تھے۔ اسے بختیار شیر دل سے اتنے کھلے لفظوں میں اس گفتگو کی امید نہیں تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کی ملاقات کس لیے ہو رہی تھی۔ ایک شیر دل کے والدین اگر اس سے ملنے آ رہے تھے تو کس لیے آ رہے تھے...... اس نے بہت سے اندازے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے کسی اندازے میں شہباز حسین نہیں آیا تھا اور اب اتنے سالوں بعد منزہ کو دیکھنے پر اور بختیار کے منہ سے اسی قصے کا ذکر سننے پر وہ جیسے بُری طرح دل گرفتہ ہوا تھا۔ وہ بختیار شیر دل سے اکیڈمی کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کے بعد بھی دو تین سرکاری فنکشنز میں ایک شیر دل کے ساتھ مل چکا تھا لیکن وہ منزہ سے پہلی بار مل رہا تھا۔ بختیار کی گفتگو سنتے ہوئے اس کا ذہن ابھی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا اس سے ایک شیر دل کے بارے میں اتنا بڑا راز چھپا سکتی تھی...... کیا وہ بھی اسی کی طرح اس خاندان کی شناخت سے بے خبر تھی؟ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور تبھی بختیار نے اس کیس کا ذکر شروع کر دیا۔ خیر دین کو کرنٹ لگا تھا تو اس کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا وہ جانتی تھی ایک شیر دل کون تھا اور اس نے پھر بھی خیر دین کو کبھی اس کے بارے میں نہیں بتایا...... کیوں؟ خیر دین کو زندگی میں پہلی بار اپنی چڑیا سے گلہ ہوا تھا۔

☆☆☆

شیر دل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ شہر بانو سے ان دو سوالوں کی ان الفاظ میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ نہ وہ عکس کا ذکر اس انداز میں سننے کی امید رکھے ہوئے تھا۔

شہر بانو کو اس کی اس خاموشی سے خنجر کی کاٹ جیسی تکلیف ہوئی جو ان دو سوالوں کے جواب میں اسے شیر دل سے ملی تھی۔ سارے خدشات، ساری بدگمانیوں، سارے گلے شکووں کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں اسے بھی جیسے ایک عجیب سی امید تھی کہ وہ بے ساختہ انکار کرے گا، تردید کرے گا...... اس نے ایسا تو کچھ نہیں پوچھا تھا اس سے کہ اس کے سامنے کھائی آ جاتی۔ شیر دل کی خاموشی نے اس کے اندر کے شور کو یک دم اور بڑھا دیا تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جواب اتنا مشکل ہے تمہارے لیے۔'' شہر بانو نے عجیب شکست خوردگی کے ساتھ اس





کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ شکست اس کے غصے کو عجیب طرح سے بھڑکانے لگی تھی۔

''احمقانہ باتوں اور سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔'' شیر دل نے بالآخر جیسے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

''احمقانہ؟'' وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ''شیر دل تم اپنے دل سے پوچھو کہ تمہیں یہ سوال احمقانہ لگا ہے؟'' اس نے عجیب چیلنج کرنے والے انداز میں اس سے کہا۔

''ہاں، مجھے لگا ہے۔ اسی لیے کہا ہے تم سے......'' شیر دل نے بڑی خفگی کے ساتھ اس سے کہا۔ ''ہم کیس کو ڈسکس کر رہے تھے...... میرے اور عکس کے حوالے سے کوئی ڈسکشن نہیں ہو رہی تھی۔''

''یہ کیس تمہاری وجہ سے شروع ہوا ہے۔ تمہارے اور عکس کے اس تعلق کی وجہ سے شروع ہوا ہے جس پر تم بات نہیں کرنا چاہتے۔ اس ساری کہانی میں یہ تیسرا اینگل نہ ہوتا تو یہ کیس بھی کورٹ میں نہ ہوتا۔'' شہر بانو نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''شی اس کیس کو تم بھول جاؤ تم اس میں فریق نہیں ہو۔ تم اس کی تفصیلات نہیں جانتیں...... تم حقائق نہیں جانتیں...... اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں تم اس سارے معاملے سے الگ رہو۔'' شیر دل نے اس کی بات کے جواب میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''میں الگ رہوں......؟ میرے باپ کے خلاف ہے یہ کیس...... میں کیسے الگ رہ سکتی ہوں۔'' وہ شیر دل کی بات پر جیسے کچھ اور طیش میں آ گئی۔ ''وہ پاپا کو بدنام کرنا چاہتی ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو اور میں اس سارے معاملے سے الگ رہوں کیونکہ تم کیس میں فریق ہو...... میں نہیں...... اور تم اس لیے فریق بنائے گئے ہو کیونکہ وہ جانتی ہے تم اس کو سپورٹ کرو گے...... تم یہ کیس plead نہیں کرو گے...... And she will walk away with the cake۔'' وہ بے حد طیش میں بول رہی تھی۔ ''اسے مجھے پارٹی بنانا چاہیے تھا...... میں شہباز حسین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ تم تو صرف بھانجے ہو۔''

''اس نے اگر تمہیں یا ممی کو فریق بنانے کے بجائے مجھے فریق بنایا ہے تو یہ اس کی favour ہے۔ تم کو اندازہ ہی نہیں ہے پاکستان کے کورٹ سسٹم کا...... تمہیں اگر پیشیاں بھگتانی پڑتیں اور گواہوں اور ثبوتوں کا انتظام کرنا پڑتا تو تمہاری عقل دو دن میں ٹھکانے آ جاتی وہ بھی اس صورت میں جب یہ کیس 26 سال پرانا ہے۔'' شیر دل نے بنا لحاظ اسے کہا تھا۔ شہر بانو اس کی بات پر تلخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں پاپا کے لیے کچھ بھی کرتی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' شیر دل ذرا سا اس کی طرف جھکا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''اب تم سمجھ سکتی ہو وہ کیوں 26 سال بعد بھی اپنے نانا کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ صرف تم ہی تو محبت نہیں کرتیں اپنے پاپا سے...... ہو سکتا ہے وہ بھی اتنی ہی محبت کرتی ہو۔'' شہر بانو کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی اور پھر جب وہ لفظ ڈھونڈ پائی تو وہ بری طرح اشتعال میں تھی۔

''تم اس سارے معاملے میں کس کے ساتھ کھڑے ہو؟ کس کو سپورٹ کر رہے ہو؟'' اس بار چپ ہونے کی باری شیر دل کی تھی۔ سامنے پڑی ٹیبل پر سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے اس نے شہر بانو سے کہا۔

''یہ میرا dilemma (دہری مشکل) ہے کہ میں کس کو سپورٹ کروں۔'' شہر بانو کو اس کے جملے سے زیادہ اس الجھن نے تکلیف دی جس کے ساتھ وہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

''تمہارے لیے عکس مجھ سے زیادہ Important ہے نا؟'' وہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز میں آ جانے

www.paksociety.com

والی بھڑاہٹ نے خود شہر بانو کو جھنجلایا۔ اسے لگا وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

''تم بات کو ایک بار پھر غلط ٹریک پر لے کر جا رہی ہو۔'' وہ پھر برہم ہوا تھا۔

''نہیں، یہ بالکل صحیح ٹریک ہے۔ تمہیں یہ dilemma صرف اس لیے ہے کہ تمہیں عکس اور میرے درمیان چوائس کرنی پڑ رہی ہے اور اس عورت کے ساتھ تمہاری bonding اتنی strong ہے کہ تمہیں میں نظر نہیں آ رہی...... تمہیں اپنے انکل نظر نہیں آ رہے...... خونی رشتے نظر نہیں آ رہے...... تمہیں صرف عکس نظر آ رہی ہے...... اس کا نانا نظر آ رہا ہے...... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ مجھے غلط فہمی ہے...... میں بات کو غلط ٹریک پر لے جا رہی ہوں۔'' وہ خفگی سے بولتی گئی۔ ''تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ...... یہ عکس کا نانا نہ ہوتا اور ایسا کوئی کیس کسی اور نے میرے پاپا کے خلاف کیا ہوتا تو تم کیا کرتے؟'' شیر دل سگریٹ پیتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس کا dilemma صرف عکس ہی کی وجہ سے تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کیونکہ وہ اس 'ماضی' کا چشم دید گواہ تھا جسے وہ شہر بانو کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شہر بانو کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے عکس مراد علی کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''تمہارے پاس جواب نہیں ہے نا؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس کو خاموش دیکھ کر شہر بانو نے چند لمحے کے بعد خود ہی کہنا شروع کیا۔ ''عکس کی جگہ کسی اور نے ایسا کوئی کیس کیا ہوتا تو تم اس کا حشر کر دیتے۔''

''اگر کیس غلط ہوتا تو!'' شیر دل نے اسے ٹوکا تھا وہ اس کی بات پر اور برہم ہوئی تھی۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ عکس کا نانا جھوٹ نہیں بول رہا اور بابا غلط ہیں۔ تم کیسے 26 سال پہلے ہونے والے ایک واقعے پر judgement دے سکتے ہو۔ صرف اس لیے کیونکہ عکس کہہ رہی ہے۔'' وہ شدید غصے میں تھی۔ ''اب تم پاپا کو کیس چلنے اور اس کا کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ہی مجرم قرار دے رہے ہو۔''

''شی میں نے کیس کی details دیکھی ہیں۔ documents دیکھی ہیں۔ کسی بھی سرکاری ملازم کی ملازمت سے برخاستگی اس طرح نہیں کی جاتی...... انکل شہباز نے قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عکس کے نانا کو ملازمت سے نکالا تھا۔ کوئی جرم ثابت ہوا یا نہ ہو وہ اسی بنیاد پر ہی اپنی پنشن اور مراعات بحال کروا سکتے ہیں کہ ان کو ملازمت سے نکالتے ہوئے مروجہ طریقۂ کار کو اختیار نہیں کیا گیا۔'' شیر دل اسے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بھاڑ میں جائیں تمام قواعد و ضوابط اور طریقۂ کار...... I don't care...... میرے لیے اتنا کافی ہے کہ پاپا نے اس کے نانا کو کسی غلط بات پر سزا دی اور یہ بات ختم ہو گئی......'' شیر دل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

''کوئی بھی بات اس طرح ختم نہیں ہو جاتی شی...... اگر انکل شہباز نے rules کو follow کیا ہوتا تو آج ان کے خلاف یہ کیس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ غلط کام انہوں نے کیا۔''

''جو بھی ہوا ہو گیا۔'' شہر بانو نے اسی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ''پاپا جا چکے ہیں اس دنیا سے اور میں تمہاری کسی گرل فرینڈ کو یہ تماشا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' شیر دل نے اس کے جملے میں موجود اس قابلِ اعتراض لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''تو میں کیا کروں؟ تم بتاؤ مجھے میں کیسے یہ ثابت کروں کہ انکل شہباز غلط نہیں تھے۔'' وہ کچھ جھنجلا گیا تھا۔

''کچھ بھی کرو...... تمہارے اور پاپا کے لیے تو یہ مشکل نہیں ہے۔'' وہ صاف لفظوں میں شیر دل کو جو کہہ رہی تھی اس نے شیر دل کی برہمی میں اضافہ کیا تھا۔

''شی وہ اس شہر میں اس سیٹ پر کام کر رہی اور ضلعی انتظامیہ کی ہیڈ کے طور پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے اور کر رہی ہے...... وہ اس سیٹ پر نہ بھی ہوتی تب بھی اس کیس میں انکل شہباز کو defend کرنا مشکل ہوتا۔''





''وہ suspend ہو چکی ہے اور اس کے باوجود وہ اتنی طاقتور ہے کہ تم اور پاپا اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟'' شہر بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''وہ suspend تھی لیکن اب بحال ہو چکی ہے۔'' وہ شیر دل کی اطلاع پر جیسے چونک گئی تھی۔

''کیسے بحال ہو گئی؟ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا پھر وہ کیسے بحال ہو گئی؟'' اس بار اس کی بات پر شیر دل چونکا تھا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا؟''

''ممی نے بتایا تھا مجھے امریکا میں۔'' شہر بانو نے جواباً کہا۔

''اور یہ تمہارے مشورے پر ہُوا ہوگا۔'' شیر دل نے بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے کہا۔

''ہاں' میں نے ممی سے کہا تھا۔''

''تو اب وہ دوبارہ آ چکی ہے۔'' شیر دل نے اسی برہمی سے کہا۔

''اور یہ تمہاری کوششوں سے ہوا ہوگا۔'' شہر بانو نے تلخی سے کہا۔

''شی تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ مجھے عکس کے کام نمٹانے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے اور اس کا ہر کام میری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔'' وہ اس بار شہر بانو کی بات پر جھنجلایا تھا۔ شہر بانو پر اس کی خفگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''اگر پاپا نے اسے suspend کروایا ہے اور وہ چند ہفتے بھی suspend نہیں رہ سکی اور دوبارہ اپنی پوسٹ پر واپس آ گئی ہے تو یہ تمہاری مدد کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے......؟ یا وہ تم سے اور پاپا سے زیادہ powerful ہے؟''

''شی یہ سوال تم پاپا سے کرنا مجھ سے نہیں۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''اور شی تم ایک بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ اس طرح powers کا استعمال کر کے کوئی فائدہ ہوگا۔ پاپا یا میں اس کو ساری عمر suspend نہیں رکھ سکتے۔ وہ ایک سینئر آفیسر ہے ڈی ایم جی کی۔ ایک باورچی نہیں ہے کہ اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ گورنمنٹ نے 60، 70 لاکھ روپیہ لگوا کر اسے ہارورڈ سے دو سال train کروایا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ گورنمنٹ اسے کسی fake انکوائری میں سالوں suspend رکھ سکتی ہے۔ she is one of the best officers that we have وہ اگر آج جاب چھوڑ دے تو بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ ڈاکٹر ہے...... ہارورڈ گریجویٹ ہے۔ ڈی ایم جی میں دس سال کام کر چکی ہے...... شی وہ پاکستان کے اندر اور باہر کسی بھی آرگنائزیشن میں اس سے بھی اچھی پوسٹ پر کام کر سکتی ہے۔ یہ پوسٹ اس کے لیے مجبوری نہیں ہے اور اس نوکری کو ہم اس کے لیے پھندا نہیں بنا سکتے جو تم چاہتی ہو۔''

''تم یہ سب بتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو مجھ پر؟''

''کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی آنکھوں پر لگی ہوئی تعصب کی اس عینک کو اتار کر اس سارے معاملے کو دیکھو...... عکس مراد علی جو بھی کر رہی ہے وہ کسی بھی لحاظ سے غلط نہیں ہے۔'' شیر دل نے بات کرتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی جو شہر بانو نے انتہائی بے رخی کے ساتھ جھٹک دی۔

''شیر دل تم اس عورت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کس حد تک جاؤ گے؟''

''شی تم بار بار یہ بات کیوں کر رہی ہو؟ تم بار بار اس عورت کو اپنے اور میرے بیچ کیوں لا رہی ہو؟'' اس بار

www.paksociety.com

شیر دل نے بالآخر بہت خفگی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

''میں لا رہی ہوں؟ شیر دل اسے ہم دونوں کے درمیان لا کر تم نے کھڑا کیا ہے۔'' شہر بانو نے جواباً تلخی سے اس سے کہا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو مجھ سے، میں کیا کروں؟'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے یک دم اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''تم اسے کہو گے کہ کیس واپس لے لے تو وہ لے لے گی۔'' شہر بانو نے بالآخر اس سے کہا۔

''میں نہیں کہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ نہیں لے گی۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''شیر دل تم اس عورت کے لیے......'' شیر دل نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

''شمی وہ میری دوست ہے اور دوست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس لیے تم بار بار اس کے اور میرے حوالے سے کچھ ایسا مت کہو جسے سن کر مجھے تمہاری mentality پر افسوس ہو۔'' شہر بانو اس کی بات پر یک دم برہم ہو گئی۔

''تم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے...... مر رہے تھے ایک دوسرے سے شادی کے لیے...... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں تم دونوں کو صرف دوست سمجھوں۔''

''وہ ماضی کی بات ہے اور وہ سب گزر چکا ہے۔ میں happily married ہوں اور اس کی بھی شادی ہونے والی ہے تو تم بار بار وہ والا chapter مت کھولو جسے میں بند کر چکا ہوں۔'' شیر دل نے اس بار بہت خفگی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ واقعی عکس اور اپنا اس پیرائے میں بار بار ذکر سن کر تنگ آ گیا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان زندگی میں پہلی بار اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی اور شیر دل کے لیے شہر بانو کی زبان سے اس طرح کی باتیں سننا سخت تکلیف دہ تھا۔

''تم نے مجھ سے کبھی اپنی زندگی کا یہ chapter شیئر نہیں کیا...... کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم عکس میں انٹرسٹڈ تھے۔'' شہر بانو نے عجیب سی رنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

''شمی کوئی فائدہ ہوتا اس کا...... اور اب بھی اگر ہم یہ ڈسکس کر رہے ہیں تو کوئی فائدہ ہے اس کا۔'' شیر دل نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی تمام تر جھنجلاہٹ اور بیزاری کے باوجود وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں سے عکس اور اس کے حوالے سے اس طرح کے انکشافات سن کر بہت اپ سیٹ ہوئی ہو گی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جاتی اور شیر دل کم از کم اس حد تک وضاحت اور صفائی دینے کا پابند خود کو ضرور سمجھتا تھا کہ اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جاتی اور وہ کسی عدم تحفظ کا شکار نہ رہتی۔

''ہم زندگی میں بہت ساری اسٹیجز میں بہت سارے لوگوں میں انٹرسٹڈ ہو جاتے ہیں پھر وقت اور حالات بدل جاتے ہیں، کچھ اور لوگ ہماری زندگی میں آ جاتے ہیں تو ان کی اہمیت بدل جاتی ہے۔''

''تمہاری زندگی میں عکس کی اہمیت اور جگہ نہیں بدلی۔'' شہر بانو نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ جیسے اسے شیشہ دکھا رہی تھی۔

''وہ میرے لیے تم سے زیادہ اہم نہیں ہے شمی۔'' اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہر بانو سے کہا یہ جانے بغیر کہ اس کی ان چند لمحوں کی خاموشی نے شیر دل کے منہ کھولنے سے بھی پہلے شہر بانو تک اس کا جواب پہنچا دیا تھا۔

''میں تمہاری بیوی ہوں شیر دل اس لیے اہم ہوں...... وہ کیا ہے؟ وہ کس حیثیت سے اہم ہے تمہارے لیے؟'' اس نے عجیب رنج سے اس سے کہا تھا۔





''شمی میرے لیے تم سب سے زیادہ Important ہو۔'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔ شہر بانو تلخی سے ہنس دی۔

''لیکن وہ بھی Important ہے۔''

''شمی وہ ایک دوست ہے اور بس میرے اور اس کے درمیان اب ایسا کچھ نہیں ہے جس پر مجھے تمہارے سامنے شرمندگی ہو۔ نظریں چُرانی پڑیں۔'' شیر دل نے بے اختیار کہا۔

''تم اس سے محبت نہیں کرتے؟'' شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے یک دم کہا۔ ''کہو نہیں۔'' وہ اسے چیلنج کر رہی تھی۔

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' شیر دل نے جواباً اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس کو پہلی بار اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا جس میں وہ منزہ کی مہربانی کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ جس سے وہ آج مل رہا تھا وہ ایک نئی شہر بانو تھی۔

''تم کم از کم اس سوال کا جواب دینے کے پابند ہو، تم کہہ دو تم عکس سے محبت نہیں کرتے۔'' شہر بانو نے اصرار کیا۔

''شمی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' شیر دل نے جواباً اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم اس سے ''بھی'' محبت کرتے ہو۔'' شہر بانو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ شیر دل صرف اس کا نہیں تھا۔ کون سا غرور کہاں مٹی ہوا تھا۔

''شمی......'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شہر بانو اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ رات اس نے مثال کے بیڈروم میں جاگ کر گزاری تھی اور شیر دل نے اپنے بیڈروم میں...... وہ دونوں پوری رات نہیں سوئے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی میں وہ پہلی رات تھی جب وہ ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی دو مختلف کمروں میں رہے تھے۔ وہ دونوں نہیں جانتے تھے وہ صرف پہلی رات تھی آخری نہیں۔

☆☆☆

عکس کو اس شام گھر آ کر خیر دین کے موڈ سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کسی بات پر اپ سیٹ تھا لیکن وہ کیا بات ہو سکتی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ڈنر ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اس نے پہلی بار خیر دین کو اپنے آپ کو بے حد عجیب نظروں سے دیکھتے پایا تھا اور عکس نے ان نظروں کو خود پر جما ہوا پایا۔

''نانا کیا بات ہے؟ آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے بالآخر کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے خیر دین سے پوچھا۔ خیر دین نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پر اپنی بائیں طرف پڑا ایک لفافہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ عکس نے حیران ہو کر اس لفافے کو دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑا اسپُون اور کانٹا پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے اس نے لفافے کو اٹھاتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' خیر دین نے جواب نہیں دیا تھا۔ عکس نے ڈنر ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے وہ لفافہ ٹیبل کے ایک کونے میں دیکھا تھا لیکن اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ خیر دین کئی بار کسی نہ کسی جاننے والے کی کوئی درخواست اسی طرح ڈنر ٹیبل پر لے کر بیٹھا ہوتا تھا اور ڈنر کے بعد اس سے بات چیت کرتے ہوئے وہ اس درخواست پر بھی بات کر لیتے تھے۔ آج پہلا موقع تھا کہ ڈنر کے دوران خیر دین نے اس کے سامنے کوئی لفافہ بڑھایا تھا۔

لفافے میں سے کاغذ نکال کر اس نے اسے کھول لیا۔ وہ سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (SAGAD) کی طرف سے ایشو ہونے والا ایک سرکاری نوٹیفکیشن تھا جس میں خیر دین کی طرف سے اپنی ملازمت کی برخاستگی کو غیر قانونی



www.paksociety.com

اور بلا جواز قرار دینے کے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی پنشن، واجبات اور مراعات کی بحالی کا اعلان تھا۔ وہ کوئی لمبا چوڑا خط نہیں تھا۔ ایک سرکاری کاغذ پر تحریر کچھ سطریں تھیں جنہیں رکی ہوئی سانس کے ساتھ لاشعوری طور پر اس نے کئی بار پڑھا تھا۔ بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت میں...... یہ کام اتنی آسانی سے ہو جانے والا تو اس نے کبھی بھی نہیں سمجھا تھا لیکن وہ کام ہو گیا تھا۔

''یہی وہ دوسرا کام تھا نا جو تم کرنا چاہتی تھیں۔'' اس نے خیر دین کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ خیر دین کی آنکھوں میں جو خوشی اور فخر وہ دیکھنا چاہتی تھی وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تہ کر کے واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے لفافہ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے خیر دین نے اٹھایا تھا اور پھر بڑے پُرسکون انداز میں خیر دین سے کہا۔

''جی نانا۔''

''تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں...... مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ میں تم سے اس طرح کی حماقت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔'' وہ خیر دین سے یہ سارے جملے سننے کی توقع کر رہی تھی لیکن خیر دین نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اس نے اسے کچھ اور کہہ کر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی۔

''آج ایبک شیر دل کے ماں باپ آئے تھے۔'' چمچ کو دوبارہ تھامتا ہوا عکس کا ہاتھ ایک بار پھر فریز ہو گیا تھا۔ اس نے عجیب بے یقینی کے عالم میں خیر دین کو دیکھا تھا۔ اس نوٹیفکیشن کا معما جیسے سیکنڈز میں حل ہوا تھا۔ وہ ایبک شیر دل کی مہربانی تھی۔

''کس لیے آئے تھے؟'' عکس نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''معذرت کے لیے۔'' خیر دین نے مدھم آواز میں کہا۔ عکس ہمت نہیں کر سکی کہ اس سے پوچھ پاتی کہ کس چیز کی معذرت، بہت سارے زخم ایک بار پھر سے رسنے لگے تھے لیکن وہ انہیں ادھیڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

''انہیں شہباز حسین کے رویّے پر شرمندگی اور افسوس تھا۔ تم سے بھی معذرت خواہ تھے وہ۔'' خیر دین نے رک کر اپنی آواز کی بھرّاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عکس نے بھی خیر دین سے نظریں ہٹا لیں۔ کئی سالوں کے بعد وہ دونوں آج اس ایک موضوع کو دوبارہ چھیڑ بیٹھے تھے جس پر وہ اتنے سالوں میں گونگے بن کر رہے تھے۔ لیکن زندگی خاموشی کو بھی خاموش کہاں رہنے دیتی ہے۔ درد کو بھی وقت بن کر کہاں گزر جانے دیتی ہے۔ عجیب طرح سے چُپ توڑتی ہے، عجیب طرح سے ٹیس بن کر اٹھتی ہے۔

معذرت کے وہ چند لفظ اس خاندان کی طرف سے 26 سال بعد آئے تھے اور اس معذرت نے مرہم بننے کے بجائے درد کو جیسے کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ 26 سال بعد اس خاندان نے انہیں اس قابل سمجھا تھا کہ ان کے سامنے اپنی شرمساری کا اظہار کر کے ان سے معذرت کرتا۔ 26 سال بعد انہیں جیسے ''انسان'' اور ''برابر کے حقوق'' والے انسان سمجھ لیا گیا تھا اور یہ جس طرح بھی ہوا تھا اس ٹیبل پر بیٹھے ان دو لوگوں کے لیے راحت اور فخر کا باعث نہیں تھا۔ عکس کے لیے ایبک شیر دل کے خاندان کی طرف سے کی جانے والی معذرت شاکنگ تھی۔ وہ اس کی توقع ان سے نہیں رکھتی تھی۔ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے میز پر پڑا وہ ایک خط بہت تھا جس کے لیے وہ جدوجہد کر رہی تھی۔ معذرت تو بہت غیر متوقع تھی۔

''آپ نے کیا کہا اُن سے؟'' عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

''میں نے انہیں معاف کر دیا۔'' خیر دین یہ بات نہ بھی کہتا عکس کو تب بھی اس کے جواب کا اندازہ تھا۔ ''تم بھی ان کو معاف کر دو چڑیا۔'' خیر دین نے اب اس سے کہا۔ عکس نے سر اٹھا کر خیر دین کو نہیں دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی وہ اس





کی آنکھوں کی نمی دیکھے۔ وہ اس نمی کو پینے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس نے زندگی کی بہت ساری تلخی اور زہر کو پیا تھا لیکن اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ آنکھیں بھی کبھی پیمانوں کی طرح کم ظرفی اور چھوٹا پن دکھانے لگتی ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے اس نے انگلیوں سے آنکھوں کو رگڑ کر جیسے ان کی نمی پی جانے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ہاتھ ہٹاتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکی تھیں اور پھر برستی ہی چلی گئیں۔ ایسی ہی برسات خیر دین کی آنکھوں سے بھی ہو رہی تھی۔ معذرت کا ایک چھوٹا سا لفظ ان کی زندگی میں کچھ بھی بدل نہیں سکتا تھا...... اذیت، رسوائی کا کوئی داغ دھبا ان کے دامن سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا مگر وہ ان کے دلوں کے غبار کو نکل جانے کا موقع دے رہا تھا جیسے کسی بھرے ہوئے آبلے کو کوئی پھٹ کر بہہ جانے دے اور اندر سے نکلنے والا مواد سارا زہر اور ٹیس اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

اتنے سالوں بعد وہ معذرت بے وقعت اور بے معنی تھی۔ ان کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں یہ جنگ اس ایک معذرت سے بہت پہلے جیت چکے تھے لیکن اس کے باوجود ایبک شیر دل کے ماں باپ کا وہاں آ کر معذرت کا اظہار عکس اور خیر دین کے لیے عجیب کتھارسس کا باعث بنا تھا۔

''تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ ایبک شیر دل......'' خیر دین نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ اب اپنے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ جملہ ادھورا چھوڑا تھا اس نے لیکن وہ جملہ ادھورا سمجھ کر نہیں چھوڑا گیا تھا۔ عکس جانتی تھی وہ اس سے کیا کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے پاس خیر دین کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر وہ اب اپنی آنکھیں اور ناک اس سے رگڑ رہی تھی۔ کسی ملازم کے وہاں آنے اور اسے اس حالت میں دیکھنے سے پہلے وہ جیسے خود پر قابو پا لینا چاہتی تھی۔ خیر دین چند لمحے اس کے جواب کے انتظار میں اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''تم ایبک شیر دل کے خاندان کے بارے میں کب سے جانتی تھیں؟''

''انٹر سے...... آپ کو یاد ہو گا ایک debate ہاری تھی میں نے...... وہاں پہلی بار شیر دل کو دیکھ کر پہچانا تھا میں نے۔'' وہ خیر دین سے نظریں ملائے بغیر اپنی پلیٹ میں کانٹا پھیرتے ہوئے اسے بتاتی رہی۔

''اور تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' عکس نے اس بار بھی خیر دین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا...... اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس...... وہ خیر دین کو یہ کیسے بتا دیتی کہ وہ کبھی شیر دل کے اصلی تعارف کو اس کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی۔ اسے ڈر تھا خیر دین اسے شیر دل سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اسے خدشہ تھا خیر دین کو اتنے سالوں بعد یہ جان کر تکلیف ہو گی کہ وہ ایک بار پھر اس خاندان سے رابطے میں ہے جو اُن کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ وہ شیر دل سے دوستی ہو جانے سے بھی پہلے اس بات سے خوف زدہ تھی کہ خیر دین سے اس خاندان کا دوبارہ ذکر کرے...... اس خاندان کا ذکر جیسے اس واقعے سے منسلک اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو دوبارہ لے بیٹھنے کے مترادف تھا۔ خیر دین اور وہ کبھی اس واقعے کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے اور وہ جیسے عکس کے لیے ایک نو گو ایریا بن گیا تھا جہاں سے وابستہ کوئی یاد وہ دُہرانا نہیں چاہتی تھی...... وہاں سے منسلک کسی فرد کو وہ اس حوالے سے شناخت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے ساتھ خدشات اور اندیشوں کے اس ڈھیر میں سے کون کون سا اندیشہ اور خدشہ شیئر کرتی۔

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔'' وہ خیر دین کو یہ جواب نہیں دینا چاہ رہی تھی جو اس نے دیا تھا لیکن جیسے وہ اس کے لاشعور سے کہیں باہر آیا تھا۔ خیر دین نے اسے بے یقینی سے دیکھا وہ اس کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

''چڑیا تم نے ضروری نہیں سمجھا؟'' خیر دین نے جیسے اسی بے یقینی کے ساتھ اسی کا جواب دُہرایا۔ ندامت اور



www.paksociety.com

شرمساری کے ایک عجیب سے احساس نے عکس کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ اپنے نانا سے کوئی بات راز میں نہیں رکھتی تھی لیکن یہ ''راز'' نہیں تھا یہ ان کی زندگی کا وہ mess تھا جس کو اس نے خیر دین کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں اس کی شناخت کے بارے میں آپ کو بتا کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔'' عکس نے بالآخر ایک توجیہہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اس سے اب بھی نظریں نہیں ملا رہی تھی، اب بھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اس ضلع کی حاکم تھی۔ اس ضلع میں پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا تھا۔ اس کے فیصلوں اور احکامات پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ ایس اینڈ جی اے ڈی کے rules اور ریگولیشنز اس کی فنگر ٹپس پر ہوتی تھی اور پاکستان پینل کوڈ کی دفعات اسے طوطے کی طرح رٹی ہوئی تھیں...... وہ گورنمنٹ آف پاکستان کی Ace officer تھی جس کے سامنے اچھے اچھوں کو پسینہ آجاتا تھا لیکن وہ خیر دین کی چڑیا تھی جو اس کی گودوں کھلائی ہوئی تھی اور جس کو وہ اندر باہر سے شیشے کی طرح دیکھ اور پہچانتا تھا۔ وہ اس کی چپ کو کتاب کی طرح پڑھتا تھا اور اس کے جھوٹ کی پیاز کی طرح پرتیں اتار لیتا تھا...... اور اس کے باوجود وہ حیران تھا چڑیا اتنی بڑی بات اس سے کیسے چھپا سکتی تھی۔ وہ خیر دین کو تکلیف سے بچانا چاہتی تھی یا وہ ایک شیر دل کو خیر دین کے کسی متوقع شدید ردِعمل سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خیر دین کو آج بھی یاد تھا بچپن میں ایک شیر دل کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے پر وہ کتنی ناخوش ہوئی تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح خیر دین کی بات اوکے کہہ کر مان لینے کے بجائے بہت ساری تاویلیں اور وضاحتیں دے دے کر خیر دین کو اسے ایک شیر دل کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دینے کے لیے منانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک کے لیے اس کے بچپن کے اُنس سے واقف تھا۔ وہ شیر دل کے لیے اس کی ماضی اور حال کی پسندیدگی اور دوستی سے بھی واقف تھا لیکن اسے اس رشتے کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا یا پھر شاید اسے ایک شیر دل کے حوالے سے چڑیا کی فیلنگز کی صحیح نوعیت اور شدت کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

''آپ کو برا لگا؟'' وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی عجیب سے جانچنے اور پرکھنے والے انداز میں...... بے حد محتاط سی۔

''یہ اتنا برا نہیں لگا جتنا یہ بُرا لگا کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ کیس کرنے کا فیصلہ کیا۔'' خیر دین نے اس سے کہا۔

''میں آپ سے پوچھتی تو آپ مجھے اجازت دے دیتے؟'' عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

''نہیں۔'' خیر دین نے بنا تامل کہا۔

''میں نے اسی لیے نہیں پوچھا آپ سے۔'' عکس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم اتنی سمجھ دار نہیں ہو چڑیا جتنا میں تمہیں سمجھتا تھا۔'' خیر دین نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ خیر دین کی بات پر مسکرا دی۔

''میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے...... اس لیے میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔'' خیر دین اس کے تبصرے سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی؟'' خیر دین اب اس سے کہہ رہا تھا۔

''نانا آپ ضرورت سے زیادہ ڈرتے ہیں۔'' عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''تم اسی وجہ سے suspend ہوئی تھیں؟'' خیر دین کو اب اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے عکس نے اپنی معطلی کے





حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن گھر شفٹ ہو جانے کے بعد خیر دین کو ملازموں سے اس چند روزہ معطلی کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ عکس سے پوچھنے پر اس نے بات کو ٹالتے ہوئے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ کسی کیس پر سیاسی مداخلت کو resist کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر اسے معطل کیا گیا لیکن اب فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ خیر دین کو تشویش پھر بھی ہوئی تھی۔ اس کے دس سالہ کیریئر میں پہلی بار ایسا کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت tactful آفیسر تھی۔ غلط اور ناجائز کام نہیں کیا کرتی تھی لیکن بھاری بھر کم دباؤ اور سفارشوں کو بڑے طریقے سے ٹالتی تھی۔

''نانا آپ tension مت لیا کریں، اب میں سینئر آفیسر ہوں۔ زیادہ پاورز ہیں میرے پاس...... زیادہ پاورز کے ساتھ زیادہ پریشر آئے گا...... لیکن میں ہینڈل کرلوں گی...... آپ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔'' اس نے خیر دین کو دلاسا دیا تھا۔ ''میں اسی لیے suspend ہوئی۔'' عکس نے اس بار جھوٹ بولنے کے بجائے بے حد اطمینان سے خیر دین سے کہا تھا۔ ''اور suspend ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو حالات اس ملک میں ہیں ان میں کوئی آفیسر suspend ہوئے بغیر اپنی مدت پوری کرلے تو وہ معجزہ ہوتا ہے۔''

''چڑیا وہ جنگیں لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔'' خیر دین نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ''یہ میرا کیس تھا میرا معاملہ تھا میں اسے چھوڑ چکا ہوں بھول چکا ہوں کیونکہ مجھے پنشن کے ان چند ہزار روپے اور ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہونے کے لیبل کی اب ضرورت نہیں ہے...... وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا جب یہ سب کچھ میرے لیے کچھ معنی رکھتا تھا۔'' خیر دین نے نرمی سے اس سے کہا تھا۔

''آپ کا کوئی معاملہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہے۔'' عکس نے اتنی ہی نرمی سے خیر دین سے کہا تھا۔ ''آپ کا ہر معاملہ میرا معاملہ ہے...... ہر مسئلہ میرا مسئلہ اور ہر پریشانی میری پریشانی ہے اور آپ مجھ سے یہ مت کہیں کہ آپ سب بھول چکے ہیں اور جاب سے اس طرح کی برخاستگی آپ کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے خیر دین کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

''ضروری نہیں ہوتا چڑیا کہ ہم جس چیز کو بھولے نہ ہوں ہمیں اس کی ضرورت بھی ہو...... تمہاری کامیابیوں نے میری زندگی کے سارے پچھتاوے، ساری حسرتیں ختم کردی ہیں...... میں اگر اپنی اس نوکری کو یاد رکھے ہوئے ہوں تو اس کی وجہ وہ ذلت تھی جس کے ساتھ مجھے اس نوکری سے نکالا گیا...... اس نوکری کے چھوٹ جانے کی کوئی حسرت نہیں تھی جسے میں اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔'' خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

''وہ نوکری میری وجہ سے چھنی گئی تھی وہ ذلت بھی میری ہی وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔'' وہ بہت سالوں بعد پہلی بار اس واقعے کے حوالے سے اپنی اس شرمندگی کو خیر دین کے ساتھ بانٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین کو وہ نو سالہ چڑیا یاد آئی جسے اس نے تھانے سے رہا ہونے کے بعد اس دن اس رشتے دار کی چھت پر کباڑ خانے میں چھپا دیکھا تھا۔ اسے آج بھی ان معصوم آنکھوں کا خوف اور شرمندگی یاد تھی۔ وہ آنکھیں آج خوف اور شرمندگی نہیں لیکن درد کا وہی رنگ لیے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں چڑیا جو بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میں نے اتنے سالوں میں یہ کبھی سوچا تک نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی کسی تکلیف اور ذلت کا باعث تم بنی ہو...... تم میری زندگی کا واحد روشن باب ہو جس کے بارے میں ہر دفعہ سوچتے ہوئے خوشی اور فخر کے علاوہ مجھے اور کوئی احساس نہیں ہوتا۔'' وہ بہت دفعہ کی دُہرائی ہوئی باتوں کو اس کے سامنے ایک بار پھر دُہرا رہا تھا۔ عکس مراد علی ہمیشہ کی طرح ایک مسمرائزڈ سامع کی طرح اس کو سن رہی تھی۔ جیسے کوئی بچہ کسی بڑے سے پریوں کی کوئی ایسی کہانی سن رہا ہو جو ناقابلِ یقین حد تک قابلِ رشک ہو یوں جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو۔



www.paksociety.com

"تمہیں زندگی میں اس اسٹیج پر اگر میری وجہ سے کوئی نقصان پہنچتا تو میں برداشت نہ کر پاتا...... تم نے یہ کیس کرتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ تم اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگا رہی ہو۔" خیر دین نے اب اسے ڈانٹا تھا۔

"زندگی میں آپ نے بہت بار اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگایا ہے۔ ایک بار میں نے لگا دیا تو کیا ہوا؟" اس نے خیر دین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ "میں صرف ریکارڈ ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ ہم تاریخ اور ماضی نہیں بدل سکتے لیکن ان کا ریکارڈ ضرور بدل سکتے ہیں اور ہمیں بدل دینا چاہیے جب بھی ہم بدل سکیں...... میرے نانا چور اور بددیانت نہیں ہیں اور میں ایک جھوٹ کو آپ کی سروس ریکارڈ کا حصہ رہنے نہیں دے سکتی تھی...... اور نانا زندگی میں کسی بھی نقصان سے ڈرنا تو آپ نے ہی مجھے نہیں سکھایا...... اب میں کسی نقصان سے ڈروں تو کس طرح؟" وہ بے حد اطمینان سے خیر دین سے پوچھ رہی تھی۔

"میں پھر بھی تمہیں بے وقوف کہوں گا۔" خیر دین نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ وہ ہنس پڑی۔

"کہہ لیں...... دنیا میں بس دو لوگ مجھے بے وقوف کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔" اس نے عجیب روانی اور بے ساختگی سے کہا پھر ہاتھ میں پکڑے کانٹے سے پلیٹ میں پڑے کباب کو اٹھاتے اٹھاتے اسی بے ساختگی سے رکی۔

"دوسرا شخص شیر دل ہوگا۔" خیر دین نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ پہلا لمحہ تھا جب اس نے شیر دل کے لیے حسد محسوس کیا تھا۔ اسے یہ حسد ایک سلطان سے نہیں ہوا تھا۔ غنی حمید سے نہیں ہوا تھا۔ جواد ملہی سے نہیں ہوا تھا لیکن ایک شیر دل...... خیر دین نے بے اختیار گہری سانس لی۔ کباب کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے عکس مراد علی نے نظریں اپنی پلیٹ پر جمائے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے خیر دین کا اندازہ سنا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

"Thank you" کے دو لفظ عکس کے نام کے ساتھ شیر دل کے سیل فون کی اسکرین پر جگمگا گئے تھے۔ وہ اس وقت آفس میں بیٹھا فون ہاتھ میں لیے کسی کو کال کرنے ہی والا تھا جب عکس کا نام وہاں نمودار ہوا تھا۔ شیر دل کال کرتے کرتے رک گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس text کے جواب میں اسے کال کرتا لیکن فی الحال وہ جس ذہنی کیفیت میں تھا اس میں وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی ڈویژن میں service کر رہے تھے۔ کتنی بھی کوشش کر لیتے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دفتری معاملات کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے بات نہ کرتے لیکن پچھلی رات شہر بانو کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کے بعد شیر دل نے یہ طے کیا تھا کہ وہ عکس سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا اب اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی ممکنہ بہتری کے لیے ضروری تھا۔ عکس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا۔ سیل فون پر ان دو لفظوں کو دیکھتے ہوئے وہ سیکنڈز میں پتا نہیں کیا کیا سوچ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ شکریہ کس چیز کے لیے تھا لیکن اس وقت اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بختیار شیر دل کے ساتھ بیٹھ کر کیے جانے والے اس فیصلے نے اس کے اپنے گھر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے؟" وہ اس کے text کا جواب ٹائپ کر رہا تھا جب اس کا ایک اور text آ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے اور شہر بانو کے حوالے سے پوچھ رہی تھی۔

"Perfect" اس نے جواباً ایک جھوٹ بولا۔ وہ اپنا اور شہر بانو کا مسئلہ کسی اور سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا اور عکس سے اس معاملے کو ڈسکس کرنے کا مطلب مزید خرابی تھا۔

"Great" ایک smiley کے ساتھ عکس کا text اسے آیا تھا۔ شیر دل نے کال کرنے کے بجائے سیل فون بڑی بے دلی کے عالم میں میز پر رکھ دیا۔





شہر بانو اور اس کے درمیان آج صبح بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ مثال کے بیڈروم میں اس کے بیڈ پہ جاگتے ہوئے بھی سو رہی تھی۔ وہ آفس کے لیے نکلنے سے پہلے مثال کو دیکھنے گیا تھا جو جاگ رہی تھی اور صبح سویرے جاگنے کے بعد اس کے پاس بیڈروم میں آ گئی تھی۔ وہ فجر کے آس پاس کا ہی کوئی وقت تھا اور شیر دل کچھ دیر پہلے ہی سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن نیم تاریکی میں بھی مثال سیدھا باپ کے پاس جا کر اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔ اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہوئے شیر دل نے لیٹے لیٹے ہی اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر کمبل کے اندر اپنے سینے پر لٹا لیا تھا۔ وہ نیند میں بھی آنکھیں بند کیے لاشعوری طور پر اس کا سر چومنے لگا۔

"Papa you missed me?" مثال نے اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔

"I missed you a lot" شیر دل نے ایک بار پھر اسی طرح آنکھیں بند کیے اس کا سر چومتے ہوئے کہا۔

"I missed you too" مثال نے پاپا کے اس اعتراف سے بے حد مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

"I know" شیر دل اب جیسے ہلکی غنودگی میں تھا۔

"پاپا آپ زیادہ بزی ہیں؟" شیر دل نے چند لمحوں بعد غنودگی میں مثال کی آواز سنی۔ اس نے نیند کو جھٹکتے ہوئے اسے جواب دینے کی کوشش کی۔

"Not for you honey" اس نے ایک بار پھر اس کے بالوں کو چوما تھا۔

"But Mummy said you are busy and you can't live with us in America." (لیکن ممی کہتی ہیں کہ آپ بہت مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)۔ شیر دل نے اسے جواباً کہتے سنا اور اس نے نیند میں ہی اس کا جملہ سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں سمجھ پایا۔

"Honey we don't have to live in America" (ہنی ہمیں امریکا میں نہیں رہنا ہے)۔ شیر دل نے کہا۔

"But Mummy said we will live there" (مگر ممی کہتی ہیں کہ ہم وہیں رہیں گے)۔ مثال نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شیر دل غنودگی میں ہی اس کی باتیں سن رہا تھا۔ "Only Mummy and I not you because you are busy and you can't live with us in America" (صرف ممی اور میں، آپ نہیں کیونکہ آپ مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)

شیر دل کی آنکھوں سے نیند ایک دم اڑ گئی تھی۔ مثال اسی طرح اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے بول رہی تھی۔ "But I have told Mummy I can't live without you Papa I really love America. Can you please come with us?" (لیکن میں نے ممی کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پاپا مجھے امریکا بہت پسند ہے۔ پلیز ہمارے ساتھ چلیں)

شیر دل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ ان دونوں نے آج تک کبھی مثال کے سامنے کوئی argument نہیں کیا تھا کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کی تھی یہ جیسے ان دونوں کے درمیان طے پائے جانے والا ایک unsaid rule تھا کہ وہ مثال کو اپنے اختلافات سے دور رکھیں گے اور اب وہی بچی اسے شہر بانو کے ساتھ کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہی تھی جس کا سر پیر سمجھ میں نہ آنے کے باوجود شیر دل کم از کم

www.paksociety.com

ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ شہربانو نے اس سے کیا ڈسکس کیا تھا اور اسے شاک اس بات پر لگا تھا کہ وہ سب کچھ پہلے ہی طے کر آئی تھی کہ اسے کس صورتِ حال میں کیا کرنا تھا۔ کیا ان دونوں کا رشتہ اس قدر کمزور تھا کہ وہ شہباز حسین کے مسئلے پر اسے بھی چھوڑ دینے کا تہیہ کیے ہوئے بیٹھی تھی۔ شیر دل کے لیے یہ سب جیسے ناقابلِ یقین تھا۔

"Misal we are not going any where" (مثال ہم کہیں نہیں جا رہے) شیر دل نے بالآخر اس خفگی کو جھٹکتے ہوئے مثال سے دوٹوک انداز میں کہا جو اس وقت وہ شہربانو کے لیے محسوس کر رہا تھا۔

"But why Papa?" (لیکن کیوں پاپا؟) مثال نے احتجاج کیا۔

"Because I want you to live with me" (کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو)۔ شیر دل نے اس سے کہا تھا۔ مثال اگلا سوال کرنے کی تیاری میں تھی لیکن شیر دل فی الحال سوال و جواب کے اس سلسلے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مثال کو ٹوکتے ہوئے پیار سے کہا۔ ’’Papa wants to sleep sweetie‘‘۔

’’oh ok۔‘‘ مثال نے فوراً کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ شیر دل نے آنکھیں بند کر لیں۔

"Papa do you want me to give you a Paarie" (پاپا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو پیار کروں) مثال نے چند لمحے بعد یک دم سر اٹھا کر شیر دل سے کیا۔

"Oh yes honey how can I forget that?" (او ہاں ہنی یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں) شیر دل نے جواباً کہا۔ مثال نے بڑی خوشی خوشی اس کے سینے پر ہی کچھ آگے کھسکتے ہوئے اس کے دونوں گال باری باری چومے۔ یہ بھی ایک معمول تھا۔ وہ اگر شیر دل کے پاس سو رہی ہوتی اور شیر دل تھکا ہوا ہوتا اور سونا چاہتا تو مثال اس کے گال چومتی تھی اور شیر دل ظاہر کرتا جیسے اس کے بعد اسے فوراً نیند آ گئی تھی۔ مثال اس کے گال چومنے کے بعد ایک بار پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر اطمینان سے لیٹ گئی تھی۔ اس کے وجود کے گرد اپنے بازو لپیٹے شیر دل نے آنکھیں بند کر لیں۔ فی الحال دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ سکون کی اس جنت سے بدلنا چاہتا تھا جو اس کے سینے پر اس وقت دھری تھی۔

وہ جس وقت الارم کی آواز پر دوبارہ جاگا تھا اس نے مثال کو اپنے پاس نہیں پایا۔ اسے اندازہ تھا وہ اٹھ کر یا تو واپس شہربانو کے پاس چلی گئی ہو گی یا پھر اس وقت صبح سویرے اپنے معمول کے مطابق گھر میں اِدھر اُدھر پھر رہی ہو گی اپنی کسی سائیکل پر یا کسی کھلونے کے ساتھ۔

گھر کا اندرونی دروازہ ملازموں کے لیے کھولنے کے بعد وہ آ کر آفس کے لیے تیار ہونے لگا تھا اور ناشتا کرنے کے بعد وہ آفس جانے سے پہلے مثال کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ شہربانو جاگ رہی تھی لیکن اس کے کمرے میں داخل ہونے پر اس نے کمبل خود پر کھینچتے ہوئے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شیر دل نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اگر اس نے صبح سویرے مثال کی وہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش ضرور کرتا لیکن اس وقت اس نے بستر میں ایک ٹیڈی بیئر کے ساتھ لیٹی ہوئی مثال کے ساتھ چند باتیں کر کے اسے پیار کر کے خدا حافظ کہا اور آفس آ گیا تھا۔

آفس میں اس دن کام کے دوران وہ لاشعوری طور پر شہربانو کی طرف سے کسی ٹیکسٹ میسج یا کال کا منتظر رہا۔ اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ آفس میں پورے دن کے دوران ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہ ہوا ہو۔ وہ دونوں دن میں ایک آدھ بار ضرور کال کر لیتے تھے چاہے چند منٹ ہی کے لیے...... شہربانو اسے سارا دن text کرتی رہتی تھی اور وہ مصروف ہونے کے دوران بھی ان ٹیکسٹ میسجز کو reply کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے Jokes اور quotes بھی شیر دل کے لیے آفس کی تھکا دینے





والی مصروفیات کے دوران جیسے relaxation دینے والے چند Invaluable لمحے تھے جن کا وہ منتظر رہتا تھا اور آج سیل فون پر اس کے نام کی عدم موجودگی نے شیر دل کے اسٹریس میں بغیر کسی وجہ کے اضافہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے فرینڈز اور بیچ میٹس سے سنتا رہتا تھا کہ بیویوں کے ساتھ ہونے والے تنازعات کس طرح ان کی ذہنی اور کام کی استعداد کو متاثر کرتے تھے لیکن وہ خود پہلی بار اس کا سامنا کر رہا تھا۔

اس دن وہ آفس میں اتنا زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہا تھا کہ شام کو خلافِ معمول آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ شہربانو مثال کے ساتھ لان میں تھی۔ شیر دل ڈرائیو وے میں اترنے کے بعد گھر کے اندر جانے کے بجائے سیدھا لان میں ہی چلا گیا تھا۔ شہربانو لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور مثال سائیکل چلا رہی تھی۔ شیر دل نے ملازم سے اپنے لیے بھی چائے وہیں لانے کو کہا تھا۔ مثال کچھ دیر اس کے ساتھ بات کرتی رہی اور اس دوران شہربانو چائے پیتی رہی۔ جب تک شیر دل کے لیے چائے آئی وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی۔ مثال اب دوبارہ اپنی سائیکل کے ساتھ مصروف ہو چکی تھی۔ شہربانو کو بِنا بات کیے اٹھتے دیکھ کر شیر دل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

’’چائے بنا دو مجھے۔‘‘

’’ملازم کو بھیجتی ہوں وہ بنا دے گا۔‘‘ وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اسے وہاں سے جاتے دیکھ کر شیر دل کا دل کچھ عجیب انداز میں ہر چیز سے اُچاٹ ہوا تھا۔ اس تنازعے کے حل ہونے کے کوئی امکانات نظر نہیں آ رہے تھے سوائے اس کے کہ وہ اس سے جھوٹ بولتا اور وہ اب یہی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

’’یہ جو کچھ بھی ہُوا ہے شیر دل کی وجہ سے ہوا ہے۔‘‘ منزہ نے فون پر شہربانو سے کہا۔ ’’تمہیں اس کے بارے میں اسی سے پوچھنا چاہیے۔‘‘

’’ممی آپ مجھ سے پوچھے بغیر صرف شیر دل کے کہنے پر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہیں؟‘‘ شہربانو نے شدید برہمی کے عالم میں منزہ سے کہا۔ منزہ نے اس کے فون کرنے پر اسے یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ بختیار کے مجبور کرنے پر عکس کے گھر ان کے ساتھ گئی تھیں اور وہاں بختیار نے شہباز کی غلطی تسلیم کرتے ہوئے خیر دین کا دعویٰ درست قرار دیتے ہوئے اس کے واجبات اور مراعات کا نوٹیفکیشن جاری کروا دیا تھا۔ البتہ انہوں نے شہربانو کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں وہاں معذرت کے لیے گئے تھے نہ ہی انہوں نے اس معذرت کی اصل وجہ شہربانو کو بتائی تھی۔ شہربانو کو بتانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ بختیار اور شیر دل نے شہباز کو defend کرنے کے بجائے اس کی غلطی تسلیم کر لی تھی۔

’’اگر میرے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو تم دیکھتیں میں عکس اور خیر دین کا کیا حشر کرتی، میں انہیں مزہ چکھا دیتی اس قسم کا کیس کرنے پر...... لیکن شہربانو میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا یہ سارا مسئلہ شیر دل کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ اگر اس عورت کو اس طرح blindly سپورٹ نہ کرتا تو بختیار کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن شیر دل کو عکس کے سامنے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ماں نہیں...... بیوی نہیں...... وہ انکل نہیں جو سارا بچپن اسے سر پر اٹھائے پھرتا رہا۔‘‘ شہربانو کے ساتھ بات کرتے ہوئے منزہ کو وہ ہتک یاد آ رہی تھی جو انہوں نے شیر دل کے انکشافات کی وجہ سے اپنے شوہر کے سامنے اٹھائی تھی۔ شیر دل نے ان کے شوہر کے سامنے ان کے اپنے خاندان کی جیسے دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں اور منزہ کے لیے ہتک اور ہزیمت کے اس احساس کو بھلانا آسان نہیں تھا لیکن شیر دل کے خلاف شہربانو سے یہ ساری گفتگو کرتے ہوئے انہیں اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ شہربانو اور شیر دل کے درمیان اختلافات کے جو بیج بو رہی تھیں وہ ان دونوں کا رشتہ توڑ دینے کا باعث بنے گا۔

اپنے شوہر کی ماں کے منہ سے سننے والے آخری جملے شہربانو کے لیے بے حد تکلیف دہ اور حوصلہ شکن تھے۔

www.paksociety.com

منزہ نے جیسے اس کے ان خدشات پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی جو وہ عکس اور شیر دل کے کسی تعلق کے حوالے سے رکھتی تھی۔ وہ یہ ساری باتیں کسی دوسرے شخص سے سن رہی ہوتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتی لیکن شیر دل کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ ساری باتیں شہر بانو سے کہنے والی خود منزہ تھیں جو سازشی یقیناً نہیں تھیں لیکن فی الحال لاجواب بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"آپ لوگ میرے پاپا کے خلاف یہ نہیں کر سکتے...... You can't disgrace his name۔" شہر بانو بات کرتے کرتے رو پڑی تھی اور اس کے رونے پر منزہ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔

"بیٹا میں تمہاری فیلنگز سمجھتی ہوں، میں تمہیں بتا چکی ہوں بختیار اور شیر دل کے سامنے میں helpless ہوں۔" انہوں نے گلوگیر آواز میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"آپ helpless ہوں گی ممی...... میں نہیں ہوں۔ اگر پاپا کے خلاف کوئی فیصلہ ہوتا ہے تو پھر کورٹ میں ہو...... کیس چلے...... شیر دل یا پاپا کون ہوتے ہیں میرے پاپا کے نام کو اس طرح خراب کرنے والے...... انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان الزامات کو مان لیں جو عکس اور اس کے نانا کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔" شہر بانو اسی رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ "میں شیر دل سے خود بات کروں گی۔ وہ مجھے بتائے بغیر یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔"

"تم اس سے اب بات مت کرو۔ اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" منزہ نے اسے یک دم ٹوک کر کہا۔ انہیں پہلی بار ایک نیا خدشہ ہوا تھا۔

"ممی مجھے بات کرنی ہے اس سے...... کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔" شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم شیر دل کے شہباز پر لگائے ہوئے کسی الزام پر یقین مت کرنا۔ وہ اس وقت وہی سب کچھ کہہ رہا ہے جو عکس کہہ رہی ہے۔" منزہ نے جیسے حفظِ ماتقدم کے تحت اس کو پہلے سے شیر دل کے ممکنہ الزامات کے انکشاف پر ان سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ شہر بانو کو منزہ کی بات اور اس کا کوئی سیاق و سباق سمجھ آیا تھا نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ منزہ اسے کوئی وارننگ نہ بھی دیتی تب بھی وہ شیر دل کی کسی بات پر یقین کرنے والی نہیں تھی۔

اس رات ان کا ایک اور شدید جھگڑا ہوا تھا اور وہ شیر دل کے جھوٹ سے شروع ہوا تھا۔ اس نے مصالحت کی ایک اور کوشش کا آغاز کرتے ہوئے ڈنر ٹیبل پر شہر بانو سے کہا تھا کہ عکس نے کیس واپس لے لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب اتنا جھوٹ بول دینے کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ شہر بانو کو کبھی پتا نہیں مل سکتا تھا کہ کیس واپس لیا گیا تھا یا اسے نمٹایا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب عکس کے ساتھ معاملہ مصالحت آمیز انداز میں حل کر لینے کے بعد شہر بانو سے ایک چھوٹا سا جھوٹ بول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن اسے اپنی بدقسمتی کا اندازہ نہیں تھا۔

"تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو شیر دل۔" شہر بانو اس کے انکشاف پر یک دم جیسے آگ بگولا ہو گئی تھی اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیر دل اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے فریز ہو گیا تھا۔ وہ اس ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"بیٹا تم نے کھانا کھا لیا؟" شیر دل نے شہر بانو کی بات کے جواب میں مثال سے کہا تھا جو بہت ہکا بکا سی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

"Yes" اس نے بہ مشکل شیر دل سے کہا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد عجلت کے عالم میں وہ کرسی سے اتر گئی۔ پھر وہ عجیب خوف کے عالم میں وہاں سے چلی گئی تھی یوں جیسے اسے اندازہ تھا کہ اب اسے ان دو بڑوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"تم مثال کے سامنے کس طرح بات کر رہی تھیں؟" مثال کے وہاں سے چلے جانے کے بعد شیر دل نے بے





حد خفگی سے اس سے کہا۔

"I don't care۔" شہر بانو نے جواباً بے حد تلخی سے اسے کہا۔ "اگر تمہیں میرے باپ کی پروا نہیں ہے تو مجھے تمہاری بیٹی کی پروا نہیں ہے۔" شیر دل اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو شیر دل......؟ idiot...... تمہیں کیوں ساری دنیا میں ایک میں ہی عقل سے پیدل لگتی ہوں۔" وہ بے حد خفگی سے بول رہی تھی۔

"شہر بانو میں یہاں تم سے argument نہیں کروں گا کیونکہ میں نوکروں کو کوئی تماشا نہیں دکھانا چاہتا۔ تم بات کرنا چاہتی ہو کھانا کھانے کے بجائے تو چلو بات کر لیتے ہیں۔" شیر دل بھی کچھ برہمی کے عالم میں کھانا چھوڑ کر ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔

آگے پیچھے چلتے وہ دونوں بیڈ روم میں آ گئے تھے اور بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے ہی شیر دل نے اس سے بے حد خفگی سے کہا۔ "شہر بانو اب اس سارے تماشے کو ختم کر دو...... I have had enough of it مجھے تمہیں جتنی وضاحتیں دینی تھیں میں دے چکا، جتنی صفائیاں پیش کرنی تھیں میں نے کر لیں...... انکل شہباز کا کیس ختم ہو چکا تھا اور ہم اب اس معاملے پر بات نہیں کریں گے۔"

"کیس ختم نہیں ہوا تم نے کیس ختم کروایا ہے۔ میرے پاپا کو جھوٹا اور غلط ثابت کر کے اور اس پر تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے کہ عکس نے کیس واپس لے لیا۔" شہر بانو پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"اگر ممی نے تمہیں ہر چیز کے بارے میں update کر دیا ہے تو ان سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے تھا تمہیں کہ ہم یہ کیس عکس کی terms پر حل کرنے پر کیوں تیار ہوئے۔" شیر دل نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"عکس کی وجہ سے ہوا یہ سب کچھ۔" شہر بانو نے بے ساختہ کہا اور وہ بری طرح مشتعل ہو گیا۔

"تم نے اگر اب ایک بار بھی میرے اور اس کے حوالے سے کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے اگر افیئر چلانا ہوتا تو میں دس سال پہلے اس کے ساتھ شادی کر کے بیٹھا ہوتا۔ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو تم مجھے نہیں جانتیں کیا؟" وہ بہت خفگی میں کہہ رہا تھا۔

"شیر دل میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔ جس شیر دل کو میں جانتی تھی وہ تم نہیں ہو۔" وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ شہباز حسین کے معاملے کو ڈسکس کر لینا چاہیے اس سے شہر بانو کو کتنی بھی تکلیف کیوں نہ ہوتی۔ شہر بانو کی بات سنتے ہوئے شیر دل نے سوچا تھا اور اسے ایک بار پھر اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک اور غلط فیصلہ غلط وقت پر کر رہا تھا۔

"شہر بانو بیٹھو۔" شیر دل نے بالآخر اس کو بازو سے پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھا لیا تھا۔ شہر بانو پر بہت غصہ ہونے کے باوجود شیر دل کو اس وقت سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اگر شہر بانو کو شہباز حسین کے حوالے سے تفصیلات بتائے تو کس طرح بتائے۔ اسے وہ بت توڑنا تھا جو شہر بانو ساری عمر پوجتی رہی تھی اور اس بت کے ٹکڑے شہر بانو کو بھی بری طرح زخمی کرنے والے تھے۔ وہ خفگی بھرے انداز میں منتظر تھی اس کے کچھ بولنے کی۔

"میں تمہیں کبھی یہ سب بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں اس سے تمہیں بہت تکلیف پہنچے گی لیکن تم نے مجھے بہت مجبور کر دیا ہے۔ تم نے میرے پاس دوسرا کوئی آپشن چھوڑا ہی نہیں۔" شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا تھا۔ وہ ماتھے پر بل لیے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر شیر دل نے کہا۔ "شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اس وقت نو سال کی تھی اور خیر دین کو نوکری سے انکل شہباز نے صرف اپنے اس جرم کو چھپانے کے لیے نکالا تھا۔" شیر دل نے



www.paksociety.com

شہر بانو کا چہرہ سفید ہوتے دیکھا...... شاک، بے یقینی، خوف...... کیا نہیں تھا اس چہرے پر...... اسے شہر بانو پر ترس آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھنا چاہتا تھا اور اس نے آگے بات شروع کرنے کی کوشش کی جب شہر بانو نے اس کے چہرے پر پوری قوت سے تھپڑ کھینچ مارا۔ شیر دل نے دوسرے تھپڑ سے پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"Don't you dare do this again...... ہاتھ اٹھانا مجھے بھی آتا ہے لیکن بہتر ہے ہم اس کا استعمال نہ کریں۔" اس نے شہر بانو کی دونوں کلائیوں کو بہت طیش کے عالم میں جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اتنا گر سکتے ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی شیر دل۔" اس نے شہر بانو کو کہتے سنا۔ اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اپنی ممی سے پوچھو اور......" شیر دل نے سرد مہری سے کہا لیکن شہر بانو نے تقریباً چلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی اور تم دوبارہ پاپا کے بارے میں ایسی کوئی بات کرنے کی جرأت بھی مت کرنا۔" شیر دل نے اسے زندگی میں پہلی بار چلاتے سنا تھا یہ نا قابلِ یقین تھا وہ اس انکشاف پر اُس سے اِس ردِ عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تمہاری ممی نے کہا تھا مجھ سے کہ تم اب یہی کرو گے...... اس عورت کے کہنے پر پاپا پر الزامات لگاؤ گے لیکن میں کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم ایک دو ٹکے کی عورت کے لیے اپنی فیملی، اپنے خونی رشتے پر کیچڑ اچھال سکتے ہو۔" وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے قریب سے اٹھ گئی تھی۔ شیر دل کو زندگی میں کبھی منزہ پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا انہوں نے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کی کوشش میں اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

شہر بانو اب وارڈروب کھول کر اس میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی تھی۔ اس کا ذہن اس وقت صدمے اور غصے سے ماؤف ہو رہا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" شیر دل نے اسے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے دیکھ کر پوچھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

"میں تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ ممی تمہارے بارے میں جو بھی کہتی تھیں وہ ٹھیک کہتی تھیں کہ تمہاری فیملی کے مرد......" وہ بے حد غصے میں بات کرتے کرتے رک گئی۔

"جملہ پورا کرو اپنا شہر بانو...... رکو مت۔" شیر دل نے اسے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

"تمہاری ممی کے اس جملے میں جس مرد کا ذکر ہے وہ انکل شہباز ہیں اور اس جملے میں ان کا ذکر کیوں ہے میں تمہیں ابھی یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔" شیر دل نے سرد مہری سے اس سے کہا۔ وہ فی الحال شہر بانو کو سمجھا بجھا یا منا کر روکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کو سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی خفگی جیسے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شہر بانو جذباتی اور امیچور تھی اس کا اندازہ اسے اس سے شادی کرتے وقت بھی تھا لیکن اس سے شادی کے تمام سالوں میں آج پہلی بار اس کی وہ دو خامیاں اس کے لیے مسائل کھڑے کر رہی تھیں۔

"میں تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں شیر دل، تمہیں اب یہ سب بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر اس پر چلائی تھی۔ شیر دل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے تمہیں جانا ہے تم جاؤ...... مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی...... تم امریکا جا کر چند ہفتے اپنی ممی کے





پاس رہو۔ ٹھنڈے دل سے اس ساری صورتِ حال کے بارے میں سوچو جب تمہارا غصہ ختم ہو جائے اور تمہیں عقل آجائے تو تم واپس آجانا۔" شیر دل نے سرد مہری سے کہا تھا۔

"مثال کو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تم مثال کو کیسے روک سکتے ہو؟" شہر بانو نے تلخی سے اس سے کہا تھا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں تم مجھے یہ دکھانے کے لیے challenge مت کرو...... مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔" شیر دل نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔

"تم اسے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے سنا تم نے۔" شہر بانو نے ایک بار پھر چلا کر کہا تھا۔

"چلانے کی ضرورت نہیں ہے شہر بانو...... چلانے سے تمہاری بات کی زیادہ سمجھ نہیں آ رہی مجھے۔ میں مثال کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دوں گا اور میں اس کا باپ ہوں اسے روک سکتا ہوں۔" شیر دل نے تحکمانہ انداز میں اسے بتایا۔

"شادی کے پیپرز میں تم نے اولاد کی کسٹڈی مجھے دے دی تھی شیر دل۔" شیر دل کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وہ ایک جھگڑے پر نہ صرف طلاق تک جا پہنچی تھی بلکہ شادی کے پیپرز میں لکھی ہوئی شرائط اور حقوق کو اس کے سامنے دُہرا رہی تھی۔

"شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں کہ اپنی بیٹی تمہیں تھما کر پھر ساری عمر اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترسوں۔ تمہیں مجھ سے الگ ہونا ہے تو بھی تمہیں پاکستان میں ہی رہنا ہوگا اگر تم مثال کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو...... میں تمہیں اس کو امریکا ساتھ لے جانے نہیں دوں گا۔" وہ بھی اب بالکل ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ وارڈروب کے سامنے کھڑی بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ وہ مثال کے بغیر وہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ شیر دل کے ساتھ مر کر بھی اب رہنا نہیں چاہتی تھی۔

"تم میری بیٹی کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔"

"وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے، تمہیں اگر اس کی اتنی پروا ہے تو تم رہو یہاں پر۔" شیر دل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں اتنی گری ہوئی ذہنیت کے آدمی کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گی۔" شیر دل ہونٹ بھینچے اس کی بات سنتا رہا۔

"Thank you very much میں ایسا ہی ہوں اور میں ایسا ہی رہوں گا اور مجھے تم پر اپنی اچھائی

www.paksociety.com

ثابت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن مثال کو میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔'' شیر دل نے حتمی انداز میں اس سے کہا۔

''میں legally entitled ہوں اسے اپنے پاس رکھنے کی۔'' وہ بات کرتے کرتے بے بسی سے رو پڑی۔ شیر دل ایک لمحے کے لیے ہل نہیں سکا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شہر بانو کسی بات پر روئی ہو اور شیر دل موم نہ ہو گیا ہو لیکن یہ مثال کا معاملہ تھا اور وہ اپنی بیٹی کے لیے ہر قسم کے جذبات کی قربانی دے سکتا تھا۔

''تم اسے امریکا میں رکھ کر اس کی برین واشنگ کرتی رہیں...... تم اسے یہ بتاتی رہیں کہ میں بہت بزی ہوں تم لوگوں کے ساتھ وہاں نہیں رہ پاؤں گا اس لیے اسے تمہارے اور تمہاری ممی کے ساتھ ہی وہاں رہنا پڑے گا اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دوں تاکہ سال چھ مہینے کے بعد وہ میری شکل تک دیکھنا نہ چاہے...... تم شہر بانو یہ سارا تماشا پہلے سے پلان کر کے آئی تھیں۔ تم طے کر کے آئی تھیں کہ تمہیں میرے ساتھ نہیں رہنا۔'' شیر دل چاہنے کے باوجود اپنے لہجے کو نرم نہیں رکھ سکا تھا۔ چند دنوں میں ان دونوں کے بیچ میں اتنی دراڑیں اور دیواریں آ گئی تھیں کہ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہ ہوں۔

''شیر دل میں تم سے کوئی مزید argument نہیں چاہتی، میں صرف اپنی بیٹی کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں یہاں سے۔'' شہر بانو نے اس کی بات کے جواب میں روتے ہوئے کہا۔

''تم ممی کے پاس لاہور چلی جاؤ وہاں چند ہفتے رہو اس کے بعد......'' شیر دل نے جیسے اس کے آنسوؤں سے مجبور ہوتے ہوئے کہا۔ شہر بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں تمہاری فیملی کے پاس نہیں اپنی فیملی کے پاس جانا چاہتی ہوں، تم لوگوں کی sincerity اور loyalities میرے ساتھ نہیں ہیں۔'' وہ اسی طرح روتے ہوئے تلخی سے بولتی جا رہی تھی۔ ''You all are a bunch of cheaters and liers (تم سب جھوٹوں اور دھوکے بازوں کا ٹولا ہو)'' اس کے جملے نے شیر دل کو دوبارہ تپا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ...... تمہیں واقعی اپنی ہی فیملی کے پاس جانا چاہیے اور مثال اپنی فیملی کے پاس رہے گی۔ No more argument.'' وہ بے حد غصے میں کہتا ہوا اپنے بیڈ روم سے اوپر اسٹڈی میں آ گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی بدترین راتوں میں سے ایک تھی۔ آپ کو اپنا گھر ٹوٹتا نظر آ رہا ہو اور آپ کچھ بھی نہ کر سکتے ہوں اور آپ اس گھر کو قائم رکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہوں۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا ہوا وہ بیٹھا صرف یہ سوچتا رہا کہ وہ کیا کرتا تو اس صورتِ حال سے بچ سکتا تھا اور وہ کیا نہ کرتا تو یہ جھگڑا اتنا نہ بڑھتا۔ اسے اپنی غلطیاں نظر آ رہی تھیں لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے اس ساری صورتِ حال سے نکلنے کے لیے...... اپنے گھر کو بچانے کے لیے۔

☆☆☆

شہر بانو اگلی صبح دس بجے جاگی تھی۔ بھاری سر اور بوجھل آنکھوں کے ساتھ اس نے مثال کو بتایا تھا کہ وہ لوگ دوبارہ امریکا جا رہے ہیں اور اس کے سوالوں کا جواب دیے بغیر اس نے فون اٹھا کر آپریٹر سے rent a car سے ایک گاڑی منگوانے کے لیے کہا تھا۔ جواباً اس نے آپریٹر سے جو سنا تھا اس نے اس کے دماغ کا فیوز اڑا دیا تھا۔

''سوری میڈم ڈی سی صاحب کا حکم ہے کہ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ نہیں آئے گی اور ان کی اجازت کے بغیر آپ گھر سے کہیں نہیں جا سکتیں۔'' شہر بانو نے ایک لفظ بھی کہے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ تذلیل کا ایسا احساس اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ملازم اس کی بات ماننے سے انکار کر رہا تھا کیونکہ اس کے صاحب نے اس کے سامنے اس کی





کوئی عزت نہیں رکھی تھی۔ شیر دل کے خلاف اس کے دل میں لگنے والی گرہوں میں ایک اور گرہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور وہ یہ سلوک deserve نہیں کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے ہی گھر میں ایک قیدی بنا دیتا۔ بے حد غم اور خفگی کے عالم میں اس نے اس لاکر میں سے اپنا اور مثال کا پاسپورٹ نکالنا چاہا تھا جہاں ان لوگوں کے travel documents رکھے ہوتے تھے۔ وہاں اس کا پاسپورٹ تھا لیکن مثال کا پاسپورٹ نہیں تھا۔ شیر دل یقیناً حفظِ ماتقدم کے طور پر صبح آفس جاتے ہوئے مثال کا پاسپورٹ وہاں سے لے گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت اس لاکر کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ شیر دل نے جیسے ان دونوں کے رشتے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

☆☆☆

شیر دل چار بجے کے قریب اپنے آفس میں مارکیٹ کمیٹی کی ایک میٹنگ کو چیئر کر رہا تھا جب اس کے آفس کا آپریٹر بہت گھبراہٹ کے عالم میں اندر آیا تھا۔ میٹنگ روم میں کالز دینے کی اجازت نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے خود آ گیا تھا۔

''سر، گھر میں ایمرجنسی ہو گئی ہے۔'' شیر دل کے دل کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب خوف کے عالم میں رکی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''سر گھر سے آپریٹر کا فون آیا ہے امریکن قونصلیٹ کے لوگ وزارتِ داخلہ کے چند آفیسرز کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔'' آپریٹر نے بہت نپے تلے لفظوں میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد بتائے بغیر شیر دل کو آنے والی مصیبت سے خبردار کیا۔ زندگی میں پہلی بار شیر دل کے قدموں کے نیچے سے زمین جیسے واقعی نکل گئی تھی۔ اسے کسی مزید سوال و جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا امریکی قونصلیٹ کو مدد کی کال کس نے دی تھی اور وہ کس کو rescue کرنے وہاں آئے تھے مگر جس چیز پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ یہ تھی کہ شہر بانو اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر یک دم میٹنگ کو کینسل کرنے کا اعلان تک کیے بغیر وہاں سے نکل گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو گھر چلنے کا کہہ کر اس نے بختیار شیر دل کو فون کر کے اس معاملے کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح شاکڈ رہ گئے تھے۔

''آپ ان دونوں کا نام ECL میں ڈلوا دیں ورنہ شہر بانو مثال کو لے کر چلی جائے گی۔ امریکن قونصلیٹ والے اس کے travel documents گھنٹوں میں تیار کر لیں گے۔'' وہ اب باپ سے کہہ رہا تھا جواب

Be-Belle®
INNERWEAR
Pakistan's First
2-Layer Fabric Bra!

www.paksociety.com

برہم تھا۔

''شہر بانو اس طرح کی حرکت کیسے کرسکتی ہے؟ اس نے تمہاری عزت اور reputation کا خیال نہیں کیا، فیملی کے نام کا خیال نہیں کیا۔ دو چار گھنٹوں میں ڈویژن میں اس چھاپے کا شور مچ جائے گا...... Your wife is an idiot۔'' بختیار اب شدید برہم تھے۔ ان کے خاندان کو پہلی بار ایسی سبکی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''پاپا میں وہ فصل کاٹ رہا ہوں جو ممی نے میرے لیے تیار کی ہے۔ ممی کی false pride اور جھوٹ نے میرا گھر توڑ دیا۔'' اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

اس کی رہائش گاہ پر بھاری بھر کم گاڑیوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی اور گیٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ public humiliation تھی، جس کا وہ اس وقت سامنا کر رہا تھا اور جو شہر بانو کی طرف سے اس کے لیے تحفہ تھی۔

وہ اس کی سرکاری رہائش گاہ تھی اور اس کا دروازہ اس کی اجازت کے بغیر نہ کوئی کھول سکتا تھا نہ وہاں کوئی آسکتا تھا لیکن اس وقت اس کے لاؤنج میں دس بارہ مرد موجود تھے جن میں ایک سفید فام تھا۔ بے حد سرد مہری سے ہونے والے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد شیر دل نے ان سے کہا کہ وہ شہر بانو کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس بات کو اس سفید فام کے ساتھ آئے ہوئے امریکن قونصلیٹ کے ایک پاکستانی اہلکار نے بڑی بدتمیزی اور رکھائی کے ساتھ رد کیا تھا اور وزارتِ داخلہ کے ساتھ آئے ہوئے ان اہلکاروں نے اسے اپنے بیڈروم کی طرف جانے سے روک دیا۔

''میری بیوی جانا چاہتی ہے آپ اسے لے جائیں لیکن آپ لوگ میری بیٹی کو نہیں لے جاسکتے۔'' شیر دل نے برہمی کے ساتھ کہا۔ وہ اپنے غصے پر قابو رکھنے کی شدید کوشش کر رہا تھا کیونکہ اسے صورتِ حال کی سنگینی کا اچھی طرح اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی مزید جھگڑے کے نتیجے میں معاملہ مزید خراب ہو لیکن خود پر کنٹرول کرنا اس وقت بالکل آسان نہیں تھا۔ وہ اس کا گھر تھا اور وہ اسے اس کے اپنے گھر میں اس کمرے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے اس سے بڑھ کر کوئی اس کی کیا بے عزتی کرسکتا تھا۔

پانچ منٹ گزر رہے تھے اسے ان لوگوں سے بحث کرتے جب قونصلیٹ کی ایک خاتون اہلکار کے ساتھ شہر بانو مثال کو اٹھائے ہوئے وہاں آئی تھی اور اس کے آتے ہی وہاں موجود تمام لوگ جانے کے لیے کھڑے ہوگئے تھے۔ مثال نے باپ کو دیکھتے ہی بہت خوشی کے عالم میں دونوں بازو اس کی طرف پھیلائے تھے۔ شیر دل بے اختیار اس کی طرف گیا تھا لیکن ایک اہلکار ان دونوں کے درمیان آگیا۔

''شہر بانو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، ہم یہ مسئلہ خود حل کرسکتے ہیں۔'' شیر دل نے اپنے سارے غصے ساری انا کو ایک طرف رکھتے ہوئے مصالحت کی ایک اور کوشش کی تھی۔

''میں تم سے کسی بھی قسم کی بات کرنا نہیں چاہتی۔ You are not worth it۔'' شہر بانو نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے کہہ کر ان تمام لوگوں کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''پاپا...... پاپا...... I want to go to Papa۔'' مثال نے ایک دم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے حواس باختگی میں رونا شروع کر دیا تھا۔ اسے شاید پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ شہر بانو اسے شیر دل سے دور لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیر دل اس کے بلکنے پر بے قرار ہو کر اس کے پیچھے گیا تھا۔ وزارتِ داخلہ کے لوگوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا اور تب تک اسے وہیں رکھا جب تک شہر بانو قونصلیٹ کے افراد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلی نہیں گئی۔ ان کے وہاں سے جانے کے بعد وہ لوگ بھی شیر دل سے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بات کرتے ہوئے چلے گئے۔ شیر دل جانتا تھا کہ وہ لوگ اب وہاں سے جاچکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میکانیکی انداز میں ڈرائیو وے میں نکل آیا تھا جو اس وقت مکمل طور پر خالی تھا۔ وہاں فور ویلز گاڑیوں کے ٹائرز کے نشانات کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

www.paksociety.com

وہ ماؤف ذہن اور حواس کے ساتھ بے یقینی کے ایک عجیب عالم میں بہت دیر وہاں کھڑا بہت دیر بند گیٹ کو دیکھتا رہا جہاں سے وہ گاڑیاں گئی تھیں۔ اس کے کانوں میں مثال کے رونے کے علاوہ کسی کی آواز نہیں آرہی تھی اور وہ جانتا تھا وہ گاڑی میں بھی اسی طرح رو اور چلا رہی ہوگی۔

☆☆☆

"ECL پر نام ہیں دونوں کے...... وہ کم از کم پاکستان سے باہر نہیں جاسکتے۔ میں امریکن قونصلیٹ میں کسی جاننے والے کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا ہوں تاکہ شہربانو سے کسی طرح رابطہ ہوسکے۔" بختیار نے شیر دل کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیر دل، شہربانو کے وہاں سے جانے کے بعد فوری طور پر لاہور بختیار کے پاس چلا آیا تھا۔ منزہ تب تک اس سارے معاملے کے بارے میں جان چکی تھیں اور وہ بھی اسی طرح کے شاک میں تھیں جیسا شاک بختیار اور شیر دل کو لگا تھا جو آخری چیز وہ شہربانو سے expect کرسکتے تھے وہ ایسا کوئی قدم تھا۔ بختیار، شیر دل کے لاہور پہنچنے سے پہلے منزہ پر بھی خاصا برس چکے تھے۔ کوئی عام حالات ہوتے تو منزہ، بختیار کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو کبھی برداشت نہ کرتیں لیکن اب وہ بھی بے حد ندامت کے عالم میں یہ سب کچھ سنتی رہی تھیں اور وہ ندامت دو گھنٹے کے بعد شیر دل کو اپنے گھر پر دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے شیر دل کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف شہباز حسین تھا جسے شرمین کے شہربانو کو لے جانے کے بعد وہ اس حال میں دیکھتی رہی تھیں اور شیر دل اور شہباز میں نظر آنے والی اس مماثلت نے منزہ کو ہولا دیا تھا۔

شیر دل نے گھر آکر منزہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے منزہ کو دیکھنے کے باوجود انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ملازم سے بختیار کا پوچھا تھا اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ منزہ نے اسے روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شیر دل نے بے حد درشتگی سے ان سے کہا تھا۔

"میں آپ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں اور پاپا آپ کے سامنے کوئی بات کریں گے۔ آپ مت آئیں میرے پیچھے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ منزہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئیں، وہ جیسے انہیں shutup کال دے کر گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو منزہ، شیر دل کے ایسے جملوں پر اسے اپنے گھر میں کھڑے رہنے تک نہ دیتیں لیکن آج وہ اس کے ان توہین آمیز جملوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے دل میں کچھ برا نہیں لاسکی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں اپنی غلطیوں کی وجہ سے گری تھیں اور انہیں اس وقت پہلی بار بری طرح سے احساسِ جرم ہورہا تھا۔ شہربانو کا مثال کو اس طرح سے لے جانا ان سے بھی ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاریخ جیسے ایک ہی گھر میں اپنے آپ کو پھر سے دہرانے لگی تھی۔

شیر دل کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کمرے میں آنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی تھیں جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے بات چیت کرتے کرتے منزہ کو اندر آتا... دیکھ کر کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کی تھی لیکن اس کے بعد پھر بات کرنے لگے تھے۔ اس وقت منزہ سے زیادہ بڑا مسئلہ ان کے لیے شہربانو اور مثال کو پاکستان سے چلے جانے سے روکنا تھا۔ منزہ کو لعنت ملامت بعد میں بھی ہوسکتی تھی۔

بختیار، شیر دل کے ساتھ گفتگو کے دوران مسلسل مختلف جگہوں پر فون کرنے میں مصروف تھے اور شیر دل نے لاہور آنے کے سفر کے دوران اپنے کچھ سینئر آفیسرز کی کالز ریسیو کرکے ان سے صورتِ حال کی وضاحت کی تھی جو اس کے گھر پر ہونے والے اس واقعے سے باخبر ہوچکے تھے۔ شیر دل کو اندازہ تھا کہ صرف اس کے ڈویژن کے آفیسرز ہی نہیں اس وقت پورے پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ میں اس کے گھر پر ہونے والا یہ چھاپا ہی ڈسکس ہورہا ہوگا۔ وہ جیسے صرف چند گھنٹوں میں ایک قابل آفیسر سے صرف ایک "برا شوہر" بن کر رہ گیا تھا جو اپنی امریکن بیوی پر اتنا بھی


www.paksociety.com

کنٹرول نہیں رکھ سکا کہ اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر لیتا۔

شیر دل نے چند ایک سینئر آفیسرز کی کالز کے بعد دوسرے آفیسرز اور اپنے بیچ میٹس کی طرف سے آنے والی کالز لینا بند کر دیں۔ اس میں فی الحال بار بار اس سارے قصے اور شہر بانو اور اپنے اختلافات کو دُہرانے۔۔ کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی اسے ان میں سے کسی کی solidarity اور سپورٹ کی ضرورت تھی...... ان میں سے کسی کی سپورٹ اس کی زندگی کے اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی تھی۔

بختیار اور شیر دل شام تک بیٹھے مختلف جگہوں پر فون کرتے ہوئے شہر بانو سے رابطہ کی کوشش کرتے رہے۔ صرف اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ پاکستان میں ہی تھی لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ امریکن قونصلیٹ کی مدد کے ساتھ شیر دل کے گھر سے آنے کے صرف چار گھنٹے کے بعد مثال کے وزارتِ داخلہ کی مدد سے بنوائے گئے ایمرجنسی ٹریول ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان سے جا چکی تھی۔ یہ بختیار کی خوش فہمی تھی کہ اس کی ہدایات پر ان دونوں کا نام ECL پر ڈالا جا چکا تھا۔ ان دونوں کا نام ECL پر ڈالنے کے احکامات تو یقیناً ایشو ہو چکے تھے لیکن ان احکامات کو امریکی قونصلیٹ کی مداخلت اور دباؤ کی وجہ سے تب تک مؤخر رکھا گیا جب تک شہر بانو اور مثال اپنی فلائٹ پر بیٹھ نہیں گئیں۔

شیر دل اس تمام عرصے کے دوران پاگلوں کی طرح بار بار شہر بانو کے فون پر کال کرنے کی کوشش کرتا رہا، صرف اس امید پر کہ شاید اس کا بند فون کسی دوسرے سے بات کرنے کے لیے کھلا ملتا اور اس کی کال آنے پر شاید شہر بانو اس کی کال ریسیو کر لیتی۔ شاید تب تک اس کا غصہ ختم ہو چکا ہو۔ اس نے اسے درجنوں نہیں سیکڑوں text کیے تھے معذرت کے...... ایک دفعہ بات کرنے کی request کے...... اس کی ہر بات ماننے کے وعدے کے...... اس کی تمام شکایات دور کرنے کے...... اور ان میں سے ہر text کو ٹائپ کرتے اور بھیجتے ہوئے شیر دل نے اپنی انا اور عزتِ نفس کو بار بار روندا تھا...... اسے شہر بانو پر جتنا غصہ تھا اس کے بعد وہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا... اس کے ساتھ رہنا دور کی بات تھی لیکن اس کے پاس مثال تھی۔ روتی ہوئی مثال...... وہ طوطا جس میں جن کی جان تھی...... اور شیر دل اپنی بیٹی کی خاطر اس وقت اپنے غصے اور انا کو بھلا بیٹھا تھا۔

اس کے کسی text کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ شہر بانو کا فون مسلسل بند ہی رہا تھا۔ شام کو سات بجے بختیار کو بالآخر قونصلیٹ کے کسی اہلکار نے شہر بانو اور مثال کے پاکستان سے چلے جانے کی اطلاع دی تھی۔ بختیار اور شیر دل کے لیے یہ جیسے ایک اور بڑا سیٹ بیک تھا۔ ECL پر نام ہونے کے باوجود وہ دونوں کیسے چلی گئی تھیں یہ بھی بہت دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ جیسے سکتے میں چلے گئے تھے۔ ابھی تک جو امید شیر دل کو جدوجہد کرتے رہنے پر اکسا رہی تھی وہ یہی تھی کہ وہ دونوں پاکستان میں ہی تھیں اگر فوری طور پر نہیں تو چند دنوں میں اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا لیکن ان دونوں کا تمام رکاوٹوں کے باوجود پاکستان سے نکل جانا جیسے شیر دل کے لیے پھانسی کے پھندے سے لٹک جانے کے مترادف تھا۔ بُری خبر صرف یہ نہیں تھی کہ وہ دونوں پاکستان سے چلی گئی تھیں۔ بری خبر یہ تھی کہ شیر دل کی شہر بانو کے ساتھ شادی امریکا میں ہوئی تھی اور وہ نکاح نامے میں طلاق کا حق شادی کے وقت شہر بانو کو تفویض کر چکا تھا۔ شہر بانو کو اب اس سے طلاق کے لیے پاکستان واپس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

پتا نہیں غصے کی وہ کون سی حالت ہوتی ہے جس میں انسان برسوں کے ساتھ اور ساتھی کو لمحوں میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ پیار، محبت، اعتماد، دوستی کوئی چیز پاؤں کی زنجیر نہیں بن پاتی۔

شہر بانو، شیر دل کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اسے اس شخص کو زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹ لگے تھے۔ شہباز حسین کے بارے میں کیے جانے والے اس کے انکشاف نے شہر بانو کو کچھ اس





بُری طرح سے ہرٹ کیا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں سب بھول گئی تھی۔ اگر کوئی چیز اسے یاد رہی تھی تو صرف یہ کہ شیر دل نے اس کے پاپا پر ایک عورت کی باتوں میں آ کر گھناؤنا الزام لگایا تھا...... اس کے آئیڈیل پاپا پر...... جو کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتے تھے...... جن کو وہ سارا بچپن آئیڈیلائز کرتی رہی تھی۔ وہ اس mode of denial (کسی بات سے انکاری ہونا) میں تھی جس میں ہم سب اپنے اپنے آئیڈیل کو defend کرنے کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں۔ حقائق کو جھوٹ کہتے ہیں اور اس کے لیے دیے جانے والے دلائل کو بکواس...... کیونکہ ہم اپنے بہت اندر کہیں نہ کہیں اس یقین کے جڑ پکڑنے سے ڈرتے ہیں جو ہمیں آئینے میں حقیقت کا اصل عکس دکھا رہا ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کان بند کر کے کبوتر بن کر ہم اپنے آئیڈیل اور عزیز ترین شخص کے بُت کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتے ہیں۔ شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا وہ اپنے ''آئیڈیل پاپا'' کے image (ساکھ) کو بچاتے بچاتے اپنی ''آئیڈیل زندگی'' کو گنوا بیٹھی تھی بالکل منزہ کی طرح جو ایک ''آئیڈیل بھائی'' کے image کا دفاع کرتے کرتے اپنے شوہر اور اولاد کی نظروں میں گر گئی تھی۔

شہر بانو کے لیے ''حقیقت'' شاید اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتی اگر اس نے حقیقت کو منزہ یا شرمین کی کسی سرگوشی میں سنا ہوتا لیکن وہ حقیقت اس نے شیر دل کے منہ سے علی الاعلان سنی تھی اور اس وقت سنی تھی جب خود شیر دل کا image عکس کی وجہ سے اس کی نظروں میں مسخ ہو چکا تھا۔

امریکن قونصلیٹ کو فون کرنے سے ان کی آمد، پھر شیر دل کے گھر سے روانگی اور پھر پاکستان سے امریکا جانے والی فلائٹ پر چڑھنے تک وہ اشتعال میں تھی...... ہوش و حواس کو کھا جانے والا اشتعال...... شیر دل یک دم جیسے وہ punching bag (باکسروں کے پنچ مارنے کی پریکٹس کرنے والا بیگ) بن گیا تھا۔ جس کی شہر بانو کو ساری عمر ضرورت رہی تھی کوئی ایسا شخص جس پر وہ سارا غصہ نکال سکے جو اس نے شہباز حسین کو کھو دینے پر محسوس کیا تھا اپنے بچپن کی وہ ساری فرسٹریشن جو باپ کے ایک دم کسی وجہ کے بغیر زندگی سے غائب ہو جانے پر اس کے پورے بچپن کو مسخ کرتی رہی تھی۔ وہ شرمین پر بچپن میں بھی اپنا غصہ اس طرح سے نہیں نکال پائی تھی جس طرح وہ نکالنا چاہتی تھی کیونکہ لاشعوری طور پر اسے کہیں نہ کہیں یہ احساس تھا کہ اب اس کے علاوہ دنیا میں فیملی نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی اور وہ مالی، جسمانی، جذباتی طور پر اس کی مدد اور سہارے کی محتاج تھی۔ فاروق سے شرمین کی شادی نے ماں کے حوالے سے اس کے عدم تحفظ کو جیسے اور بڑھا دیا تھا لیکن شیر دل کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ اسے دشمن بنانا آسان تھا کیونکہ شہر بانو کی نظروں میں اب وہ ایک پیار کرنے والا جان چھڑکنے والا وفادار ساتھی اور شوہر نہیں تھا صرف ایک cheater (دھوکے باز) تھا جو اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی افیئر چلا رہا تھا اور اس عورت کی محبت میں وہ اس کے باپ پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اس کے پاس مثال کی شکل میں اب فیملی تھی، وہ تنہا نہیں تھی۔ وہ شیر دل کی محتاج نہیں تھی۔ وہ شیر دل کو اتنا ہی ہرٹ کرنا چاہتی تھی جتنا وہ ہوئی تھی۔

مثال، شیر دل کے گھر سے صرف لاہور کے سفر کے دوران ہی روتی نہیں رہی تھی، وہ امریکا کی فلائٹ میں بھی اسی طرح روتی رہی تھی۔ شہر بانو کی دھمکیوں، ڈانٹ ڈپٹ، پیار، تسلیوں اور کسی جھوٹ اور دلاسے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اسے اس کے باپ سے بہت دور لے کر جا رہی تھی کیونکہ اس کے اور اس کے باپ کے درمیان اب ''فائٹ'' ہو چکی تھی اور اس کی ممی اب کبھی بھی اس کو واپس شیر دل کے پاس نہیں لے جانے والی تھی۔ وہ بے حد کم عمر تھی نہ مسائل سمجھ سکتی تھی نہ وجوہات نہ نتائج لیکن وہ ''جدائی'' اور ''جھگڑے'' کو سمجھ سکتی تھی۔ بچوں کی چھٹی حِس ان دو چیزوں کو بڑوں سے بھی جلد بھانپتی ہے۔ اس کے مسلسل رونے اور سوالوں سے تنگ آتے ہوئے ایک اسٹیج پر آ کر شہر بانو نے اس کو چپ کرانے کی ہر کوشش چھوڑ دی تھی۔ اس کے پاس مثال سے بولنے کے



www.paksociety.com

لیے اب کوئی جھوٹ نہیں رہا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

شرمین سے اس کی بات امریکن قونصلیٹ میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ اس نے شرمین کو بتا دیا تھا کہ وہ شیر دل کا گھر چھوڑ آئی ہے تاہم اس نے وجوہات نہیں بتائی تھیں نہ ہی شرمین نے اس سے اس وقت کچھ بھی پوچھا تھا لیکن اس کی امریکا روانگی سے پہلے شیر دل نے ان سے رابطہ اور بات کرنے کی کوشش کی تھی جسے انہوں نے بہت خفگی کے عالم میں جھٹک دیا تھا لیکن بختیار کی کال لینے سے وہ کوشش کے باوجود انکار نہیں کر سکی تھیں اور وہ کال لینے کے بعد وہ اس کال کو لینے پر بہت پچھتائی تھیں۔ ان کی دنیا دوسری دفعہ بل کر رہ گئی تھی۔ عکس نام کی بازگشت نے اس بار ان کی بیٹی کی پُرسکون زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ شہباز حسین کے اس گناہ پر انہوں نے ساری عمر پردہ ڈالا تھا ساری عمر انہوں نے شہر بانو سے اس کو چھپایا تھا۔ اس کی نظروں میں خود بُرا بن کر بھی انہوں نے شہباز حسین کے ''بت'' کو اس کے ذہن اور نظروں میں ٹوٹنے نہیں دیا تھا اور وہ بت کہاں اور کس عمر میں آ کر ٹوٹا تھا۔ ماں باپ کے کیے ہوئے بعض گناہ صرف ان کی اپنی زندگی برباد نہیں کرتے وہ وراثت کی طرح چلتے ہوئے ان کی اولاد کے سامنے پاتال بن کر آ جاتے ہیں اور کس طرح...... کہ انسان کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا......

شرمین، بختیار شیر دل کی بات صرف سنتی رہی تھیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنا غصہ بھول گئی تھیں اور شہر بانو کے اٹھائے ہوئے قدم پر کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی الفاظ نہیں تھے۔ عکس مراد علی کا سایہ کبھی بھوت بن سکتا تھا یہ انہیں اندازا نہیں تھا۔ اگر انہوں نے رات کے اس پہر شیر دل کے فون پر تب عکس سے بات نہ کی ہوتی تو آج وہ شہر بانو کو ہی قصوروار سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر شرمین خود اسی غلط فہمی کا شکار تھیں کہ شیر دل، عکس کے ساتھ نہ صرف افیئر چلا رہا تھا بلکہ وہ افیئر بہت غلط حدود تک جا پہنچا تھا۔ انہوں نے اس کے باوجود اس فون کال کو شہر بانو سے چھپا کر جیسے اسے ایک بار پھر اپنا گھر بچانے اور بنائے رکھنے کا موقع دیا تھا لیکن اب وہ اس راز کو بھی شہر بانو سے چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ اگر باقی سب کچھ چھپا نہیں رہ سکا تھا تو پھر اس ایک راز کو چھپانے کا بھی کیا فائدہ تھا لیکن اس دن عکس مراد علی کے لیے اتنے سالوں سے ان کے دل میں موجود ہمدردی اور اس کے حوالے سے ان کا احساسِ جرم ختم ہو گیا تھا۔ انسان اپنی اولاد پر آنے والی تکلیف کو کبھی justify نہیں کر سکتا نہ ان لوگوں سے ہمدردی رکھ سکتا ہے جو اس تکلیف کے ذمہ دار ہوں۔

☆☆☆

عکس کو اس سارے واقعے کے بارے میں چند گھنٹوں میں پتا چل گیا تھا۔ وہ لوگ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ واقعہ اس سے زیادہ دیر تک چھپا رہتا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھی شاکڈ ہی رہ گئی تھی۔ وہ شیر دل کو directly اور شہر بانو کو indirectly جانتی تھی اور وہ یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ ان دونوں میں اچانک ایسا کیا ہوا تھا کہ شہر بانو کو امریکن قونصلیٹ والوں کی مدد لینی پڑی تھی۔ صرف ایک دن پہلے تک شیر دل اس کو سب "Perfect" بتا رہا تھا اور ایک دن بعد...... اس نے یقیناً اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اس سے فون کر کے بات کرنا چاہتی تھی لیکن چاہتے ہوئے بھی اس نے شیر دل کو فون نہیں کیا۔ وہ اس کے اور شہر بانو کے درمیان ہونے والے کسی مسئلے میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن اس کے باوجود اسے شیر دل سے پوری ہمدردی تھی۔ وہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ کر سکتی تھی۔ جو چیز اسے رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی وہ اس کا یہ شک تھا کہ اس سارے واقعے کی وجہ دو دن پہلے شہباز حسین کے معاملے پر شیر دل کے خاندان کی خود اختیار کردہ پسپائی اور مصالحت نہ ہو۔ وہ اس دن عجیب ذہنی اضطراب کے عالم میں گھر آئی تھی اور وہ خیر دین سے یہ بات ڈسکس کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''شیر دل تو بہت اچھا لڑکا ہے...... ایسا کیا ہو گیا کہ اس کی بیوی کو اس طرح کا قدم اٹھانا پڑا؟'' خیر دین بھی اسی

www.paksociety.com





کی طرح حیران اور متفکر ہوا تھا۔ عکس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ خیر دین کو یہ بتائے کہ شیر دل کی بیوی شہباز حسین کی بیٹی تھی...... وہی باربی ڈول جس پر بچپن میں عکس کا بری طرح دل آ گیا تھا اور وہ جس کے گرد منڈلاتی رہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت وہ چاہتے ہوئے بھی خیر دین کو یہ بات نہیں بتا سکی۔

''تمہاری شیر دل سے بات ہوئی؟'' خیر دین نے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بے اختیار کہا۔

''کیوں؟'' خیر دین جیسے کچھ حیران ہوا تھا۔

''اس کا فون آف تھا میں نے کوشش کی رابطہ کرنے کی...... ایک دو دن تک بات کروں گی۔'' اس نے کچھ بے ربطی سے کہا۔ خیر دین اسے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

عکس نے شیر دل کو آنے والے دنوں میں بھی کال نہیں کیا تھا...... شدید خواہش رکھنے کے باوجود اور یہ احساس ہونے کے باوجود کہ وہ شدید پریشانی کی حالت میں ہوگا...... وہ چاہتی تھی کہ اگر یہ کرائسس اس کی وجہ سے آیا ہے تو وہ اس کو اپنی کسی مداخلت سے مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

خیر دین اگلے چند دن اس سے شیر دل کے بارے میں پوچھتا رہا تھا لیکن اس کی خاموشی اور عدم دلچسپی پر بالآخر اس نے بھی اس مسئلے پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔

حلیمہ ان دنوں اپنے سسرال گئی ہوئی تھی اور جب وہ واپس آئی تو اس نے ایک بار پھر عکس کی شادی کے حوالے سے بات شروع کر دی تھی۔ وہ اس بار اپنے شوہر کے دور پار کے رشتے داروں میں کسی ڈاکٹر کے پروپوزل کے بارے میں خیر دین اور عکس سے بات کر رہی تھی جو دبئی کے کسی ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا اور ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔ جواد ملہی سے منگنی ختم ہونے کا خیر دین کو اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا حلیمہ کو ہوا تھا۔ اسے جواد ملہی سے بھی زیادہ اس کا خاندان پسند تھا اور اس کے لیے یہ بہت فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنے بڑے خاندان کا حصہ بننے والی تھی۔ وہ ایک سال سے عکس کے مستقبل کے حوالے سے نہ صرف مطمئن ہو گئی تھی بلکہ فخریہ انداز میں اپنے سسرالی خاندان میں سب کو اس کے بارے میں بتاتی بھی رہی تھی اور اب خیر دین کی بیماری کے دوران اس طرح ان لوگوں کا رشتہ توڑ دینا نہ صرف اس کے لیے بہت صدمے اور سُبکی کا باعث تھا بلکہ پریشانی کا بھی اور وہ اسے عکس کی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ جواد سے رشتہ ختم ہونے کے چند دنوں کے اندر عکس کے لیے ایک اور رشتہ آ گیا تھا۔

عکس نے خیر دین اور حلیمہ کے اصرار کے باوجود انہیں جواد کے خاندان سے رابطہ کر کے منگنی توڑنے کی وجوہات کے بارے میں پوچھنے نہیں دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جواد یا اس کا خاندان شیر دل کی ماں کے لگائے ہوئے الزامات دُہرائے گا اور وہ خیر دین اور حلیمہ کو اس شاک اور ایک نئے تماشے سے بچانا چاہتی تھی لیکن بعض چیزیں لاکھ کوشش کے باوجود ہو کر رہتی ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شرمین خیر دین سے رابطہ کر کے اس سارے معاملے پر بات کر سکتی تھی۔

''بہت اچھا لڑکا ہے چڑیا وہ...... ایک بار مل لو اس سے...... ابھی پورا مہینہ یہاں ہے۔'' حلیمہ اس دن بھی صبح سویرے ناشتے کی میز پر اسے اس لڑکے سے ملنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ عکس خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی۔

''اور وہ تمہیں جانتا بھی ہے تمہارے ساتھ پڑھا ہوا ہے...... کہہ رہا تھا تم بھی اسے جانتی ہو۔'' وہ ناشتا کرتے کرتے چونکی تھی۔

''میرے ساتھ پڑھا ہوا ہے......؟ کیا نام ہے اس کا؟'' اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا۔

(باقی آئندہ)

# خودآگہی

اسما قادری

شاہ زیب نے مخمور نگاہوں سے پھولوں بھری سیج پر نگاہیں جھکائے بیٹھی نوشین کو دیکھا۔ آسمانی رنگ کی ستاروں سے جھلملاتی ساڑی میں اس کا سانچے میں ڈھلا جسم جگمگا رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی سنگ تراش کے فنِ کمال سے تراشے حسین مجسمے، مصور کے شاہکار اور شاعر کے خیال سے بھی بڑھ کر کوئی شے لگ رہی تھی۔ عروسی جوڑے کے طور پر اس آسمانی جھلملاتی ساڑی کا انتخاب بھی اس نے صرف شاہ زیب کی خاطر کیا تھا اور یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ اس انتخاب پر اسے اپنے خاندان کی جملہ خواتین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا جو کہ شادی کے روز اسے روایتی دلہنوں کی طرح سرخ، میرون یا گلابی رنگوں میں سے کسی رنگ کا غرارہ شرارہ پہنانے کی خواہش مند تھیں لیکن نوشین تو پھر نوشین تھی۔ اس نے ہر ایک کے دلائل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آخر عین اسی طرح جس طرح شاہ زیب سے شادی کے معاملے میں سب کو قائل کیا تھا اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوگئی۔

شاہ زیب سے اس کی شادی بھی اپنی نوعیت کا ایک انوکھا ہی واقعہ تھا۔ ان کے خاندان میں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے سے لے کر دوسرے ہر معاملے میں پوری پوری آزادی حاصل تھی لیکن شادی خاندان میں ہی کی جاتی تھی۔ ایسے میں جب نوشین، شاہ زیب کی محبت میں مبتلا ہو کر اس سے شادی کی خواہش مند ہوئی تو ہر طرف گویا ایک بھونچال سا آ گیا۔ لعن طعن، پابندیاں، تعلیمی سلسلے کا منقطع ہونا کیا کچھ نہیں تھا جو اس نے نہ سہا ہو لیکن اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو راضی نہیں ہوئی اور ہفتوں یا مہینوں میں نہیں بلکہ برسوں بعد جا کر آخر کار اپنے بزرگوں کو اپنی ضد کے آگے جھکانے میں کامیاب ہوگئی۔

وہ ضدی، خود سر لیکن اسے ٹوٹ کر چاہنے والی نوشین آج اگر پھولوں بھری اس سیج پر اس کے پسندیدہ رنگ اور لباس میں اس کے سامنے تھی تو اس کی دھڑکنوں کو تو بے ترتیب ہونا ہی تھا۔ ان بے ترتیب دھڑکنوں سے ابھرتی محبت کی لے کو سنتا وہ یکدم ہی مسکرا دیا۔ اسے یاد تھا جب نوشین نے عروسی جوڑے کے سلسلے میں اپنے اور اپنے گھر والوں کے اختلاف کے بارے میں اسے آگاہ کیا تھا تو اس نے نوشین کو اس مبارک موقع پر بحث میں نہ پڑنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی پسند سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن نوشین تو پھر نوشین تھی۔ وہ اس کی طرح اندیشوں اور واہموں کا شکار ہو کر کسی سے خائف نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا مشورہ سن کر تیکھے لہجے میں بولی تھی۔

”ارے واہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دلہن میں تمہاری بنوں اور تیار دوسروں کی پسند سے ہوں۔ میں تو وہی پہنوں گی جو تمہیں اچھا لگتا ہے اور جسے پہن کر میں تمہارے ہوش اُڑا سکوں۔“ اور واقعی اس وقت وہ اپنی منفرد سج دھج کے ساتھ اس کے ہوش اُڑائے دے رہی تھی۔ اس کے ہوش رُبا حسن کی وادی میں اترنے کو پہلا قدم بڑھاتے اس نے اس کی لمبی انگلیوں والے نرم و نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور کھوئے کھوئے لہجے میں اسے پکارا۔

”نوشین، نوشی میری جان یہ تم ہی ہو نا یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“ جواب میں نوشین کی مدھم اور شوخ ہنسی سنائی دی اور اس نے بے ساختہ ہی اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ نوشین نے اپنی حیا سے لرزتی پلکوں کی جھالر لمحے بھر کے لیے اوپر اٹھائی اور وہ تو گویا ڈوب ہی گیا۔ نوشین کو ورثے میں ملی نیلگوں آنکھیں اور اس پر سے اس کا آسمانی جھلملاتا لباس، شاہ زیب احمد ان نیلاہٹوں سے اُبھر کر نکلتا بھی تو کیسے...... وہ تو خود برسوں کی پیاس کے بعد آج پورا سمندر پی لینا چاہتا تھا چنانچہ......

اس ”چنانچہ“ سے آگے بھی رضوان عباسی جانے کیا کچھ لکھنے والا تھا کہ کال بیل کی زوردار آواز نے اس کی سوچوں کے سلسلے کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ وہ جو اس وقت پور پور شاہ زیب کے کردار میں ڈوبا نوشین کے حُسن کی تجلّیوں سے فیض یاب ہو رہا تھا اس مداخلتِ بے جا پر جی بھر کر بھنایا لیکن پھر بھی چار و ناچار کرسی چھوڑ کر اٹھنا پڑا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ متوسط طبقے کی اس آبادی میں دروازے پر آ کر گھنٹی بجانے والوں میں سے کوئی بھی اتنا مہذب نہیں ہو سکتا

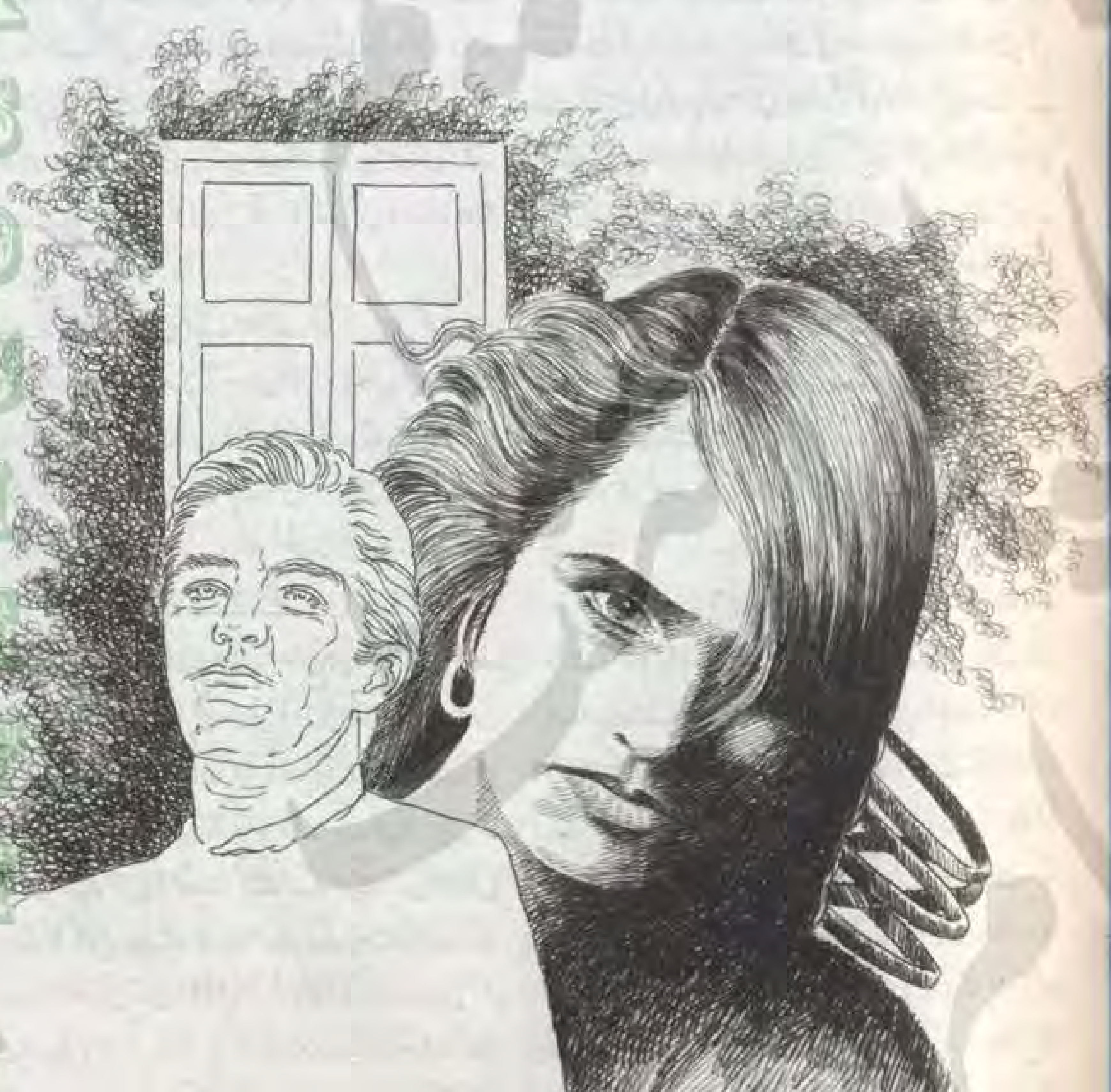





www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا کہ اندر سے جواب نہ ملنے پر آسانی سے ہار مان کر چلا جائے۔ اگر ڈور بیل ایک بار بجی تھی تو اسے بار بار بجتا تھا اور اس کی کرخت آواز یقیناً اپنے کمرے میں دواؤں کے زیرِ اثر سوئے ابا جی کی نیند میں خلل ڈال دیتی۔

اس وقت مصیبت یہ تھی کہ شبانہ بھی بچوں کے اسکول گئی ہوئی تھی جہاں اسے پیرنٹس میٹنگ میں شرکت کر کے کم و بیش ڈھائی بجے تک گھر واپس آنا تھا ورنہ عموماً اندر باہر کے چھوٹے موٹے کام کاج اور آنے جانے والوں کو وہ خود ہی بھگتا لیتی تھی اور وہ آرام سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا صفحے سیاہ کرتا رہتا تھا۔ اس کا یہ صفحے سیاہ کرنا شبانہ کو بھی برا نہیں لگتا تھا کہ سیاہ ہوتے صفحوں کی بڑھتی تعداد کے ساتھ ہی ملنے والے نیلے ہرے نوٹوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

رضوان عباسی ایک مصنف تھا جس کی تحریریں تقریباً تمام قابلِ ذکر ڈائجسٹوں اور رسالوں کی زینت بنی رہتی تھیں۔ لوگ اس کا لکھا پسند کرتے تھے اور تحریر کے حوالے سے اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ لوگوں کی محبتوں کا ثبوت وہ بے شمار خطوط تھے جو اسے اکثر و بیشتر موصول ہوتے رہتے تھے۔ ان خطوط کو پڑھ کر اسے ہمیشہ اپنا یہ فیصلہ درست محسوس ہوتا تھا کہ وہ کاغذ و قلم کے ذریعے ہی اپنی روٹی روزی کمائے گا۔ اس نے جب یہ فیصلہ کیا تھا تو گھر کے جملہ افراد سمیت کسی نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ سب ہی کا خیال تھا کہ وہ اپنے اس احمقانہ فیصلے کے نتیجے میں بھوکوں مرے گا لیکن بے تحاشا مخالفت کے باوجود اس کے پائے استقلال میں ذرا سی لغزش نہ آئی اور وہ دل جمعی سے اپنے کام میں جُتا رہا کیونکہ جو وہ جانتا تھا اور سمجھتا تھا اسے دوسرے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بی اے کی معمولی سی ڈگری کے سہارے ملنے والی ملازمت بشرطیکہ وہ مل جاتی، کلرکی کے سوا کچھ اور ہونا مشکل تھی اور اس کلرکی کے ذریعے وہ لگی بندھی تنخواہ تو ضرور پاتا لیکن کھینچ تان کر گزرتے مہینے کے ساتھ ساتھ دفتر کا بے روح و بے رونق ماحول اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتا۔

وہ لفظوں کی دنیا کا بندہ تھا جس کے لیے ہندسوں میں الجھنا ناممکن تھا۔ بچپن سے جوانی تک اس نے جو واحد مشغلہ اختیار کیا تھا وہ کتب بینی ہی تھا۔ نصابی کتب سے زیادہ غیر نصابی کتب پڑھتے وہ نہ جانے کب خود بخود ہی لکھنے بھی لگا۔ جب شوقیہ لکھی یہ تحریریں شائع ہونے لگیں تو اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اسے قدرت کی طرف سے لکھنے کی صلاحیت تحفتاً دی گئی ہے۔ اس کی تحریر کی پختگی اور برجستگی کو قارئین نے بے حد پسند کیا اور وہ جلد ہی ان مصنفین میں شامل ہو گیا جنہیں اشاعتی ادارے معقول اعزازیہ دیتے ہیں۔ ملنے والے اعزازیے نے جب اس کی ان چھوٹی موٹی ضرورتوں اور خواہشات کو پورا کرنا شروع کیا جن کے لیے وہ ابا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے جھجکتا تھا تو خود بخود ہی لکھنے اور لکھ کر چھپوانے کی لگن بڑھتی چلی گئی اور پھر یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ اب اسے یہی کام کرنا ہے۔

سب سے پہلے اس نے ابا کو اپنے فیصلے سے اس وقت آگاہ کیا جب وہ اس کی بی اے میں کامیابی کے بعد اسے اپنے کسی دوست کی معرفت ایک دفتر میں ملازمت دلوانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے فیصلے کو سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے اور اسے اونچ نیچ سمجھاتے سمجھاتے خاصا برا بھلا بھی کہہ گئے۔ ان کے خیال میں اس عمر میں جب وہ بیٹے کو اپنا دست و بازو بنا دیکھنا چاہتے تھے وہ نااہلی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس ذمے داری کو بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو عزت و آبرو کے ساتھ اس گھر سے رخصت کرنا ہے۔ اس نے ابا کو سمجھانا چاہا کہ وہ





دفتر میں کلرکی کرنے کے مقابلے میں کاغذ قلم کے ذریعے زیادہ معقول طریقے سے یہ سارے کام کر گزرے گا لیکن وہ اس کی بات نہیں سمجھے البتہ اولاد کو نافرمان اور نکما سمجھتے ہوئے خاموشی ضرور اختیار کر لی۔ ان کی یہ ناراضی بھری خاموشی اس وقت مسکراہٹ میں بدلی جب رضوان نے کتابی شکل میں شائع ہونے والے اپنے پہلے ناول کی رائلٹی کی رقم انہیں تھمائی۔ اس موقع پر اس کی والدہ نے بھی یہ انکشاف کیا کہ ہر ماہ رضوان انہیں پابندی سے رقم دیتا رہا ہے اور انہوں نے اس رقم کو جوڑ کر ایک بیٹی کے جہیز کے لیے کچھ سامان خرید لیا ہے۔ ابا خوش ہوئے لیکن پھر بھی اسے نصیحت کی کہ کہیں ملازمت ضرور کرے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے وہ ہوائی روزی ہے اور ملازمت چاہے کم تر ہی کیوں نہ اس لیے زیادہ مناسب رہتی ہے کہ ہر ماہ لگی بندھی تنخواہ ہاتھ میں ضرور آتی ہے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ وہ ملازمت کے ساتھ اپنے لکھنے کے شوق کو جاری رکھ سکتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ کم از کم اس کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف اسی وقت لکھ پاتا تھا جب ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تازہ دم ہو۔ کسی بھی طرح کی تھکن اس کی لکھنے کے لیے آمادگی ختم کر دیتی اور وہ اپنے اس ہنر سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہ اپنے شوق کو ہی اپنا ذریعۂ معاش بنانے پر تُلا ہوا تھا۔ آخر کار ابا نے بھی ہار مان لی اور نتیجہ یہ رہا کہ اس نے ابا کے شانے سے شانہ ملا کر دونوں بہنوں کو نہایت خوش اسلوبی سے ان کے گھروں کو رخصت کر دیا۔ بہنوں کی شادی کے بعد اماں کو اس کے سر پر سہرا سجانے کا شوق چڑھا اور جب وہ لڑکیاں دیکھنے نکلیں تو ایک بار پھر اس کی آزمائش شروع ہو گئی۔ لڑکی والوں کو جب یہ بتایا جاتا کہ لڑکا لکھتا ہے تو وہ بڑے مدبر سے سر ہلاتے اور کہتے۔

''یہ تو اچھی بات ہے لیکن یہ بتائیں کہ لڑکا کام کیا کرتا ہے؟'' لکھنے کو کوئی کام سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا شبانہ سے رشتہ طے ہو سکا وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ شبانہ اس کی تحریروں کی دیوانی تھی اور یہ جان کر کہ اس کے لیے رضوان عباسی کا رشتہ آیا ہے اس نے کسی صورت اپنے گھر والوں کو انکار نہیں کرنے دیا۔ شادی کے بعد اس نے خود رضوان کو بتایا تھا کہ اگر وہ اس سے شادی کے لیے اَڑ نہ گئی ہوتی تو اس کے گھر والے کسی صورت یہ رشتہ قبول نہیں کرتے۔ انہوں نے ہامی بھی اسی شرط پر بھری تھی کہ بعد میں شبانہ ان کے سامنے کسی تنگی ترشی کا رونا نہیں روئے گی۔ شبانہ نے یہ شرط قبول کر لی اور اب وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

زندگی میں آسائشوں کی فراوانی نہیں تھی تو ایسی تنگی بھی نہیں تھی کہ کبھی اپنی پسند کا پھل کھانے اور بچوں کو معقول اسکول میں پڑھانے کے لیے دل کو مارنا پڑا ہو۔ وہ لوگ خوش تھے اور متوسط آبادی میں موجود اس گھر میں اچھی بھلی زندگی گزار رہے تھے لیکن اس وقت مسئلہ تھا اس کال بیل کا جس نے بے وقت بج کر اس کی اچھی بھلی روانی سے چلتی کہانی کا ٹیمپو توڑ دیا تھا۔ ناچار وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے کال بیل ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے باہر موجود شخص کی بے صبری پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کی اور پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر اس کے پڑوس میں رہنے والا بچہ عباد کھڑا تھا۔ اتنے غیر اہم ملاقاتی کو دیکھ کر اسے خود بخود ہی غصہ آنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے کی سرد مہری کو چھپانے میں ناکام رہا۔

www.paksociety.com

''السلام علیکم ........ وہ جی میں دادا جی سے ملنے آیا تھا۔'' مدقوق سے عباد نے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ تھوڑا سا شرمندہ ہوگیا اور یہ بھی یاد آ گیا کہ ابا جی کی علالت کا سن کر ہی عباد نے ان کے گھر با قاعدگی سے آنا جانا شروع کیا تھا اور کئی روز سے پابندی کے ساتھ وہاں آ رہا تھا۔ شبانہ نے اسے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کے مطابق عباد روزانہ آ کر خاموشی سے ابا جی کے بستر کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور خاموشی سے انہیں تکتا رہتا تھا۔ اس نے کبھی انہیں ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، اس لیے شبانہ کو اس کی آمد اور گھنٹوں کے حساب سے بیٹھنا قابلِ اعتراض نہیں لگا تھا۔ وہ اپنی سہولت کے حساب سے اس کی خاطر مدارت بھی کر دیا کرتی تھی لیکن مسئلہ وہی تھا کہ آج شبانہ موجود نہیں تھی اور اس کی واپسی کا بھی جلد امکان نہیں تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا کہ وہ عباد کو دروازے سے ہی لوٹا دے لیکن پھر ایسا نہیں کر سکا بلکہ اس چھوٹے سے لڑکے کو دیکھ کر اسے اس احساسِ شرمندگی میں مبتلا ہونا پڑا کہ وہ سگا بیٹا ہو کر ابا کے لیے اتنا وقت نہیں نکال پاتا کہ یوں گھنٹوں کے حساب سے ان کے ساتھ بیٹھ سکے اور وہ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ان کے لیے اتنا وقت نکالتا ہے۔

''رضوان انکل! آج آنٹی گھر میں نہیں ہیں کیا؟'' اس کی سوچوں سے بے خبر عباد اس سے نہایت مہذبانہ لہجے میں مخاطب تھا۔ وہ اس کے چھوٹے بیٹے کا ہم عمر تھا اور ابا جی کی علالت سے قبل بھی کبھی کبھار کھیلنے کے لیے ان کے گھر آ جاتا تھا اس لیے اسے یہ بات معلوم تھی کہ دیگر بہت سے کاموں کی طرح دروازے پر ہونے والی بیل کے جواب میں وہاں تک آنے کی ذمے داری بھی شبانہ کے کاندھوں پر ہی تھی اور رضوان لکھنے پڑھنے کے دوران اپنی جگہ سے اٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

''وہ بچوں کے اسکول گئی ہوئی ہیں۔ ابا جی بھی سو رہے ہیں۔ بہر حال تم اندر آ جاؤ۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے عباد کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ عباد کو ابا جی کے سونے جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ جاگتے رہیں تب بھی کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ طبی اعتبار سے انہیں کوئی ایسی خاص قابلِ ذکر بیماری بھی نہیں تھی لیکن ان کا بڑھاپا ان کے لیے بیماری بن گیا تھا اور وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ انہیں بات کرنے میں بھی مشکل پیش آتی تھی۔ دن بھر میں وہ برائے نام ہی غذا لیتے تھے۔ پچھلے دنوں تو کمزوری کی وجہ سے ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ سانس رکنے لگی تھی اور انہیں اسپتال منتقل کرنا پڑا تھا۔ وہاں ڈاکٹروں نے انہیں گلوکوز وغیرہ چڑھایا اور پھر یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ وہ جس حال میں ہیں اس کے لیے کوئی علاج نہیں یہاں تک کہ ان کے اندر اتنی جان بھی نہیں کہ وہ طاقت وغیرہ کی دوائیں برداشت کر سکیں اس لیے بہتر ہے کہ انہیں گھر لے جائیں اور آرام سے زندگی کی باقی ماندہ سانسیں پوری کرنے دیں۔

محلے میں سب ہی کو اس بات کی خبر ہو گئی تھی کہ ابا کا کیا حال ہے اور کسی بھی وقت ان کا بلاوا آ سکتا ہے۔ تقریباً تمام ہی محلے دار ان کی عیادت کے لیے آئے تھے لیکن عباد کی طرح کوئی اور اتنی پابندی سے نہیں آتا تھا۔ شبانہ نے اس سے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے عباد کی خاصی تعریف بھی کی تھی اور اس نے نہایت عالمانہ اور دانشمندانہ طریقے سے عباد کے اس رویے کی توجیہہ بھی پیش کر دی تھی۔

''بے چارہ یتیم بچہ ہے۔ ایک سال کا تھا تو اس کا باپ ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ دادا نے ہی بہو اور بچوں کی دیکھ بھال کی، پچھلے سال وہ بھی گزر گئے۔ شاید ابا جی کو دیکھ کر اسے اپنے دادا یاد آتے ہیں اسی



www.paksociety.com



لیے روزانہ یہاں چلا آتا ہے۔'' شبانہ بھی اس دلیل سے قائل ہو گئی تھی اور عباد کے روزانہ چلے آنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ویسے بھی اس کے آنے سے ان کا کیا جاتا تھا۔ الٹا وہ ابا کے کمرے میں بیٹھا رہتا تو یہ تسلی رہتی کہ وہ تنہا نہیں ہیں ورنہ کاموں کے دوران بھی شبانہ کو بار بار ان کے کمرے کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ اس کا گھر سے باہر جانا بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ وہ تو آج مجبوراً اسے بچوں کے اسکول جانا پڑا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہاں سے مسلسل ان کے بڑے بیٹے کی شکایت موصول ہو رہی تھی اور پرنسپل نے آج شبانہ کو اس کے سلسلے میں لازماً اسکول پہنچ کر بات کرنے کی تاکید کی تھی۔

وہ ابا جی کے صبح کے معمولات نمٹا کر اسکول چلی گئی تھی۔ رضوان اس وقت تک ان کے کمرے میں بیٹھا رہا جب تک وہ سو نہیں گئے۔ ان کے سونے کے بعد وہ لکھنے پڑھنے کے لیے مخصوص اس چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جسے اسٹڈی روم کہا جا سکتا تھا۔ وہ ان لکھنے والوں میں سے تھا جو مخصوص جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ بیٹھ کر لکھ نہیں پاتے۔ اسے تو اپنی کرسی کی تبدیلی بھی برداشت نہیں تھی ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ابا جی کے کمرے میں بیٹھ کر ہی اپنا کام کر لیتا۔

''دادا جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اس کی معیت میں ابا جی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے عباد نے اس سے پوچھا۔

''بہتر ہے۔'' اس نے عباد کی تسلی کے لیے یہ مختصر جواب دیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ابا جی کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اور وہ واضح طور پر زندگی سے دور جاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ عباد جیسے کم سن بچے کو اس تلخ حقیقت سے قبل از وقت آگاہ کرے۔

## بیسن کا استعمال اور جلد

ویسے تو بیسن کا استعمال عام ہے اور مختلف طریقوں سے چہرہ پر لگایا جاتا ہے۔

خشک جلد: بیسن میں دودھ ملا کر پیسٹ بنا کر چہرے پر لگائیں اور کچھ دیر کے بعد چہرہ دھو لیں۔

چہرے پر جلن: اگر چہرے پر جلن ہو رہی ہو تو پھر بیسن میں ٹھنڈا پانی ڈال کر پیسٹ بنا کر لگائیں دس منٹ کے بعد اتار دیں۔

چکنی جلد: روزانہ بیسن سے چہرہ دھونے سے چکناہٹ اور میل کچیل دور ہوتی ہے۔

نارمل جلد: بیسن میں چند قطرے عرقِ گلاب اور پانی ملا کر لگائیں بعد میں اتار لیں۔

مرسلہ: بتول فاطمہ، چیچن آباد

''میرے دادا بیمار ہو کر اس طرح بستر پر لیٹے تھے تو تین دن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔'' عباد نے کچھ سوچتے ہوئے عجیب سے لہجے میں یہ بات کی۔ لفظوں سے کھیلنے والے رضوان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات پر کیا تبصرہ کرے۔ دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ابا جی کے بستر کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عباد کی بات نے اسے اماں کی موت یاد دلا دی تھی۔ وہ بھی تو معمولی بخار میں تین دن کے اندر چٹ پٹ ہو گئی تھیں۔ ان سے بے حد محبت کرنے والے ابا جی نے ان کی موت کا بہت زیادہ اثر لیا تھا اور آہستہ آہستہ دنیا سے کٹتے چلے گئے تھے یہاں تک کہ انہیں پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے

میں بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جب آدمی کو خود اپنا خیال نہ ہو تو دوسرے لوگ کہاں تک اس کا دھیان رکھ سکتے ہیں۔ نتیجتاً چند سالوں میں ہی ابا جی اس حال کو پہنچ گئے کہ آج ان کی سانسیں گنی جا رہی تھیں۔

"تم آج اسکول نہیں گئے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رضوان نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں...... میں ایک ہفتے سے اسکول نہیں جا رہا ہوں۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں بھئی، طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے؟" رضوان نے اچنبھے سے پوچھا کیونکہ آج کل تو تقریباً سارے ہی اسکولوں میں تعلیمی سال اختتام کے قریب تھا اور زور شور سے پڑھائی کے ساتھ سالانہ امتحان کی تیاریاں جاری تھیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے لیکن امی نے ہم لوگوں کو اسکول جانے سے منع کر رکھا ہے۔" اس نے اپنے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟" رضوان کی زبان سے ایک لفظی سوال پھسلا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گہری نیند سوئے ہوئے ابا جی کے نقاہت زدہ چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات تھی اور رضوان نے صاف محسوس کیا تھا کہ اس نے اس کا سوال سننے کے باوجود جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ الجھ سا گیا لیکن ظاہر ہے اسے جواب دینے کے لیے مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ خود بھی خاموشی اختیار کر لی اور لمحے بھر کے توقف کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"تم بیٹھو، میں تمہارے لیے کوئی جوس وغیرہ لے کر آتا ہوں۔" کمرے سے نکل کر وہ کچن میں آ گیا اور فریج کھول کر دیکھا۔ فریج میں اسے جوس کا کوئی ڈبا یا کولڈ ڈرنک کی بوتل نظر نہیں آئی اور ساتھ ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ شبانہ نے اس سے ان چیزوں سمیت گھر کا دوسرا سودا سلف ختم ہونے کا ذکر کیا تھا۔ ابا جی کی طبیعت کی وجہ سے وہ خود خریداری کے لیے جانے سے گریز کر رہی تھی اور ایک فہرست تیار کر کے اسے دے دی تھی۔ وہ فہرست دو دن سے اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اس کی توجہ کی طالب تھی۔ اپنی بے پروائی پر خود کو دل ہی دل میں سرزنش کرتے ہوئے ایک کیبنٹ کھول کر چیک کیا۔ شکر وہاں شربت کی بوتل موجود تھی۔ خود کو اپنی بے پروائی کی سزا دینے کے لیے وہ شربت تیار کرنے کے لیے راضی ہو گیا ویسے بھی تسلسل ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کا لکھنے کا موڈ تو ختم ہی ہو گیا تھا اس لیے گھر آئے چھوٹے سے مہمان کی خاطر مدارت کے لیے تھوڑے سے ہاتھ پیر چلا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے نہایت جاں فشانی سے شربت کے دو گلاس تیار کیے اور ٹرے میں رکھ کر کمرے کی طرف چلا۔ اندر داخل ہوتا کہ اس سے قبل ہی اسے وہاں سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ اسے حیرت ہوئی۔ ابا جی تو مہینے سے اوپر ہوا بولنا بالکل ترک کر چکے تھے تو کیا پھر عباد ان سے یک طرفہ گفتگو کر رہا تھا؟ اسے تجسس ہوا اور وہ اس چھوٹے سے لڑکے کی گفتگو سننے کے لیے وہیں رک گیا۔

"آپ کا انتقال کب ہوگا دادا جی...؟" عباد کا پہلے جملہ ہی کان میں پڑا تو اسے زور کا جھٹکا لگا لیکن وہ بے حد ضبط کر کے وہیں کھڑا رہا۔

"پلیز دادا جی آپ جلدی سے مر جائیں نا! دیکھیں اس طرح بستر پر لیٹ کر زندہ رہنے سے فائدہ بھی کیا ہے لیکن اگر آپ مر گئے تو ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ شبانہ آنٹی چالیس دن تک ہمیں آپ کی پسند کے مزے مزے کے کھانے پکا کر بھیجیں گی جیسے کونے والے قریشی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیگم نے بھجوائے تھے۔ آپ کے پرانے



www.paksociety.com



کپڑے بھی ہمارے کام آ جائیں گے، امی انہیں چھوٹا کر کے ہمیں پہنا دیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاید رضوان انکل آپ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے امی کو کچھ رقم بھی دے دیں۔ اس رقم سے ہمارے اسکول کی فیس جمع ہو جائے گی اور ہم بہن بھائی پھر سے اسکول جانے لگیں گے۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے دادا جی، میں پڑھ لکھ کر کوئی اچھی سی نوکری کرنا چاہتا ہوں تا کہ میری امی کو سلائی نہ کرنی پڑے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ سلائی کر کر کے وہ بیمار سی ہو گئی ہیں اور ان سے کام نہیں ہو رہا ہے، اوپر سے ہمارے کرائے دار بھی گھر خالی کر کے چلے گئے ہیں۔ امی کے پاس بالکل بھی پیسے نہیں بچے ہیں اور وہ پریشان ہیں کہ دو چار دن میں گھر میں موجود آٹا اور دال بھی ختم ہو گیا تو وہ ہم لوگوں کو کیا کھلائیں گی اسی لیے میں آپ سے ریکویسٹ کر رہا ہوں کہ جب آپ کو مرنا ہی ہے تو جلدی مر جائیں۔" اپنی بات کے اختتام پر عباد سسکیوں سے رونے لگا۔ معلوم نہیں اندر ابا جی جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے لیکن باہر کھڑے رضوان کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ نکلے۔ اس چھوٹے سے لڑکے کی گفتگو نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اس کے پڑوس میں آباد عباد کی فیملی کس مشکل سے زندگی کو گھسیٹ رہی تھی۔

وہ ایک لکھاری تھا اور اپنی دنیا میں ہی مگن رہنے کو کافی سمجھتا تھا۔ تحریر سے اس درجے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ اس کے قلم نے کئی شاہکار تخلیق کیے تھے اور کہنے والے کہتے تھے کہ اس کا قلم نہایت حساس موضوعات کو نہایت خوب صورتی سے کاغذ پر بکھیرنے میں مہارت رکھتا ہے۔ وہ ایک حساس اور معاشرے کے نباض قلمکار کی حیثیت سے مشہور تھا لیکن عباد کے الفاظ نے اسے بتایا تھا کہ اس کی بے حسی کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ اس کے عین پڑوس میں ایک ایسا خاندان بس رہا تھا جنہیں زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے سسکنا پڑ رہا تھا اور وہ بے خبر کاغذ قلم میں کھویا ہوا تھا۔ کیا ایسا شخص معاشرے کا نباض کہلانے کا حق دار تھا جسے اپنے بالکل پڑوس میں سسکتی زندگی کا علم نہ ہو۔ کیا اس جیسا لکھاری معاشرے میں کوئی مثبت انقلاب لا سکتا تھا جس کی عین ناک تلے ایک بچے کی نفسیات اتنی بری طرح بگڑ چکی ہو کہ وہ ایک انسان کے مرنے میں اپنی بہبود کو ڈھونڈ رہا ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ ترستا، بلکتا، اور سسکتا بچہ آنے والے کل میں لوگوں کو قتل کرنے میں بھی اس لیے حرج محسوس نہ کرے کہ اس کی ذات کو اس سے فائدہ ملنے کا امکان ہو اور یہ سب اس لیے ہوتا کہ وہ رضوان عباسی جو کہ ایک مشہور و معروف مصنف تھا، جس کی تحریریں زندگی کے ہر رنگ سے بھری ہوئی تھیں اپنے قریب ترین پڑوسی کے حال سے بے خبر رہا تھا۔ اپنی تحریروں میں جا بجا قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ دینے والے رضوان عباسی کی نظر سے کیا کبھی وہ احادیث نہیں گزری تھیں جن میں پڑوسیوں کے حقوق بیان کیے گئے تھے۔ ایک ایک کر کے کئی سوال اس کے ذہن میں ابھرتے جا رہے تھے اور اس کی پیشانی عرقِ ندامت سے بالکل اس طرح تر ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے میں رکھے گلاسوں کی سطح پر ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ وہ کھنکھارتا ہوا تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اگر زیادہ تاخیر ہو جاتی تو شربت گرم ہو کر پینے کے لائق نہیں رہتا اور اب وہ کسی بھی معاملے میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ شبانہ کی تیار کردہ فہرست کے مطابق خریداری کا معاملہ ہو یا اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری۔

ناولٹ

# کوئی شہر ایسا بساؤں میں

نگہت سیما

تیسرا حصہ

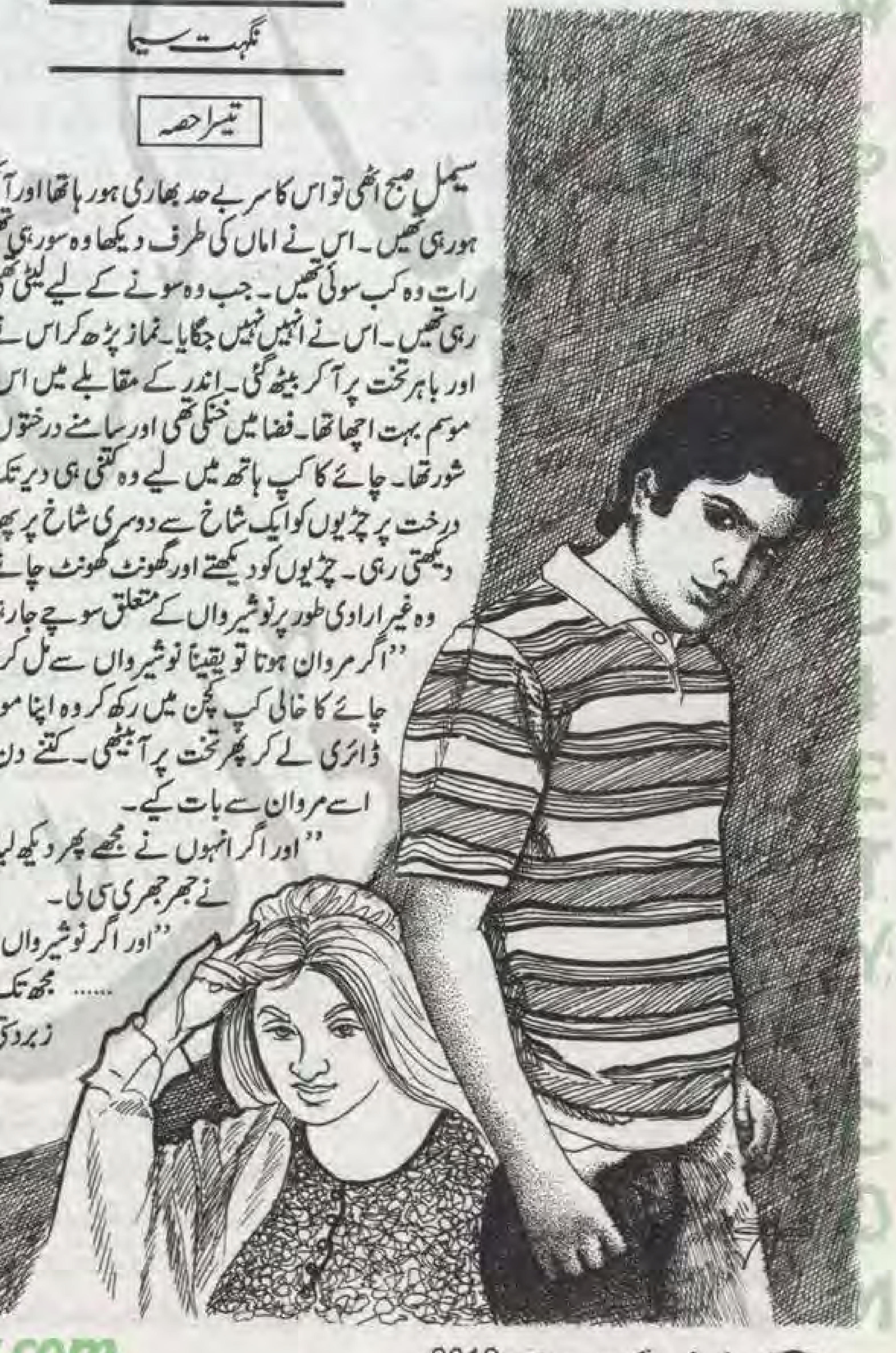

سیمل صبح اٹھی تو اس کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھیں۔ جانے رات وہ کب سوئی تھیں۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ اس نے انہیں نہیں جگایا۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے بنائی اور باہر تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ اندر کے مقابلے میں اس وقت باہر کا موسم بہت اچھا تھا۔ فضا میں خنکی تھی اور سامنے درختوں پر چڑیوں کا شور تھا۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر تک جامن کے درخت پر چڑیوں کو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے ہوئے دیکھتی رہی۔ چڑیوں کو دیکھتے اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر نوشیرواں کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

''اگر مروان ہوتا تو یقیناً نوشیرواں سے مل کر خوش ہوتا۔''

چائے کا خالی کپ کچن میں رکھ کر وہ اپنا موبائل، قلم اور ڈائری لے کر پھر تخت پر آ بیٹھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے مروان سے بات کیے۔

''اور اگر انہوں نے مجھے پھر دیکھ لیا تو......'' اس نے جھرجھری سی لی۔

''اور اگر نوشیرواں نہ ہوتا تو وہ ...... مجھ تک پہنچ جاتے۔ زبردستی مجھے لے جاتے تو...... پھر



اماں کا کیا ہوتا مروان۔ پتا ہے مروان یہ جو نوشیرواں ہے نا، کل اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ڈاکٹر عرفان کہتے ہیں اس ایک ماہ میں اماں نے جو ردِعمل ظاہر کیا ہے وہ بہت پُرامید ہے۔ ہم نے کتنی دعائیں کی تھیں نا اماں کے لیے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ ہماری ہر خوشی کتنی ادھوری ادھوری سی ہوتی تھی۔ تب ڈاکٹر عمر ہمیں ڈھارس دیتے تھے ہمارا حوصلہ بڑھاتے تھے اور اب ڈاکٹر عرفان ہیں...... لیکن مروان بعض دعائیں اتنی دیر سے کیوں قبول ہوتی ہیں کہ ان کی قبولیت کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ آپ بھی ہوتے یہاں تو یہ خوشی کتنی مکمل ہوتی۔

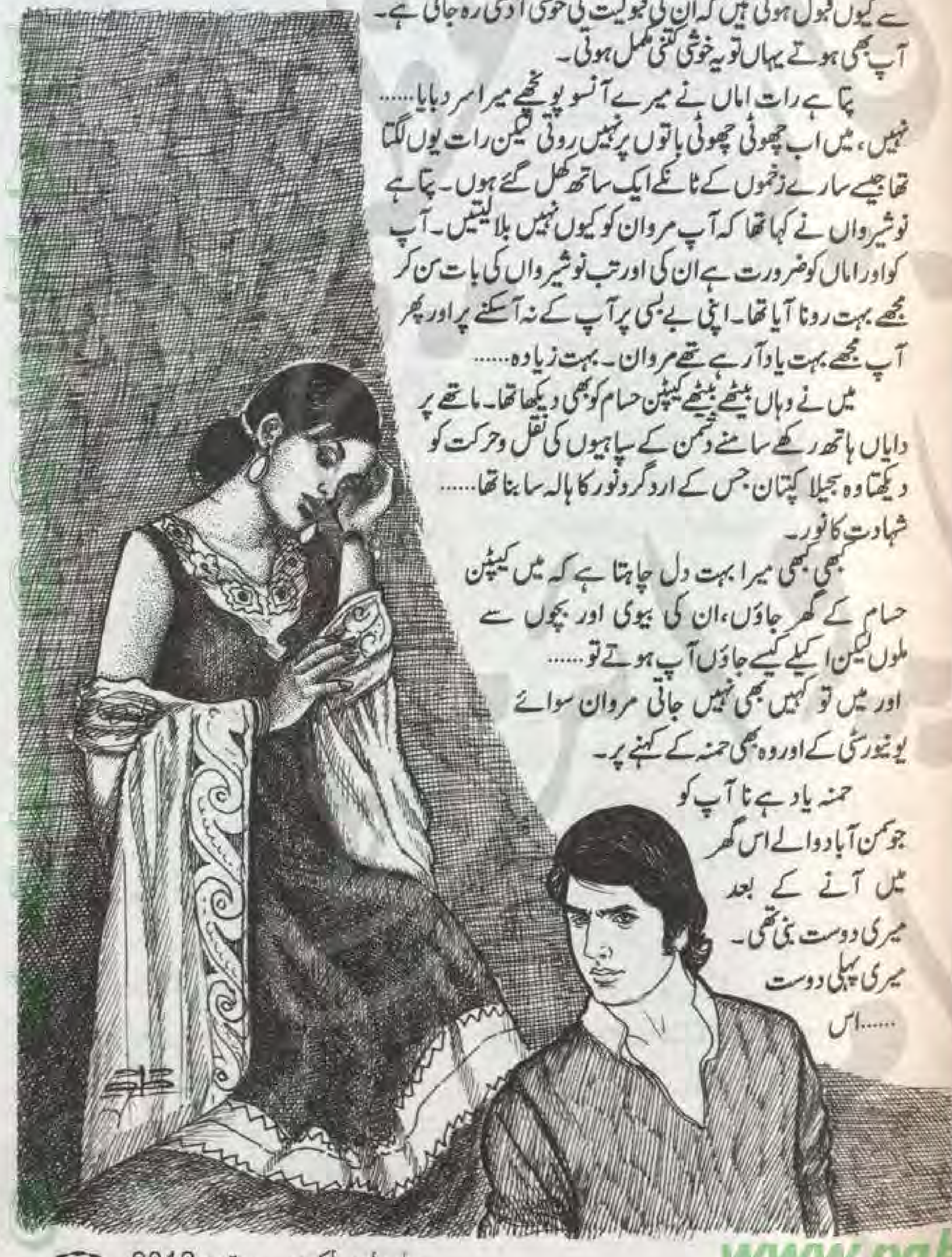

پتا ہے رات اماں نے میرے آنسو پونچھے میرا سر دبایا......

نہیں، میں اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتی لیکن رات یوں لگتا تھا جیسے سارے زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ کھل گئے ہوں۔ پتا ہے نوشیرواں نے کہا تھا کہ آپ مروان کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔ آپ کو اور اماں کو ضرورت ہے ان کی اور تب نوشیرواں کی بات سن کر مجھے بہت رونا آیا تھا۔ اپنی بے بسی پر آپ کے نہ آسکنے پر اور پھر آپ مجھے بہت یاد آ رہے تھے مروان۔ بہت زیادہ......

میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے کیپٹن حسام کو بھی دیکھا تھا۔ ماتھے پر دایاں ہاتھ رکھے سامنے دشمن کے سپاہیوں کی نقل و حرکت کو دیکھتا وہ سجیلا کپتان جس کے اردگرد نور کا ہالہ سا بنا تھا...... شہادت کا نور۔

کبھی کبھی میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کیپٹن حسام کے گھر جاؤں، ان کی بیوی اور بچوں سے ملوں لیکن اکیلے کیسے جاؤں آپ ہوتے تو......

اور میں تو کہیں بھی نہیں جاتی مروان سوائے یونیورسٹی کے اور وہ بھی حمنہ کے کہنے پر۔

حمنہ یاد ہے نا آپ کو جو سمن آباد والے اس گھر میں آنے کے بعد میری دوست بنی تھی۔ میری پہلی دوست ...... اس

www.paksociety.com

نے میرے ساتھ ہی بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا اور وہ آپ سے بہت متاثر تھی۔ جن دنوں آپ آتے تو وہ ہمارے گھر کے بہت چکر لگاتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی کہا نہیں لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرنے لگی تھی اور میں نے بھی سوچا تھا کہ جب کبھی گھر میں آپ کی شادی کا ذکر ہوا تو میں حمنہ کا نام لوں گی۔ حمنہ نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے مروان...... پہلے حمنہ اور اب میراں اماں اور نوشیرواں......

اور یہ جو نوشیرواں ہے، اس کا ایک ماموں زاد بھائی ہے جو لاپتا ہے گیارہ مہینے سے...... اور پتا نہیں یہ لاپتا افراد کہاں ہیں؟ ایسے بہت سارے لوگ ہیں مروان جن کے گھر والے، بچے، مائیں، بیویاں، بہنیں ہر رات دعائیں مانگ کر سوتی ہیں کہ صبح کا سورج شاید ان کے لیے کوئی خوشخبری لے کر آئے شاید بچھڑوں سے ملاقات کا سندیسہ ملے لیکن سورج پھر ایک نئی امید کی کرن انہیں تھما کر غروب ہو جاتا ہے۔ زندگی کچھ زیادہ ہی مشکل لگنے لگی ہے اور مجھے وہ نظم بہت یاد آتی ہے مروان جو اکثر آپ گنگنایا کرتے تھے۔ جب ہم سمن آباد والے اس گھر میں آئے تھے تو یہاں اس تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے آپ لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے ہاتھوں میں ایک میگزین تھا۔ میں کچن سے باہر آئی تو آپ نے مجھے بلایا تھا یاد ہے نا۔

''ارے سنو فرینڈ ایک بہت پیاری نظم ہے محسن نقوی کی۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی

ان دنوں کیسے خواب دیکھتے تھے ہم...... ایک ''یوٹوپیا'' تھا جس میں ہم رہ رہے تھے'' مروان سے باتیں کرتے ہوئے اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا سورج سامنے دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا اور اپنی کرنیں صحن میں پھیلا رہا تھا۔

''سیمل بچہ......'' میراں اماں نے دیوار پر سے آواز دی تو اس نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

''جی اماں!'' وہ تخت سے اتر کر صحن کی دیوار کے پاس گئی۔

''بچہ خیریت ہے! شیری بتا رہا تھا آج تم یونیورسٹی نہیں گئیں۔''

''ہیں۔ نواب کیا اسے الہام بھی ہونے لگا ہے۔'' اس نے حیرت سے سوچا۔

''وہ دہی لینے گیا تھا تو بتا رہا تھا کہ حمنہ اکیلی اسٹاپ پر کھڑی تھی۔''

''جی!'' وہ حیرت کے جھٹکے سے باہر آئی۔ ''بس یوں ہی سستی ہو رہی تھی۔''

''اچھا، اچھا...... شکر اللہ کا!'' میراں اماں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

''امینہ بہن بھی ٹھیک ہیں نا؟''

''جی، اماں سو رہی ہیں بس جگانے ہی لگی تھی۔'' میراں اماں نے پیچھے مڑ کر دیکھا شاید نوشیرواں نے کچھ کہا تھا پھر وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بچہ شیری کہہ رہا ہے وہ کل امینہ بہن کو ڈاکٹر کی طرف لے جائے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن ڈاکٹر نے تو اتوار کو آنے کا کہا تھا۔''

''ہاں لیکن پرسوں شیری نے جانا ہے کام سے پھر وہ پیر کو ہی واپس آئے گا تو......''

''میں لے جاؤں گی خود ہی اماں کو۔''

''نہ بچے، جب شیری ہے تو تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے اور شیری نے بات کر لی ہے ڈاکٹر سے۔'' انہوں نے نوشیرواں کا پیغام نشر کیا تب وہ



www.paksociety.com



خاموش ہو گئی۔

''چلو اچھا ہوا، کیا خبر وہ پھر وہاں آئے ہوں اور ان سے کچھ بعید بھی نہیں۔ میں شام کو جا کر نوشیرواں کو اماں کی فائل دے آؤں گی اور رات کی ان کی کیفیت بھی بتا دوں گی اور پھر نوشیرواں نے مجھ سے بات بھی تو کرنا تھی اور پتا نہیں کیا بات؟'' ایک لمحے کے لیے اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا۔ میراں اماں دیوار کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ اس نے واپس مڑ کر اپنا سامان اٹھایا تب ہی دروازے پر بیل ہوئی۔ فضیلت آئی تھی۔

''تم نے اتنی دیر کر دی فضیلت اگر مجھے یونیورسٹی جانا ہوتا تو اماں پیچھے اکیلے کیسے رہتیں؟''

''وہ جی بس کوئی ایمرجنسی تھی، میں نے سوچا تھا جی آپ...... اماں کو چھوڑ دیں گی میراں اماں کی طرف۔''

''تمہیں ہر مسئلے کا حل میراں اماں ہی نظر آتی ہیں۔'' وہ جھنجلائی تھی لیکن پھر فوراً ہی نارمل ہو گئی۔

''ٹھیک ہے جاؤ، کچن صاف کر کے اماں کے لیے ناشتا بنا دو، ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دینا۔'' بہرحال فضیلت کے دم سے اسے بڑا آسرا تھا اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ فضیلت دیر سے آئی تھی۔ ورنہ ابھی وہ تیار ہی ہو رہی ہوتی تھی کہ فضیلت آ جاتی تھی۔ تخت پر سے اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ کمرے میں آئی تو اماں جاگ کر بیڈ پر بیٹھی کچھ پریشان سی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا ہو۔

''اماں جی آپ جاگ گئیں؟'' ان کے قریب جا کر پیشانی پر بکھرے ان کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے بے حد محبت سے پوچھا۔ اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ اماں کے اس عمل نے اسے حیران کیا لیکن وہ مسکرا دی۔

''اماں چلیں آپ کا منہ ہاتھ دھلوا دوں جب تک فضیلت ناشتا بنا کر لاتی ہے...... پھر ہم دونوں اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کی ہے۔ آج ہم خوب باتیں کریں گے۔'' اماں کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ انہوں نے بغیر اس کے کہے نیچے اتر کر چپل پہنی اور واش روم کی طرف چل دی تھیں۔ وہ حیرت سے کھڑی انہیں واش روم کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی پھر بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

''مروان...... مروان ڈاکٹر عرفان صحیح کہتے ہیں اماں امپروو کر رہی ہیں۔'' کتنے سال گزر گئے...... اماں نے کبھی خود سے اٹھ کر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر واش روم لے جاتی تو چلی جاتیں۔ کھانا سامنے رکھ کر کھانے کو کہتی تب بھی بیٹھی رہتیں اور خالی خالی نظروں سے کھانے کو دیکھتی رہتیں۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دیتی تو ایسے ہی پڑے رہتے جب تک خود نہ بدلواتی وہ یونہی بیٹھی رہتیں۔

''تو...... تو کیا...... سچ مچ اماں...... یا اللہ تیرا شکر ہے، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کچھ امید تو بندھی کچھ آس تو ہوئی کہ ایک دن اماں بالکل نارمل ہو جائیں گی۔'' وہ اماں کے بیڈ پر ہی بیٹھ کر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

''آج سارا دن اماں سے خوب باتیں کروں گی اور رات کو پارک بھی لے کر جاؤں گی۔'' وہ اماں کے بیڈ پر بیٹھ کر پلان بناتی رہی اور اماں خود ہی منہ ہاتھ دھو کر آ گئیں پھر فضیلت ناشتا لے آئی تو ناشتا کر کے اس نے اماں کے کپڑے نکال کر انہیں چینج کرنے کے لیے دیے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اماں خود سے کپڑے بدلتی ہیں یا نہیں لیکن اماں ایک بار پھر چپ سی خالی خالی نظروں سے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

''اماں جی یہ کپڑے بدل لیں آپ۔'' اس نے

کپڑوں کی طرف اشارہ کیا لیکن اماں اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اس کی بات نہ سمجھ رہی ہوں بالکل پہلے کی طرح...... یکدم مایوسی نے اس کے دل میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑے تو اندر کہیں نمی پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور مسکراتے لب بھینچ گئے۔

''یہ......!'' اماں نے دوپٹا اٹھا کر اسے دکھایا تھا۔ وہ چونکی۔

''ہاں، اماں جی یہ آپ کے کپڑے ہیں آپ چینج کریں گی نا۔'' اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ تب اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو میڈیسن دیں۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئیں اور کچھ دیر بعد وہ سو گئیں تو وہ باہر آ گئی۔ فضیلت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''فضیلت سنو اماں سو رہی ہیں، ان کا دھیان رکھنا، میں ذرا میراں اماں کی طرف جا رہی ہوں، یہ اماں کی فائل دینے۔ وہ میراں اماں کے بیٹے ہیں نا وہ کل اماں کو ڈاکٹر کی طرف لے کر جائیں گے، تم اماں کے کپڑے بدلوا کر کے انہیں تیار کر دینا۔ اگر وہ کہیں تو ساتھ بھی چلی جانا۔'' فضیلت کو ہدایات دے کر وہ کرسی پر چڑھ کر میراں اماں کے گھر میں اتر گئی۔ جب وہ دوسری طرف سیڑھی سے اتر رہی تھی تو اس کی نظر نوشیرواں پر پڑی۔ وہ برآمدے میں تخت کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور بے اختیار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا لیکن وہ بدستور فون پر بات کر رہا تھا مگر اس کی نظریں سیمل پر تھیں جو سیڑھی سے اتر کر اب صحن میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے فائل کو پیشانی کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جب اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو وہ کہہ رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج سات آٹھ سالوں بعد لوگ کیوں یہ کہہ رہے ہیں کہ کارگل میں جو ہوا وہ حماقت تھی اور یہ کون لوگ ہیں؟ میجر عثمان فارگاڈ سیک......'' اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ''آپ تو اس طرح کے ریمارکس مت دیں۔ محض ایک ایسے صحافی کی تحریر پر جو اِدھر اُدھر سے سن کر اپنے کالم کا پیٹ بھرتا ہے کاش......'' یکدم دکھ اس کے لہجے میں اتر آیا تھا۔

''کاش، ہمارے صحافی اتنے ایکٹو اور بولڈ ہوتے کہ کچھ لکھنے سے پہلے مکمل تحقیق کرتے...... سمندر کی تہ میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا میجر عثمان...... لیکن ہم اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ ہم بغیر تحقیق کیے لکھ دیتے ہیں اور نشر کر دیتے ہیں۔ کارگل کی حقیقت سے آپ بے خبر تو نہیں میجر عثمان۔ کارگل کے برف کو رنگین بنانے والا خون حماقت نہیں تھی۔ کوئی کوشش اگر کامیاب نہ ہو سکے تو وہ حماقت تو نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے لیے کچھ بہتر اور اچھا کرنے کی کوشش کو حماقت کہنے والے محب وطن ہرگز نہیں ہیں۔ پتا نہیں کن لوگوں نے ان کے ہاتھوں میں قلم تھما دیا ہے۔'' اس کی آواز پھر بلند ہو گئی تھی۔

''ان کے منہ میں زبانیں نہیں، زہر میں بجھے تیر ہیں...... اور ہاتھوں میں قلم نہیں خنجر ہیں۔ یہ سب لکھنے سے پہلے اس ظالم نے کیپٹن شیر خان، حوالدار لالک شہید اور ان جیسے بہت سے دوسروں کے خاندان کے متعلق نہیں سوچا جنہیں اس فخر نے ان کی جدائی کا دکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دیا ہے کہ ان کے بیٹے شہید ہیں اور وطن کی خاطر انہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ان کشمیری مجاہدین کے لیے جن پر زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔ کارگل کی جنگ کا مقصد ان کشمیری مجاہدین کو ظلم و بربریت سے نجات دلانا تھا۔ کیا یہ جرم تھا؟'' وہ وہیں برآمدے کے پاس ساکت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں میں جیسے اردگرد کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ٹی وی کی اسکرین پر چلنے والی پٹی تھی جس پر کارگل کے شہیدوں کے نام آ رہے تھے۔ فون بند کر کے نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پاؤں برآمدے میں رکھے ساکت کھڑی تھی۔ برآمدہ صحن سے ذرا سا بلند تھا۔ سیمل کا ایک پاؤں صحن میں تھا اور دوسرا برآمدے کے کنارے پر۔

''سیمل!'' حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے نوشیرواں آگے بڑھا۔

''سیمل کیا ہوا؟''

''ہاں......'' وہ چونکی اور اس نے دوسرا پاؤں بھی برآمدے میں رکھا۔ ''میں یہ اماں کی فائل دینے آئی تھی۔''

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' نوشیرواں نے فائل اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پتا نہیں کیوں نوشیرواں کو لگا کہ اس کی بے حد خوب صورت غزالی آنکھوں کی سطح گیلی گیلی سی تھی۔

''کون ہے شیری؟'' میراں اماں کچن میں تھیں۔

''سیمل ہے اماں جان۔''

''اچھا، اچھا۔'' انہوں نے کچن کے کھلے دروازے سے جھانکا۔

''سیمل بچہ بیٹھو، میں یہ چاول بھگو کر آتی ہوں۔''

سیمل تخت پر بیٹھ گئی۔ نوشیرواں نے کھڑے کھڑے سرسری انداز میں فائل کھول کر دیکھی۔

''آپ نے کل یونیورسٹی جانا ہے؟''

''ہاں، حمنہ بہت ناراض ہو رہی تھی کہ آج کل اتنے اہم لیکچرز ہو رہے ہیں اور میں مس کر دیتی ہوں۔ دو تین ماہ کی تو بات ہے پھر فائنل ہو جائے گا تو......''

''ہاں ٹھیک ہے سیم، آپ کو کلاسز مس نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ تخت سے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''اور آپ کی اماں جان کیسی ہیں، رات ٹھیک رہیں؟''

اس نے صبح کا ان کا رویہ بتایا۔

''گڈ......'' وہ مسکرایا۔

''پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں سیم؟''

''نہیں تو......'' وہ دل میں جز بز ہوئی لیکن اس نے اس کے سیم کہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

''آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر پھر سے فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ ''ڈاکٹر عرفان سے پہلے یہ کوئی ڈاکٹر عمر تھے۔''

''ہاں، جب ہم گلبرگ میں رہتے تھے تو وہاں ڈاکٹر عمر تھے اماں کے معالج۔ انہوں نے پہلے psycho trauma ہی ڈائیگنوز کیا تھا لیکن پھر ان کی رائے بدل گئی تھی۔ ان دنوں اماں کافی بہتر ہو رہی تھیں بلکہ ڈاکٹر عمر کہتے تھے بہت جلد وہ اپنی حالت میں پلٹ آئیں گی اور مجھے اور مروان کو بھی لگتا تھا کہ......'' اس نے تفصیل بتائی۔ ''پھر ہمیں یہاں آنا پڑا امن آباد تو یہاں مروان، اماں کو ڈاکٹر عرفان سے چیک کروانے لگے۔''

نوشیرواں کا جی چاہا وہ پوچھے کہ ایسا کیا صدمہ پہنچا تھا اماں کو جو وہ برداشت نہیں کر سکیں لیکن پھر اس نے کچن سے باہر آتی میراں اماں کو دیکھا۔ جن کے سرخ و سپید چہرے پر صبر اور حوصلے کی تحریر رقم تھی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آ رہی تھیں اور یہ صبر یہ حوصلہ اللہ کی دین ہے اور اللہ کے سوا کون ہے جو یہ صبر عطا کرے۔ ایک لمحے کو نوشیرواں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ کیسے، کس طرح اماں نے سب



www.paksociety.com

کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا ہوگا۔ خبریں سننا اور ذرا سی دیر کو افسوس کر لینا اور بات ہے۔ آج پندرہ، آج چالیس بندے دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ سننے والوں کے لیے یہ صرف ایک خبر ہے لیکن جن پر یہ واردات گزرتی ہے اور جو اپنے جگر گوشوں کو اپنے ہاتھوں مٹی کے سپرد کرتے ہیں...... کاش کوئی ان کا سینہ چیر کر دیکھتا۔ ان کے درد کو محسوس کرتا۔ یہ ٹی وی چینلو پر تبصرہ کرتے اینکرز، اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر دہشت گردی کا احوال سناتے اگر صرف اور صرف میراں اماں کا دکھ جان پاتے تو ان کی آوازیں ان کے حلق میں ہی گھٹ جاتیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سترہ لاشیں کفن میں لپٹی آرہی تھیں...... ایک، ایک چہرہ اور صبر کا پیکر میراں اماں ایک، ایک چہرے کو چومتیں اور تڑپتا بلکتا سر پٹختا گل......! اس نے جھرجھری سی لی۔ میراں اماں، سیمل کو پیار کر رہی تھیں۔ وہ احتراماً کھڑا ہوگیا۔ سیمل کو پیار کر کے میراں اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بچے کھڑا کیوں ہوگیا بیٹھ...... سیمل بچی سے باتیں کر تھوڑی دیر۔ میں تو بس اسے ملنے کے لیے کچن سے نکلی ہوں۔ ہانڈی چڑھا رکھی ہے بھون کر اتار لوں...... پھر آتی ہوں، اتنے تم......"

"نہیں اماں جان، آپ کام کریں میں تو بس یہ فائل دینے آئی تھی انہیں، کل اماں کو اسپتال لے کر جانا ہے اب چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

"نہیں بچہ کچھ دیر تو بیٹھ، اچھا چل میں ہانڈی اتار آتی ہوں چولھے سے، اصل میں گرمی ہو جاتی ہے تو میں سویرے سویرے ہی کھانا بنا لیتی ہوں۔"

"جی...... فضیلت بھی ناشتے کے بعد ہانڈی چڑھا دیتی ہے۔ آپ کھانا بنالیں میں بیٹھتی ہوں۔"

"جانا نہیں بچہ......" وہ اسے تاکید کر کے واپس کچن کی طرف مڑیں۔

"بیٹھ جائیں نا سیمل۔" نوشیرواں کی آنکھیں یکدم سرخ ہوگئی تھیں۔ پتا نہیں کون کون سے منظر آنکھوں کے سامنے آکر انہیں لہو رنگ کر رہے تھے۔ سیمل خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میراں اماں کی شفقت و محبت اور یہ پُرخلوص اصرار...... نوشیرواں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سیمل مجھے کچھ دنوں کے لیے جانا ہے۔ ہوسکتا ہے زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ میں تھوڑا سا آپ کی طرف سے متفکر ہوں اس روز......"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بے اختیار ہی سیمل کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں وزیرستان جا رہا ہوں، جنوبی وزیرستان سے تعلق ہے ہمارا...... میراں اماں نے بتایا ہوگا۔ جنوبی وزیرستان کا سرحدی علاقہ ہے انگور اڈا...... اس کے قریب ہی ایک گاؤں ہے تورہ جاور...... وہاں مجھے گل کے ایک دوست سے ملنا ہے۔ وہ اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اتنا گہرا کہ اپنی بہت ساری باتیں جو وہ کسی سے نہیں کرتا تھا اس سے شیئر کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہے سیمل جیسے میں اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد اس سے دور ہوگیا تھا یا وہ مجھ سے دور تھا۔ ہماری بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔ میں میراں اماں کو لے کر لاہور آگیا تھا اور وہ پشاور چلا گیا تھا اپنے ہاسٹل۔ آٹھ ماہ میں میری اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی تھی اور دونوں بار اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ ان آٹھ ماہ میں وہ کیا کرتا رہا، اس کی سوچ اور فکر میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، میں وہ سب جاننا چاہتا ہوں۔ میں اس کی تلاش کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس کے ان آٹھ ماہ کی دلچسپیوں اور مصروفیات سے باخبر ہوں۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں ہر قیمت پر...... وہ باقی رہ جانے والا میرا واحد خونی رشتہ





ہے۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا اور ہے۔ اس کا دوست جان عالم تورہ جاور میں رہتا ہے۔

"تورہ جاور......" وہ چونکی تھی۔ "لیکن تورہ جاور میں تو کل رات......"

"ہاں مجھے علم ہے۔"

"تو...... تو آپ نہ جائیں......" بے اختیار سیمل کے لبوں سے نکلا تھا۔ "وہاں اتنا خطرہ ہے...... اور......" وہ یکدم پریشان ہوگئی تھی۔ نوشیرواں کی آنکھوں میں یکدم کوندا سا لپکا تھا۔

"تو......" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "ٹی وی پر ایک اور خبر...... اور کچھ دیر پٹی چلتی رہے گی کہ نوشیرواں عادل......"

"نہیں۔" وہ یکدم چیخی اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ارے، ارے آپ...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔" غیر ارادی طور پر اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹا دیے۔ سیمل کے نرم اور گداز ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں تھے اور سیمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"موت تو اپنے وقتِ مقررہ پر ہی آتی ہے سیمل۔ کارگل کی بلندیوں پر جب آس پاس گولیاں گر رہی تھیں اور شہادت کی تمنا نے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی تب وقت نہیں آیا تھا تو موت چھو کر گزر گئی تھی سو اب بھی اگر وقت نہیں آیا تو کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا اور اگر وقت آپہنچا ہے تو یہاں اس جگہ کھڑے کھڑے بھی موت آسکتی ہے۔" سیمل نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے تو نوشیرواں کو احساس ہوا کہ سیمل کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہیں۔

"سوری۔" اس نے سیمل کے ہاتھ چھوڑ دیے اور سیمل کے بہتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"اب آنسو پونچھ لیں پلیز...... ورنہ اماں جان آگئیں تو سمجھیں گی میں نے آپ کو رلایا ہے۔ بہت خفا ہوں گی وہ مجھ سے۔" سیمل نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر پھر دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"چلیں اب اگر میجر نوشیرواں عادل کو موت آبھی گئی تو اتنی خوشی ضرور ہو رہی ہے کہ میراں اماں کے علاوہ بھی کوئی نوشیرواں کی موت پر رونے والا ہے۔" سیمل نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ لمحہ بھر دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔

"ایک بات کہوں سیم؟"

"جی نہیں، جب آپ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو خاموش ہی رہیں اور یہ آپ مجھے سیم کیوں بلاتے ہیں...... سیمل کہا کریں۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"بات تو اچھی ہی تھی۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "لیکن خیر پھر کبھی سہی شاید ابھی اس کا وقت نہیں...... اور رہی یہ بات کہ میں آپ کو سیم کہہ کر کیوں بلاتا ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے اس طرح نام مختصر کر کے بلانا...... بڑا اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے سیمل کہنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت پیارا نام ہے۔" میراں اماں ابھی تک کچن میں ہی تھیں۔ اس نے سوچا اب وہ چلی جائے کہ میراں اماں نے کچن سے آواز دی۔

"شیری بچے، میں سیمل کے لیے میٹھی لسی بنا رہی ہوں تم پیو گے۔"

"جی اماں جان۔" نوشیرواں نے جواب دے کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں جتنے دن وزیرستان رہا یہاں اماں جان کے پاس حیدر کی بہن یا والدہ آجائیں گی، آپ بھی



www.paksociety.com

خیال رکھیے گا ان کا......اور یہ میرا موبائل نمبر بھی لے لیں کبھی کوئی مسئلہ ہو گیا تو مجھے فون کر دیجیے گا۔'' اس نے جیب سے بال پین نکال کر فائل کے گتے پر اپنا نمبر لکھ دیا۔

''تو اماں جان ہمارے پاس رہ جائیں، اماں بھی خوش ہو جائیں گی، کتنے تنہا ہوتے ہیں ہم، حیدر کے گھر سے کسی کو آنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ بھی صحیح ہے میں اماں جان سے پوچھوں گا وہ کیا کہتی ہیں، ان کی مرضی ہوئی تو ٹھیک ہے اور ہاں میں آپ سے اس وقت پوچھنے لگا تھا آپ کس سے ڈر کر بھاگی تھیں اس روز۔'' سیمل نے ایک گہری سانس لے کر نوشیرواں کی طرف دیکھا۔

''ابا سے......وہ میرے ابا تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ میراں اماں کچن کے دروازے پر لسی کے گلاس لیے کھڑی اسے اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ گلاس لے جائے۔

سیمل کچن کی طرف جا رہی تھی اور نوشیرواں حیرت زدہ سا بیٹھا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

حبیب خان نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور پھر نیچے اتر کر پچھلا ڈور کھولا۔

''نیچے اترو۔'' لیکن وہ وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اسے نیچے نہیں اترنا تھا، اسے گھر واپس جانا تھا اماں اور رومی کے پاس۔

''پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں آپ کو اللہ کا واسطہ۔'' اس نے التجا کی۔ ''اماں اور رومی بھائی پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''ہوتے رہیں۔'' انہوں نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور اسے پھر نیچے اترنے کے لیے کہا لیکن وہ یونہی ٹھسی سی بیٹھی رہی۔ تب انہوں نے اسے بازو پکڑ کر کھینچا اور پھر یونہی کھینچتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج کے وسط میں نازو کھڑی تھی۔ سیاہ اور سرخ بارڈر والی شال اوڑھے وہ عجب تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں آ کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ نازو سے مخاطب ہوئے تھے۔

''لے آیا ہوں اسے، اب دھیان رکھنا اس کا اور خبردار یہ نیچے اترنے نہ پائے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔''

''اباجی پلیز میں نہیں رہ سکتی اماں کے بغیر۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''رہ لوگی خود ہی۔'' ان کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔ سمجھنا تمہاری ماں مر گئی ہے اور بھائی بھی۔''

''نہیں......خدا کے لیے ایسا مت کہیں۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''نازو جاؤ اسے اوپر چھوڑ کر آؤ۔ سر میں درد ہونے لگا ہے۔'' نازو نے اس کے قریب آ کر اس کا بازو پکڑا تو اس نے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھی گر کر رونے لگی۔ کمرا وہی تھا اس کا اپنا لیکن خالی خالی اجنبی اور ویران لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی پھر دروازہ کھلا تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ کوئی ملازمہ تھی جو اس کا کالج بیگ لے کر آئی تھی۔ ملازمہ کے ہاتھ سے کالج بیگ لے کر اس نے آنسو پونچھے اور ملازمہ کے جانے کے بعد جلدی جلدی اسے کھولا اور کچھ کتابیں نکال کر باہر رکھیں پھر موبائل نکالا۔ کالج میں موبائل فون لے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن رومی نے کہا تھا وہ اسے سائلنٹ پر رکھے، کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو فون کر لیا کرے ورنہ اسے یوز نہ کرے۔ اس نے موبائل فون بیگ میں سب کتابوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ لڑکیاں اِدھر اُدھر بریک میں پابندی کے باوجود فون کا استعمال کرتی تھیں لیکن



اسے بہت ڈر لگتا تھا کئی دفعہ سوچا تھا کہ وہ فون گھر ہی رکھ جائے۔ اتنا نزدیک تو اس کا گھر تھا۔ اس نے اٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ بند کیا اور رومی کو فون کیا۔

''ارے گڑیا، بیٹا کہاں ہو؟ ابھی خالہ جی کا فون آیا تھا کہ تم ابھی تک کالج سے نہیں آئی ہو۔ میں اب نکلنے ہی لگا تھا کہ تمہارے کالج سے پتا کروں۔''

''بھائی......وہ۔'' اور آنسوؤں نے اس کا حلق سی لیا۔

''کیا ہوا گڑیا...... بیٹا بولو کیا ہوا ہے؟'' رومی بے حد گھبرا گیا۔

''رومی بھائی، بابا مجھے کالج کے باہر سے زبردستی گھر لے آئے ہیں۔'' بہ مشکل بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگی۔

''اوکے......اوکے تم حوصلہ رکھو اور رونا نہیں بالکل، میں آ رہا ہوں۔'' فون بند کر کے اس نے پھر بیگ میں رکھ کر اوپر کتابیں رکھ دی تھیں اور آنسو پونچھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''نیچے آ کر کھانا کھا لو۔'' ملازمہ پھر آئی تھی۔

وہ خاموش رہی۔ اسے ابھی نیچے نہیں جانا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ اسے رومی کا انتظار تھا۔ میس سے یہاں تک آتے بھلا کتنا وقت لگے گا......وہ دل ہی دل میں حساب لگاتی رہی اور جب وہ اپنا کالج بیگ کاندھے پر لٹکائے کمرے سے باہر نکل کر سیڑھی تک آئی تو باہر گیٹ پر بیل ہو رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے رومی کو لاؤنج میں آتے دیکھا۔

''رومی بھائی۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر تھی کہ ڈائننگ روم سے حبیب خان نکل کر لاؤنج میں آئے ان کے پیچھے نازو تھی۔

''تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔'' ابا دہاڑے تو وہ وہاں آخری سیڑھی پر ہی رک گئی۔ رومی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس سے کہا۔

''آؤ گڑیا......'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

''وہیں رک جاؤ، خبردار ایک قدم آگے بڑھایا تو......گڑیا، تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔''

''گڑیا میرے ساتھ ہی جائے گی بہن، اسے

## مجھے محبت کی تلاش ہے

میں تنہا ہوں
میں ادھورا ہوں
پل پل مرتا ہوں
پل پل جیتا ہوں
بس اک تنہائی میرے ساتھ ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے
میں جہاں بھی گیا
میں جدھر بھی گیا
نفرتوں کے کانٹوں میں گھر گیا
تشنہ لب ہوں میں صحرا میں
پھر بھی اک آس ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے
اجنبی منزلیں ہیں
اجنبی مسافتیں ہیں
ہجوم بے کراں ہے
اور میں تنہا ہوں
لیکن وہ نفرت بن کر میرے ساتھ ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے

ایشل شادیان، گولارچی



www.paksociety.com

لینے آیا ہوں، آؤ گڑیا۔'' اس نے گڑیا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن ابا نے اس کا راستہ روک کر اسے دھکا دیا۔

''رومی شرافت سے چلے جاؤ ورنہ میں گارڈ کو بلا لیتا ہوں۔'' کچھ عرصے پہلے ابا نے گھر کی حفاظت کے لیے گارڈز رکھے تھے۔

''میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا، ابا پلیز گڑیا یہاں خوش نہیں رہے گی۔'' رومی نے مصلحتاً اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی تھی۔ ''اماں گڑیا کے بغیر نہیں رہ سکتیں وہ مر جائیں گی۔''

''تو مر جائے میری بلا سے۔''

''ابا جی......''

''جاؤ یہاں سے۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ''نکل جاؤ ورنہ مجھے گارڈ بلانے پڑیں گے اور آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔''

''گڑیا......'' رومی نے ابا کو نظر انداز کر کے سائڈ میں ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا جسے ابا نے بے دردی سے چھڑا لیا۔

''ابا جی میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

''تو ٹھیک ہے، میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا، ابھی اور اسی وقت۔''

''نہیں۔'' گڑیا کے لبوں سے سسکی نکل گئی تھی۔ بے شک وہ الگ رہ رہے تھے لیکن امید تو تھی ایک آسرا تو تھا۔ شاید اماں یہ شاک برداشت نہ کر سکیں۔ وہ ابھی تک پورے طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ رومی کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑا گڑیا کو دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر واپس مڑا۔ جانے سے پہلے اس نے گڑیا کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی لیکن گڑیا کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور جوں ہی رومی لاؤنج سے سر جھکا کر نکلا وہ تڑپ کر اس کی طرف لپکی۔

''پیچھے ہٹو۔'' ابا کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ پر رکھے ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے ابا سے ڈر لگتا تھا۔ ابا اماں کو مارتے تھے ان سے جھگڑا کرتے تھے لیکن انہوں نے بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گڑیا جب سے بڑی ہوئی تھی تو ایک دو بار اماں کو بچاتے ہوئے اسے ایک آدھ ہاتھ لگ گیا تھا لیکن اس طرح ابا نے کبھی اسے نہیں مارا تھا۔ ابا اب نازو کی طرف متوجہ تھے۔

''چوکیدار کو کہلوا دو اور گارڈز سے بھی کہہ دو کہ آئندہ اگر یہ یہاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دیں، اندر مت آنے دیں اور اسے......'' انہوں نے مڑ کر گڑیا کو دیکھا۔ ''باہر مت نکلنے دو...... اور چوکیدار کو بھی بتا دو، ہماری اجازت کے بغیر کسی کو باہر جانے دے نہ اندر آنے دے۔'' نازو نے ایک طنزیہ اور تمسخر بھری نظر اس پر ڈالی تھی اور اٹھلاتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''سن لیا تو نے، جا اب اوپر اپنے کمرے میں جا۔ شاباش......'' گڑیا یکدم بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا نازو کہہ رہی تھی۔

''میں کہتی ہوں ملک صاحب طلاق دے دیتے اسے آپ، ٹنٹا ہی ختم۔''

''بک بک مت کر۔'' ابا کی آواز آئی تھی۔ وہ ابھی تک غصے میں تھے۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی دھاڑیں مار مار کر لیکن اس کے رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیا اب اسے ہمیشہ یہاں رہنا ہوگا اماں اور رومی سے دور۔

''نہیں...... میں یہاں نہیں رہوں گی ہاں۔'' اس نے کمرے میں آ کر کالج بیگ اٹھایا تو فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے فون باہر نکالا، دوسری طرف رومی تھا۔

''چند دن کی بات ہے گڑیا، میں آج ہی اماں



www.paksociety.com



کے ساتھ فیملی کورٹ میں جا رہا ہوں اب میں قانونی طور پر تمہیں لے کر آؤں گا۔ ابا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تم بس حوصلہ رکھنا...... گھبرانا نہیں بیٹا، یہ اماں سے بات کر لو۔'' رومی نے فون اماں کو دیا۔

''اماں......'' اس سے کوئی بات نہیں کی گئی دوسری طرف اماں بھی خاموش تھیں لیکن ان کی سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔

''اماں میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں......'' بہ مشکل اس نے خود کو سنبھال کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی تب رومی نے اسے بہت ساری تسلیاں دینے کی کوشش کی تھی۔

''بہت جلد تم ہمارے پاس ہوگی گڑیا۔'' اور پھر کتنے سارے دن رومی اس کے لیے کوشش کرتا رہا اور یہ سارے دن اس نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ ایک، ایک لمحہ اذیت سے بھرا تھا۔ نازو کا رویّہ، اس کے ساتھ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ کھانے اور ناشتے کی میز پر ابا کے برابر بیٹھی نازو اسے زہر لگتی تھی۔ اسے دکھانے کے لیے وہ بڑی لگاوٹ سے ابا سے باتیں کرتی، ان کی پلیٹ میں خود کھانا ڈالتی۔ ابا کی عدم موجودگی میں گڑیا پر حکم چلاتی۔ اس کے آنے کے دو دن بعد وہ اپنے دو تین جوڑے اس کے پاس لے کر آئی۔

''لو گڑیا بی بی، یہ میرے کپڑے ہیں، میں تو انہیں پہنتی نہیں، تم پہن لینا۔ ویسے بھی خالی ہاتھ آئی ہو، ایک جوڑا کپڑوں کا بھی ساتھ نہیں لائی ہو، تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے پھر رہی ہو۔'' وہ خود کہاں آئی تھی اسے تو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور اس کے لائے ہوئے کپڑے اٹھا کر باہر پھینک دیے اور خود دروازہ بند کر کے بے تحاشا رونے کے بعد اس نے رومی کو بیل دی تو فوراً رومی کا فون آ گیا اور پھر گھنٹے بعد ہی چوکیدار نے اس کے کپڑوں کا بیگ اندر بھجوا دیا تھا۔ ابا اور نازو لاؤنج میں بیٹھے تھے جب ملازمہ بیگ لائی تھی۔

''جی یہ چوکیدار نے بھیجا ہے، کوئی رومی صاحب دے گئے ہیں گڑیا بی بی کے کپڑے اور کتابیں ہیں۔''

''جاؤ اوپر گڑیا کو دے آؤ۔'' ابا ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ملازمہ بیگ اٹھا کر جانے لگی تو نازو نے روکا۔

''ارے رکو دیکھنے تو دو، کیا ہے اس میں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اس میں ایٹم بم ہوگا؟'' ابا کا موڈ خراب تھا نہ جانے کیوں۔ اوپر والی سیڑھی کے پاس کھڑے کھڑے گڑیا نے سنا۔

''کہا تھا تم سے کہ اس کے لیے دو تین جوڑے کپڑے لے آؤ۔ تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے ہوئے ہے۔''

''دیے تو تھے اپنے جوڑے، تمہاری صاحبزادی کو پسند ہی نہیں آئے۔'' وہ بے تکلفی سے ان کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، گڑیا واپس مڑ گئی۔ ملازمہ بیگ اوپر لے آئی تھی۔ رومی بھائی نے اس کا چارجر اور کچھ کتابیں بھی بھجوا دی تھیں۔

یہ دن بہت مشکل تھے لیکن گزر گئے تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے یہاں بلانے کی خواہش ابا سے زیادہ نازو کی تھی۔ وہ اس پر حکم چلا کر جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتی تھی۔ اس کی پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اماں اور رومی بھائی سے دور تھی۔ وہ بہت کم کھاتی تھی، بہت کم سوتی تھی اس کی صحت کافی خراب ہو گئی تھی۔ جس روز فیصلہ اماں کے حق میں ہوا اس روز اسے تیز بخار تھا۔ رومی بھائی لیڈیز پولیس کے ساتھ اسے لینے آئے تھے۔

''جاؤ دفع ہو جاؤ۔'' نازو نے اس کے کمرے میں آ کر کہا۔ ''باہر تیرا بھائی آیا ہوا ہے۔'' وہ تیر کی طرح اٹھی تھی۔

جس روز عدالت میں اس کا بیان ہوا تھا اس نے رومی کو دیکھا تھا۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اماں کو دیکھنے کے لیے اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اماں کہیں نہیں تھیں اور اب کیا سچ مچ وہ یہاں سے جارہی تھی۔ رات ہی رومی نے اسے تسلی دی تھی۔

''انشاء اللہ صبح فیصلہ اماں کے حق میں ہوجائے گا۔ تم تیار رہنا۔'' اس کا سامان تو پہلے ہی بیگ میں تھا۔ اسے کون سا تیاری میں وقت لگنا تھا۔ وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے نیچے آئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ابا شاید اندر اپنے کمرے میں تھے۔ شاید ان سے اپنی سبکی برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ لاؤنج سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا شاید اب وہ کبھی ابا کو نہیں دیکھ سکے گی تو کیوں نہ ابا سے مل لے۔ اس نے لاؤنج سے نکل کر گیسٹ روم کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن نازو نے جو اس کے پیچھے ہی آرہی تھی اسے ٹوکا۔

''اے کدھر جارہی ہو۔''

''ابا سے ملنے۔''

''کوئی ضرورت نہیں، تمہیں اگر اپنے ابا کی چاہ ہوتی تو اماں کے پاس رہنے کے لیے بیان نہ دیتیں۔ دفع ہوجاؤ اور آئندہ اپنی شکل مت دکھانا۔'' اس نے حیرت سے نازو کو دیکھا تھا۔ یہ نازو تھی جو بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی تھی۔ چھوٹی بی بی...... گڑیا بی بی کرتے اس کے ہونٹ سوکھتے تھے۔ مگر اب...... بیزاری سے اسے دیکھتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔ گیٹ کے باہر رومی بھائی کھڑے تھے اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے۔

''رومی بھائی......'' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو جھرنوں کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑے تھے۔ رومی کی آنکھیں بھی نم تھیں لیکن وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکتا رہا پھر اپنے ساتھ آنے والی لیڈیز پولیس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے اماں کو دیکھا وہ لاؤنج میں مضطرب سی بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔

''اماں جی میں گڑیا کو لے آیا ہوں۔'' اماں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اماں کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''اماں جی...... اماں جی۔'' اس کے آنسو ایک بار پھر آنکھوں سے جھرنوں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ اماں کچھ دیر تو ساکت رہیں پھر ہولے ہولے ان کے ہاتھ اس کے گرد حمائل ہوگئے پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اب وہ رو رہی تھیں زار و قطار... اسے لپٹائے اسے چومتے ہوئے۔ کچھ دیر بعد رومی نے انہیں الگ کیا تھا۔

''بس اماں جی اب گڑیا کو کوئی ہم سے دور نہیں کرسکتا۔ ہاں ایک بندہ......'' وہ مسکرایا۔

''کون......؟'' بے حد حیرت سے سیمل نے رومی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے رخسار ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اور پلکیں نم تھیں۔

''تمہارا دولھا۔''

''رومی بھائی آپ......'' ماحول کی اداسی لمحے بھر کو ختم ہوگئی تھی۔ اماں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اماں اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار اس طرح روئی تھیں۔ وہ اس کی کمی کو محسوس کررہی تھیں۔

''اماں انشاء اللہ مکمل طور پر ٹھیک ہوجائیں گی۔'' رومی نے رات میں اسے بتایا تھا۔ ''ڈاکٹر عمر بہت پُرامید ہیں۔''

''آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں رومی بھائی اور اماں بھی۔''

''اور تم بھی تو بہت ویک ہوگئی ہو گڑیا، مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تم ہمت نہ ہار بیٹھو۔''





''شاید میں ہمت ہار بیٹھتی اگر جو ہر رات آپ سے بات نہ ہوتی۔ رومی بھائی، ابا، نازو کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ ان سے لڑتے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ اماں کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اماں کے ساتھ اس کا مقابلہ مت کرو۔ وہ بہت ہوشیار ہے، اس نے جب دیکھا کہ ابا اور اماں کے درمیان اختلاف ہیں تو پتا نہیں کب اور کیسے ابا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا کہ ہمیں پتا نہیں چلا۔ ایسے تعلق زیادہ دیر پا نہیں ہوتے، تم دیکھنا ایک روز ابا ہماری طرف ضرور لوٹیں گے۔''

''کیا ایسا ممکن ہے بھائی؟''

''ہمیشہ اچھی اُمید رکھنی چاہیے گڑیا۔'' اس روز اماں کے سونے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوگیا تھا۔ رومی نے اس کی میڈیکل لیو لے لی تھی۔ ''کل سے تم کالج جاؤ گی۔''

''بہت سے لیکچر مس ہوگئے ہوں گے۔'' وہ پریشان ہوگئی تھی۔

''میں خود تمہیں پڑھا دیا کروں گا یا کسی ٹیوشن سینٹر یا اکیڈمی میں چلی جایا کرو۔''

''نہیں، میں کور کرلوں گی، کچھ جو سمجھ نہ آیا تو آپ سے سمجھ لوں گی۔''

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ رومی کی وہی روٹین تھی۔ وہ اکثر شام یا رات کو اماں اور گڑیا کو باہر گھمانے ضرور لے جاتا تھا اور کبھی اکیلے گڑیا کے ساتھ پھر وہ انارکلی میں بانو بازار کی چاٹ کھا کر اور ملک شیک پی کر اردو بازار کی خاک چھانتے پھرتے۔ حالانکہ اب پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر بھی وہ حامو چاچا سے کتابیں ضرور خریدتے تھے۔ اس کے پاس اب کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہوگیا تھا۔ سیکنڈ ایئر کے پیپرز

## سونا سونا دل ہے میرا

سونا سونا دل ہے میرا
سونا ہے یہ جیون
لگا کر پیت پیا تم
ہم سے ایسے روٹھ گئے ہو
سونا سونا آنکھ کا منظر
سونا سونا جگ سارا
گئے دنوں کے گزرے لمحے
آنکھ سے سب روٹھ گئے ہیں
ہاتھ سے سارے چھوٹ گئے ہیں
تم بن دل ہے سونا سونا
آنکھوں کا سونا درپن ہے
کاش وہ لمحے پھر آجائیں
تیرے دل میں پیار جگائیں
آنکھیں بھی پتھرا گئی ہیں
جانے والے لوٹ کے آجا
جانے والے لوٹ کے آجا
اس داسی کو اپنا کرلو

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

دے کر وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ رومی نے بتایا وہ گھر بدل رہا ہے۔

''آج کل میں میری پوسٹنگ ہونے والی ہے کہیں بھی۔ زیادہ امکان ہے اسکردو یا سیاچن میں۔'' رومی نے اسے بتایا۔ ''اور جانے سے پہلے میں کسی ایسی جگہ پر آپ لوگوں کو چھوڑنا چاہتا ہوں جہاں آپ



www.paksociety.com

یہاں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوں اور ابا کو بھی اس جگہ کا علم نہ ہو۔ یہ گھر ابا کے علم میں ہے سو ہوسکتا ہے میری عدم موجودگی میں کسی روز وہ آکر تنگ کریں اماں کو اور تمہیں۔" رومی نے گھر بدلنے کی وضاحت کی تھی۔

ابا اس ایک سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے حالانکہ کورٹ نے آرڈر دیا تھا کہ مہینے میں ایک بار اسے والد سے ملنے دیا جائے لیکن ابا نے پھر خبر ہی نہیں لی تھی۔

"ہوسکتا ہے وہ یہاں نہ آئیں لیکن احتیاط ضروری ہے۔" اور پھر وہ سمن آباد آگئے۔ یہ گھر اندر گلی میں تھا اور بہت سیف تھا۔ پرانے انداز کا گھر، صحن، برآمدہ، دو کمرے ایک ڈرائنگ روم جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور ایک اندر صحن میں۔ آس پاس سب لوگ اچھے تھے ہمدرد اور مخلص۔ آس پاس کے کئی گھروں سے ان کے تعلقات ہوگئے تھے۔ سب ہی محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ ان کے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں حمنہ کا گھر تھا۔ حمنہ سے اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے بھی ایف اے کا امتحان دے رکھا تھا اور اب رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک رومی کی پوسٹنگ کے آرڈرز نہیں آئے تھے۔ رومی نے ڈاکٹر عمر کے مشورے پر اماں کا ڈاکٹر تبدیل کردیا تھا۔ ڈاکٹر عرفان کا کلینک سمن آباد میں ہی تھا اور رومی چاہتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں گڑیا کے لیے اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا مشکل نہ ہو۔ ان دنوں وہ گڑیا کو ہر بات سمجھا رہا تھا۔ بینک کے معاملات اور دوسری باتیں۔ وہ پہلے روز جب رومی کے ساتھ بینک گئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"تم خالہ بی کے ساتھ یہاں آکر چیک کیش کروالینا۔" جس روز اس کا ایڈمیشن بی اے میں ہوا اس روز اس کے سیاچن پوسٹنگ کے آرڈرز آگئے تھے۔ اماں کی حالت کے متعلق کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر عرفان بھی ڈاکٹر عمر کی طرح پُرامید تھے لیکن کبھی کبھی وہ اردگرد سے بالکل بے خبر ہوجاتی تھیں۔ جیسے پورے ماحول سے کٹ کر کہیں اور کسی اور ماحول میں ہوں پھر ایک روز رومی کو جانا پڑا، وہ پوری رات چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ صبح اس کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر رومی پریشان ہوگیا تھا۔

"گڑیا تمہیں خود کو بہادر بنانا ہے، تمہیں اماں کا بھی خیال رکھنا ہے اور اپنا بھی۔ میں جب واپس آؤں گا تو تمہاری شاندار کامیابی سیلیبریٹ کریں گے۔ زبردست قسم کا ڈنر ہوگا۔" وہ اس کا دل بہلا رہا تھا وہ جانتی تھی۔

"میری خواہش تھی کہ تم بی ایس سی کرتیں یا پھر کسی پروفیشنل لائن میں جاتیں لیکن تم نے بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔"

"ہاں، میں پہلے اردو میں اور پھر انگلش لٹریچر میں ایم اے کروں گی۔" کہانیوں کی رسیا گڑیا نے بتایا تو وہ مسکرادیا۔ "اور پھر حمنہ بھی تو بی اے کررہی ہے۔"

"اور یہ اصل وجہ ہے تمہارے بی اے میں ایڈمیشن لینے کی۔" اس نے قہقہہ لگایا وہ جھینپ گئی تھی پھر وہ چلا گیا لیکن اس کا رابطہ گڑیا سے مسلسل رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کا کوئی خط بھی آجاتا تھا جو کبھی کراچی سے کبھی راول پنڈی سے کبھی کہیں اور سے پوسٹ کیا جاتا تھا۔ وہ اسکردو سے آنے والے کسی نہ کسی بندے کو دے دیتا تھا۔ کچھ ماہ بعد وہ سیاچن سے واپس آیا تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے بہت باتیں تھیں۔ وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ اسے صحن میں بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"یہ گھر مجھے اس لیے اچھا لگتا ہے کہ یہاں سے





آسمان نظر آتا ہے۔ بالکل گاؤں والے گھر کی طرح۔ میں جب ریٹائر ہوجاؤں گا تو پھر ہم تینوں گاؤں جاکر حویلی میں رہیں گے۔ کھلی فضاؤں میں رات کو آسمان چمکتے ستاروں تلے۔" اس نے گڑیا کو سیاچن کے متعلق بتایا تھا۔ گڑیا بہت حیرت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی تھی۔

"پتا ہے گڑیا سیاچن دنیا کا بلند ترین جنگی مقام ہے۔ وہاں جراٹ آرمی میس میں اکثر یہ باتیں ہوتی ہیں کہ ہم اگر کارگل کی کچھ چوکیوں پر قبضہ کرلیں تو ہم کشمیر کی طرف عالمی دنیا کی توجہ مبذول کرواسکتے ہیں۔ وہاں میس میں بہت جوش وخروش پایا جاتا ہے۔ لوگ شہادت پانے کی تمنا کرتے ہیں۔ میرے دل میں کبھی کبھی یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اللہ مجھے بھی شہادت کا اعزاز دے لیکن پھر مجھے تمہارا اور اماں کا خیال آجاتا ہے، تم لوگ میرے بعد بالکل اکیلے ہوجاؤ گے۔ کبھی تمہاری محبت کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور کبھی جذبۂ شہادت ہر جذبے سے بڑھ جاتا ہے۔" ان دنوں وہ خاصا سنجیدہ سا لگتا تھا اور اماں کے متعلق بہت متفکر۔

"میں سوچ رہا ہوں کسی اور ڈاکٹر سے بھی اماں کے لیے رائے لے لوں۔ اماں کی امپروومنٹ کی رفتار بہت سست ہے۔" یہ اکتوبر کا مہینہ تھا اور ہلکی خنکی شروع ہوگئی تھی۔ وہ رات کو کافی پینے چلے جاتے تھے۔

رومی نے اماں کو دو تین اور ڈاکٹرز کو بھی دکھایا۔ ایک ماہ رہنے کے بعد وہ پھر واپس اسکردو چلا گیا تھا پھر اچانک وہ جنوری 1999ء میں واپس آگیا تھا صرف دو ہفتے کے لیے۔ اس دوران وہ خاصا مصروف رہا تھا۔ اس نے گڑیا کے اکاؤنٹ میں اپنی ساری رقم منتقل کروائی تھی۔

"تمہیں مالی پریشانی کبھی نہیں ہوگی گڑیا۔ خدانخواستہ مجھے کچھ ہوگیا تو......" جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ گڑیا رونے لگی تھی۔

"میں ایک اچھا گھر خریدنا چاہتا ہوں۔ کرائے کے گھر کا کیا اعتبار جب جی چاہے مالک خالی کروادے۔" پھر اس نے اقبال ٹاؤن میں ایک گھر خرید لیا جو گڑیا کے نام تھا۔

"وہاں جو کرائے دار رہ رہے ہیں، میں نے انہیں گھر خالی کرنے کو نہیں کہا۔ وہ بدستور رہتے رہیں گے اور کرایہ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ وکیل صاحب کو میں نے تمہارے اور اماں کے معاملات کا نگراں بنادیا ہے۔ یہ جگہ سیف ہے، لوگ اچھے ہیں اس لیے تمہیں یہاں ہی رہنا ہے جب تک کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگر کوئی مسئلہ ہوجائے تو وکیل صاحب کو بتادینا۔ دو ماہ کے نوٹس پر وہ گھر خالی کرالیں گے۔" وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"آپ ایسی باتیں مت کریں۔"

"یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں گڑیا اور تمہیں خود کو ان حقائق کا سامنا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ میں جانتا ہوں ابھی تم بہت چھوٹی ہو...... ابھی تم کہانیوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ تمہیں نیلی کا دکھ رُلاتا ہے، تم روزلی کے لیے آنسو بہاتی ہو، تمہیں ایک مکان دو دیواریں کے امجد کا دکھ راتوں کو جگا دیتا ہے لیکن بیٹا زندگی کی کہانی میں ایسے کئی دکھ کبھی کبھی ہمیں بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔"

لیکن اسے خود کو کسی اور دکھ کے لیے تیار نہیں کرنا تھا۔ کیا یہ دکھ کم تھا کہ اس کے ابا اور اماں کے درمیان علیحدگی تھی اور ابا نے ایک کمتر عورت کو اماں پر ترجیح دی تھی اور اماں ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھیں۔

"وہ بہت کم حوصلہ ہیں، بہت کمزور دل ہیں۔ میرے اللہ مزید اور کوئی دکھ نہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں لیکن آنسو تھے کہ امڈے چلے آتے تھے۔ رومی



www.paksociety.com

نے خود اس کے آنسو پونچھے تھے۔

''آپ آرمی چھوڑ دیں۔'' اس نے ضد کی۔

''سوچوں گا گڑیا۔'' اس نے اسے ٹالا تھا۔

''ابھی تو مجھے جانا ہے۔'' اس روز اماں بھی رات گئے تک ان کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ ہیٹر جلا کر اس نے اماں کے قریب رکھ دیا تھا اور خود اپنے ہاتھوں سے مونگ پھلی اور چلغوزے چھیل چھیل کر کبھی اماں اور کبھی گڑیا کو دیتا رہا۔

اماں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار رومی کی طرف دیکھتی تھیں۔ ایک بار جب رومی نے چلغوزے چھیل کر ان کی طرف بڑھائے تو انہوں نے رومی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور بہت دیر تک وہ رومی کا ہاتھ یونہی تھامے رہیں۔ شاید یہ ماں کا دل تھا ورنہ دوا کے زیر اثر وہ اس وقت سو چکی ہوتی تھیں۔ صبح رومی کی واپسی تھی پھر ہولے ہولے اماں کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس نے اماں کا ہاتھ تھام کر اٹھایا اور بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا۔ اماں لیٹ تو گئی تھیں لیکن گڑیا نے دیکھا تھا وہ بار بار بند ہوتی آنکھیں کھول کر رومی کو دیکھتی تھیں۔ کوئی اندرونی احساس تھا جو انہیں سونے نہیں دے رہا تھا لیکن پھر وہ سو گئیں۔ اماں کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر نائٹ بلب جلا کر وہ باہر نکلا......

خالہ جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔

''خالہ جی آپ ذرا اماں کے کمرے میں لیٹ جائیں، ہم ابھی آتے ہیں اور دروازہ ہم باہر سے بند کر جائیں گے۔ آپ آرام سے سو جانا۔'' اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ گڑیا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''اس وقت کہاں جانا ہے؟''

''باہر روڈ پر چہل قدمی کریں گے، تم کوٹ پہن لو اور شال لے لو۔'' لاہور میں بھی جنوری کی اس رات کو کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سمن آباد کی اندرونی گلیوں سے نکل کر باہر روڈ پر آ گئے تھے۔ گلیوں میں ویرانی تھی۔ اکا دکا لڑکے اپنی اپنی بائیک پر بیٹھے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن روڈ پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

''ڈاکٹر عرفان کے کلینک کی طرف ایک کافی ہاؤس ہے جو تقریباً ایک بجے تک کھلا رہتا ہے وہاں چل کر کافی پیتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ باہر کھلی فضا میں گھوموں اور ان خنک ہواؤں کو اپنے اندر اتار لوں۔'' گڑیا بے حد اداس تھی صبح وہ جا رہا تھا اور پھر پتا نہیں کب آئے گا۔

''اندازاً چھ ماہ تک چکر لگاؤں گا۔'' رومی نے اسے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے میری پوسٹنگ اسکردو کے بعد راول پنڈی میں ہو پھر میں تمہیں اور اماں کو ساتھ ہی لے جاؤں گا۔''

''اور آپ کی شادی بھی کرنی ہے ہمیں۔''

''ہیں، یہ اچانک میری شادی کا خیال کیسے آ گیا تمہیں؟''

''وہ حمنہ کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں ...... بلکہ مجھے آپ کی شادی کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔ اماں کی طبیعت تو ٹھیک نہیں اور یہ کام مجھے ہی کرنا ہے۔ آپ جب اسکردو سے آ جائیں گے تو میں اور حمنہ مل کر آپ کے لیے لڑکی تلاش کریں گے۔ پتا ہے میں نے کالج کی ساری خوب صورت لڑکیوں کی فہرست بنا لی ہے اور وہ حمنہ بدتمیز کہہ رہی تھی کہ میں اس کا نام بھی فہرست میں شامل کر لوں کیونکہ اس کے خیال میں وہ بھی خاصی خوب صورت ہے۔''

''ہاں تو کر لو...... پھر ایک سوئمبر رچانا۔'' رومی کا موڈ ایک دم ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ ''لیکن ایک بات ہے۔ اپنی شادی سے پہلے مجھے تمہارے لیے ایک عدد دولھا تلاش کرنا ہوگا۔''

''جی نہیں، آپ مجھ سے پورے گیارہ سال





بڑے ہیں۔'' وہ یونہی باتیں کرتے کرتے کافی شاپ تک آئے تھے۔ کافی شاپ پر رش نہیں تھا صرف چند لڑکے کھڑے تھے اور اندر بینچوں پر ایک فیملی بیٹھی تھی بچوں سمیت...... شاید وہ بھی ان کی طرح کے کوئی سر پھرے تھے۔ وہ کافی پی کر واپس لوٹے تو ان کے چہرے خنک ہوا سے ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے رومی نے آہستگی سے کہا تھا۔

''گڑیا، آج میں نے ابا کو فون کیا تھا۔''

''پھر؟'' گڑیا کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

''میرا جی چاہ رہا تھا ان سے بات کرنے کو لیکن انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں سیاچن میں ہوں اور وہاں دشمن کی جو سرگوشیاں ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب کوئی نیا محاذ کھلنے والا ہے۔ گڑیا میں ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا اپنی گستاخی کی اگرچہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن پھر بھی وہ باپ ہیں اور میں نے سوچا ان سے معافی مانگ لوں اور ان کی آواز سن لوں۔'' گڑیا دم بخود سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بے حد شاندار نظر آنے والے ابا آ گئے تھے۔

''پھر؟'' گڑیا نے پوچھا، رومی نے ایک گہری سانس لی۔

''انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا وہ کسی رومی کو نہیں جانتے اور فون بند کر دیا۔'' گڑیا بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں آئے تھے۔ اماں اور خالہ جی سو رہی تھیں لیکن گڑیا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ خالہ جی کارپٹ پر میٹرس بچھائے سو رہی تھیں۔ گڑیا بیڈ پر لیٹ گئی...... کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر رومی کے کمرے میں جائے اور دیکھے کہ اگر وہ سو نہیں رہا تو اس سے باتیں کرے لیکن پھر یہ سوچ کر چپکی لیٹی رہی کہ صبح اس نے واپس جانا ہے۔ خوامخواہ ڈسٹرب نہ کروں پھر پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب خالہ جی نے صبح اسے جگایا تو رومی جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ باہر ڈرائیور جیپ کے ساتھ موجود تھا۔

''خالہ جی آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگایا۔'' وہ ناراض ہوئی۔

''میں نے منع کیا تھا، رات دیر سے سوئی تھیں نا تم۔'' رومی نے کہا تو وہ چپ کر گئی۔ اماں سے مل کر وہ اس کی طرف آیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ جب بھی کہیں جاتا تھا چاہے ایک دن کے لیے کیوں نہ جانا ہوتا تو وہ رو پڑتی تھی جب وہ کاکول میں تھا تب سے لیکن اب وہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھی۔

''گڑیا......'' اس کے پاس رک کر اس نے آہستگی سے کہا۔ ''ایک بات جو میں جب سے یہاں آیا ہوں تمہیں بتانا چاہتا ہوں اور بتانے کی ہمت نہیں پا رہا...... وہ یہ ہے کہ ایک آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے۔ گڑیا جب میں جاؤں گا تو ہو سکتا ہے میں بھی اس آپریشن کے لیے جانے والوں میں شامل ہوں...... جنگ میں کچھ پتا نہیں ہوتا گڑیا کہ کون غازی بنے گا اور کس کی قسمت میں شہادت لکھی جائے گی۔ ایسا کچھ ہوا گڑیا تو تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ اماں کا خیال رکھنا ہے اور اگر کبھی ابا تمہیں اور اماں کو لینے آئیں تو تم چلی جانا ان کے ساتھ...... عورت کو ہمیشہ مرد کے سائبان کی ضرورت ہوتی ہے گڑیا اور انہیں معاف کر دینا۔ وہ جیسے بھی ہیں ہمارے ابا ہیں اور اماں کے شوہر ہیں لیکن اگر وہ نہ لینے آئیں تو تم نے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے۔'' وہ بھلا اماں کا اکیلے خیال کیسے رکھ سکے گی۔ اس نے سوچا تھا لیکن تب وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اکیلے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے اور آج کے بعد وہ کبھی رومی کو نہیں دیکھ سکے گی اور کبھی اس کی باتیں نہیں سن سکے گی یہ آخری بار تھی جب وہ



www.paksociety.com

اسے دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ چپ ہوا تو گڑیا کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگی تھی۔ رومی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور پھر تیزی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ پھر بہت دن بیت گئے۔۔۔ رومی کا کبھی کبھی فون آجاتا۔ اس نے بتایا تھا کہ انہوں نے برف پوش چوٹیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔

پھر کئی دن گزر گئے رومی کا فون نہیں آیا۔ وہ ہر لمحہ اس کی سلامتی اور بحفاظت واپسی کی دعائیں مانگتی رہی۔ یہ مئی کی 26 تاریخ تھی جب رومی نے آخری بار اس سے بات کی تھی۔ وہ بہت پُرجوش تھا۔ اس نے کیپٹن حسام کے متعلق بتایا تھا۔ وہ کیپٹن شیر کے متعلق بھی بات کرتا رہا تھا اور پھر اس کے بعد گڑیا کی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ سولہ جون تھی جب وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اماں اس کے پاس ہی بیٹھی خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

''اتنے دن ہو گئے ہیں اماں رومی بھائی کا فون نہیں آیا۔ آپ دعا کریں نا...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' سامنے ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔

''آج کارگل کے محاذ پر کیپٹن احسن اور کیپٹن مروان حبیب خان دشمن کی گولہ باری سے شہید ہو گئے تاہم وہ دشمن کو ایک پوسٹ پر جارحیت سے روکنے اور بھگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کیپٹن احسن آرٹلری اور کیپٹن مروان حبیب پنجاب رجمنٹ یونٹ نمبر......'' نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا اور وہ سکتے کے عالم میں ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

نوشیرواں کو گئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے صرف دو تین بار ہی رابطہ کیا تھا۔ میراں اماں اس کے لیے پریشان تھیں گو وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں لیکن یسمل جانتی تھی کہ وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خود اس نے بھی کتنی بار دعا کی تھی۔

''یا اللہ میراں اماں کو مزید کوئی دکھ نہ دینا۔ ان کا سینہ تو پہلے ہی چھلنی ہے۔ اللہ جی نوشیرواں کو کچھ نہ ہو۔'' وہ اخبار پڑھتی تو دہل جاتی۔

میراں اماں کی نظریں اس پر ہوتیں۔

''اُدھر کی کوئی خبر بچہ؟''

''نہیں اماں جان کوئی خبر نہیں ہے سب ٹھیک ہے۔'' وہ ان سے نظریں چرا لیتی۔ حالانکہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ نوشیرواں کے جانے کے بعد وہ میراں اماں کو گھر میں لے آئی تھی۔ اماں خوش تھیں تو فضیلت بھی خوش تھی۔ اسے سب کام کرنے والیوں کی طرح باتوں کا چسکا تھا، وہ کام کرتے ہوئے میراں اماں سے دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہتی اور خود یسمل کو لگتا تھا جیسے سالوں بعد گھر میں زندگی لوٹ آئی ہو۔ میراں اماں کے آنے سے جیسے گھر میں ایک دم برکت اور رونق آگئی تھی۔ کبھی کبھی نوشیرواں کے پرانے بیٹ مین حیدر کی بیوی آجاتی تو میراں اماں اسے لے کر گھر جاتیں اور گھر کی صفائی وغیرہ کروا کے واپس آجاتیں۔

''اچانک نوشیرواں آجائے تو گھر مٹی سے اٹا پڑا ہو، وہ ناراض ہو گا۔'' وہ حیدر کی بیوی کو تاکید کرتی تھیں کہ تین چار روز بعد وہ ضرور چکر لگایا کرے۔

''اماں جان آپ کا لہجہ اتنا صاف ہے جیسے ہمارا لہجہ... حالانکہ قبائلی اس لہجے میں بات نہیں کرتے۔ آپ کے لہجے سے تو بالکل پتا نہیں لگتا کہ آپ کا تعلق قبائلی علاقے سے ہے۔'' ایک روز اس نے پوچھا تھا۔

''اس لیے بچہ کہ میری ماں پنجابی تھیں، میرے والد آرمی میں میجر تھے اور میری والدہ ان کے جی سی او کی بیٹی تھیں۔ شیری کی دادی بھی پنجابی تھیں۔ میری والدہ نے ہی یہ شادی کروائی تھی، ان کی کزن تھیں وہ۔ ہمارے خاندان کے سب مرد آرمی میں رہے

شیری کے پڑنانا پاکستان بننے سے پہلے برٹش آرمی میں صوبیدار تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو فوج میں ہی بھیجا۔ شیری کے نانا آرمی میں کرنل تھے۔ میں ایک فوجی کی بیوی اور ایک فوجی کی بیٹی ہوں۔ میرے دونوں بیٹے بھی آرمی میں ہی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علاقے میں بہت کم گئے۔ میرا بچپن لڑکپن اور پھر شادی کے بعد زندگی بھی زیادہ تر پنجاب سندھ وغیرہ میں گزری۔ پاکستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں پوسٹنگ رہی۔ گل کا چچا اور میرا چھوٹا بیٹا 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر شہید ہوگیا تھا۔" وہ فخریہ انداز میں بتارہی تھیں۔

"گل کے ابا نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ اسے گردوں کا کچھ مسئلہ ہوگیا تھا۔ تب ہم اپنے علاقے میں کئی سالوں بعد گئے تھے۔ میری دونوں بیٹیاں وہاں تھیں۔ شیری تو زیادہ تر ہمارے پاس ہی رہا۔ تعلیم حاصل کی پھر کمیشن مل گیا۔" میراں اماں نے اسے تفصیل بتائی تھی لیکن وہ تو میراں اماں کے روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جارہی تھی کہ وہ میراں اماں سے پوچھے جب انہیں اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی تھی تو انہوں نے کیا سوچا تھا۔ کیا انہیں فخر محسوس ہوا تھا یا ان کا دل چھلنی ہوگیا تھا۔ وہ روئی تھیں یا انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ ایک شہید کی ماں ہیں۔ وہ تو مہینوں روتی رہی تھی تڑپ تڑپ کر مچل مچل کر...... خالہ جی اور حمنہ اسے بہ مشکل سنبھالتی تھیں۔ اماں بس ایک جگہ بیٹھی ٹکر ٹکر اسے روتے دیکھتی تھیں اور پھر دیوانہ وار اٹھ کر پورے گھر میں چکراتیں۔ ہر کمرے میں ان کی آنکھیں کسی کو کھوجتی تھیں اور پھر مایوس سی ہو کر وہ تخت پر بیٹھ جاتیں اور سیمل کو روتے مچلتے دیکھتی تھیں خاموش اور چپ......

وہ کوئی بلند حوصلہ لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو بہت کمزور عام اور معمولی لڑکی تھی اور اس کا دل بھی اتنا چھوٹا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مروان کی شہادت پر فخر محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے اس فخر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے مروان کی ضرورت تھی۔ مروان جو اس کا بھائی تھا۔ اس سے پورے گیارہ برس بڑا لیکن جب اس نے سیمل کو دوست بنایا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"گڑیا رومی تمہارا بڑا بھائی ہے اور مروان تمہارا دوست۔" اور جب سے ان کے درمیان دوستی کا رشتہ بنا تھا وہ اسے جب کبھی اپنی کوئی بات شیئر کرنا ہوتی مروان کہہ کر بلاتی...... ورنہ عام دنوں میں وہ اس کا رومی بھائی تھا۔ وہ بھائی بھی تھا اور دوست بھی تھا۔ حمنہ سے پہلے واحد دوست تھا وہ اس کی شہادت پر فخر نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کے بچھڑ جانے پر بلکتی تھی۔ اللہ سے شکوہ کرتی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ کارگل کی جنگ میں شہید ہونے والوں میں مروان بھی شامل ہوتا۔ اتنے سارے لوگوں نے جانیں دی تھیں ایک مروان نہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا...... وہ ان کا واحد سہارا تھا اور پھر کسی بھی جنگ سے حاصل حصول تو کچھ ہوتا نہیں بس بہت سارے گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ شاید وہ سب ان کی شہادت پر فخر کرتے ہوں لیکن وہ نہیں کرسکتی تھی۔ کبھی نہیں...... وہ میراں اماں کے پاس سے اٹھ کر باہر آگئی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور مروان سے باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے ڈائری میں مروان کو مخاطب کر کے روز کی روداد لکھتی تھی۔ کتنے سال ہوگئے تھے اسے ایسا کرتے ہوئے۔ کتنی ڈائریاں بھری پڑی تھیں جب وہ لکھتی تو اسے لگتا جیسے وہ سچ مچ مروان سے باتیں کررہی ہو۔ اگر وہ یوں مروان سے ہر روز باتیں نہ کرتی تو شاید غم سے اس کا دل پھٹ جاتا۔ کتنے سال ہوگئے تھے مروان کو بچھڑے...... وہ سولہ جون 1999ء کا نو بجے والا خبرنامہ تھا جب اس نے وہ خبر


www.paksociety.com

سنی تھی اور پھر 17 جون کو اس کا جسدِ خاکی لاہور لایا گیا تھا۔ اسے حمنہ نے بتایا تھا جب وہ پاگلوں کی طرح ہر اس نمبر پر فون کر رہی تھی جو مروان نے اسے دیے تھے تب حمنہ روتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''سیمل ...... سیمل، بھائی کہہ رہا ہے کہ مروان بھائی اور کیپٹن احسن کے تابوت اسکردو سے آ گئے ہیں ابھی ابھی ٹی وی پر دکھایا ہے اور وہ انہیں ملک ہاؤس میں لے گئے ہیں۔ تمہارے ابا کے گھر۔'' حمنہ اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ وہ مروان کو وہاں کیوں لے گئے تھے۔ کیا مروان نے وہاں کا ایڈریس لکھوایا ہوا تھا کہ...... وہ بہت سمجھدار تھا۔ جانتا تھا ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے یا پھر مروان کی کوئی اور مصلحت تھی لیکن مروان کے تابوت کو ابا نے وصول کیا تھا۔ اس کا جنازہ وہاں سے اٹھا تھا اس گھر سے جسے وہ خود چھوڑ آیا تھا۔ وہ خالہ جی، حمنہ، اماں اور محلے کی بہت ساری دوسری عورتوں کے ساتھ ملک ہاؤس گئی کتنے سالوں بعد...... وہ وہاں ملک ہاؤس میں لونگ روم سے ملحقہ بڑے ہال میں مروان کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے شیشے میں سے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے اماں کو ٹکر ٹکر تابوت کو دیکھتے دیکھا تھا۔ اس نے ابا کو دو تین بار اندر آتے اور تابوت پر جھک کر مروان کا چہرہ دیکھتے دیکھا تھا۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔ وہ یونہی اماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے حمنہ کے کندھے پر سر رکھے لکڑی کے تابوت کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے انہیں دیکھا تھا مروان کو لے جاتے پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کر دیا گیا۔ وہ جن عورتوں کے ساتھ وہاں گئی تھی انہی کے ساتھ واپس آ گئی۔ وہاں کیا تھا جو رکتی۔

''تم اِدھر رکو گی؟'' حمنہ نے پوچھا لیکن وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ابا پتا نہیں کہاں تھے۔ شاید باہر لان میں جہاں شامیانے لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ سمن آباد سے پاس پڑوس کے سب ہی مرد جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اندرونی گیٹ سے نکل رہی تھی جب نازو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں خاصی موٹی ہو گئی تھی۔

''سنو اب تمہارا بھائی مر گیا ہے تو کہیں اس پاگل عورت کو ساتھ لے کر ادھر نہ آ جانا۔ دھکے مار کر نکلوا دوں گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا باپ اپنی بے عزتی بھول گیا ہے کہ تم نے عدالت میں کہا تھا تم باپ کے ساتھ نہیں ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یہ تو میں ہوں جس نے اسے روکا ہوا ہے ورنہ اب تک وہ تمہیں قتل کر چکا ہوتا۔'' حمنہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''ہاتھ پیچھے کرو۔'' اور پھر یہ حمنہ ہی تھی جو اسے، خالہ جی اور اماں کو گھر لے کر آئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کتنے سارے دن آس پاس کی عورتیں ان کی دلجوئی کے لیے آتی رہیں کتنے ہی دن آس پاس کے گھروں سے کھانا پک کر آتا رہا۔ پھر خالہ جی نے منع کر دیا۔ مروان صحیح کہتا تھا کہ یہ سب اچھے اور ہمدرد لوگ ہیں۔ حمنہ تو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی لیکن وہ تو جیسے خود سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ دن میں کئی کئی بار وہ مروان کے نمبر پر فون کرتی اور جواب نہ ملنے پر اس کے فون کے انتظار میں بیٹھ جاتی۔

اماں ایک بار پھر پہلی پوزیشن میں چلی گئی تھیں۔ خاموش سپاٹ نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہتیں۔ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ تھیں اور ماحول اور منظر میں گم...... حمنہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اماں کا خیال رکھنا بھی





چھوڑ دیا تھا بس خالہ جی تھیں جو اماں کا بھی اور اس کا بھی خیال رکھ رہی تھیں۔ اماں کو دوائی دینا، ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا سارے کام خالہ جی کے تھے تب ایک روز اماں کی سانس اکھڑنے لگی۔ انہیں دمے کی تکلیف ہو گئی تھی۔ خالہ جی ڈاکٹر عرفان کو لے کر آ گئی تھیں۔ ڈاکٹر عرفان نے اماں کا چیک اپ کر کے دوائی دی تھی اور اسے جھڑکا تھا۔

''آپ بالکل بھی اپنی اماں کا خیال نہیں رکھ رہی ہیں سیمل بی بی...... جتنی امپروومنٹ ان کے کیس میں ہوئی تھی وہ سب ختم ہو گئی ہے وہ پھر زیرو پر آ گئی ہیں۔ ایسا رہا تو آپ اپنی اماں کو بھی کھو دیں گی۔ اکثر ایسے مریضوں کا رجحان خودکشی کی طرف ہو جاتا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ ساری جان سے کانپ گئی تھی۔ وہ اماں کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ مروان کیا کہے گا اس نے اماں کا خیال نہیں رکھا۔ وہ ناراض ہو گا۔ اس نے سوچا اور اماں کا اور زیادہ خیال رکھنے لگی۔ ان کی کنگھی کرنا، انہیں وقت پر دوائیں دینا...... کپڑے تبدیل کرنا...... ان کے کھانے کا خیال رکھنا سارے کام اس نے ایک بار پھر اپنے ذمے لے لیے تھے۔ تب پہلی بار اس نے ڈائری میں لکھا۔

''سوری مروان ناراض مت ہونا، میں اب اماں کا بہت خیال رکھوں گی۔'' اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ حمنہ نے بی اے کر لیا تھا اور اس کے ابو نے اسے مزید پڑھنے سے منع کر دیا تھا لیکن وہ بی اے نہیں کر سکی تھی۔ حمنہ اسے اکساتی رہتی تھی۔

''پرائیوٹ بی اے کر لو سیمی، پڑھائی زندگی میں بہت کام آتی ہے۔'' تب حمنہ کے بے حد اصرار پر پورے پانچ سال بعد اس نے بی اے کیا تھا پرائیوٹ کیا تھا اور اس کا اے گریڈ آ گیا تھا اور انہی دنوں خالہ جی چلی گئی تھیں۔ وہ بیٹے سے ملنے گئی تھیں ہمیشہ کی طرح۔ سال میں ایک بار وہ ضرور جاتی تھیں ملنے اور

دو دن بعد واپس آ جاتی تھیں لیکن اس بار واپس آئیں تو دوبارہ جانے کے لیے۔ وہ بہت رو رہی تھیں۔

''میرا بیٹا بہت بیمار ہے اور میں اسے بیمار چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اس بار وہ کہہ رہا تھا مجھے معاف کر دو اور میرے پاس آ جاؤ۔'' سیمل انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ چلی گئیں تو حمنہ نے فضیلت کو لگوا دیا۔

''ایماندار ہے اور محنتی بھی، اس کی ماں زمانوں سے ہمارے گھر کام کرتی ہے۔'' شروع میں فضیلت کام کر کے چلی جاتی تھی۔ پھر حمنہ نے یونیورسٹی میں داخلے کا پروگرام بنا لیا۔

''تم بھی میرے ساتھ ایڈمیشن لے لو تو ابو مجھے آسانی سے اجازت دے دیں گے۔'' حمنہ سے بڑی دو بہنیں تھیں ابھی ایک کی منگنی ہوئی تھی۔ دوسری کے لیے اچھے رشتے کا انتظار تھا۔

''اب کیا میں اپنی شادی کے انتظار میں فارغ بیٹھی رہوں۔ اتنے سال تو ہو گئے فارغ بیٹھے۔'' حمنہ نے اپنی اماں کو قائل کر لیا تو اس کے ابو بھی راضی ہو گئے اور حمنہ اپنے ساتھ سیمل کو بھی گھسیٹ لے گئی تھی۔

''مروان چاہتا تھا کہ تم بہت پُراعتماد بنو تو اس لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے باہر نکلو۔'' حمنہ نے ہی فضیلت کو اس کے یونیورسٹی سے واپس آنے تک گھر رہنے پر راضی کر لیا تھا۔ سیمل اسے اچھی تنخواہ دیتی تھی۔ فضیلت نے انکار نہیں کیا تھا اور اب تو دونوں فائنل ایئر میں تھیں۔

اتنے سال بیت گئے تھے ابا نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ تین سال پہلے جب وہ حمنہ اور اس کے بھائی کے ساتھ قبرستان گئی تھی تو اس نے قبرستان سے نکلتے ہوئے ابا کی جھلک دیکھی تھی، اسے لگا تھا کہ جیسے ابا نے اسے آواز دی ہو۔ وہ بھاگ کر روڈ پر آئی



www.paksociety.com

تھی اور پھر اسی لمحے روڈ پر ایک رکشا آ کر رکا تو وہ حمنہ اور اس کے بھائی کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گئی تھی اور جب رکشا روانہ ہوا تو اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ ابا اسے لے جاتے اسے قتل کر دیتے تو اماں کا کیا ہوتا...... اماں کی خاطر اسے زندہ رہنا ہے اور ابا سے بچنا ہے۔ اس نے سوچا۔

رات وہ بہت دیر سے سوئی تھی اس لیے صبح نماز پڑھ کر ایک بار پھر سوگئی تھی۔ میراں اماں نے اسے اٹھایا نہیں تھا۔ فضیلت نے اماں اور میراں اماں کا ناشتا بنا دیا تھا اسے اٹھانا چاہا تو منع کر دیا۔

''نہ پوری رات جاگ کے گزاری ہے اس نے، سونے دو۔''

''کیوں جی طبیعت خراب تھی کیا؟''

''بس کبھی کبھی زخموں کے ٹانکے کھل جاتے ہیں فضیلت۔'' میراں اماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ فضیلت ان کی بات کو نہ سمجھنے پر کندھے اچکاتے ہوئے کچن میں چلی گئی تھی۔ سیمل جب سو کر اٹھی تو میراں اماں باہر تخت پر بیٹھی تھیں اور حیدر کی بیوی سے باتیں کر رہی تھیں۔

''سیمل بچہ ناشتا کر لو۔''

''آپ نے کر لیا اماں جان!'' وہ ہاتھوں سے بال پیچھے کرتے ہوئے ان کے پاس آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بچے یہ حیدر کی بیوی آئی ہے میں اس کے ساتھ جا کر ذرا گھر کی صفائی کروالوں، کیا پتا آج کل میں نوشیرواں آ جائے اتنے دن ہو گئے اسے گئے۔''

''اماں جان آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رات بھی بخار تھا، میں چلی جاؤں گی حیدر کی بیوی کے ساتھ۔'' اس نے ان کی کلائی پکڑ کر نبض دیکھی۔

''ارے اماں جان آپ کو اب بھی بخار ہے۔ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔''

''نہ بچہ یہ بخار ایسے ہی ہو جاتا ہے کبھی کبھی جب دل بہت بوجھل ہوتا ہے، خود ہی اتر جائے گا جب درد ڈھلے گا کچھ۔'' سیمل ایک دم چپ کر گئی...... رات اس نے میراں اماں کو کیا کیا کچھ یاد دلایا تھا۔ پتا نہیں رات اس کی طرح میراں اماں بھی سوئی تھیں یا نہیں۔

''اچھا آپ دوا تو لے لیجیے گا۔''

''فضیلت......'' اس نے آواز دی۔ ''میرا ناشتا اور آپا کے لیے چائے لے آؤ یہیں۔'' ناشتا کر کے وہ حیدر کی بیوی کے ساتھ میراں اماں کے گھر آ گئی تھی۔ کمروں کی صفائی کر کے حیدر کی بیوی کچن دھونے لگی تو وہ باہر تخت پر آ کر بیٹھ گئی دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج چودہ جون تھی اور سورج صبح ہی صبح آگ برسا رہا تھا۔ ''پتا نہیں نوشیرواں کب آئے گا۔'' اس نے تخت پر بیٹھے بیٹھے سوچا۔

''میراں اماں کتنی اداس اور افسردہ ہو گئی ہیں... اس کے جانے کے بعد۔'' وہ تخت پر بیٹھے بیٹھے نوشیرواں کو سوچ رہی تھی کہ صحن کا دروازہ کھلا اور نوشیرواں بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ وہ بے حد تھکا تھکا اور نڈھال لگ رہا تھا۔

''آپ آ گئے۔'' سیمل یکدم کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ یکدم روشن ہو گیا تھا اور اسے لگا جیسے آگ برساتے سورج کے سامنے کوئی ٹھنڈا سرمئی بادل آ گیا ہو۔ کچھ دیر پہلے جو دھوپ آنکھوں کو چبھ رہی تھی اب یکا یک جیسے اس کی چبھن ختم ہو گئی تھی۔ بیگ تخت پر رکھ کر وہ نڈھال سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیمل نے دیکھا وہ کچھ کمزور ہو گیا تھا اور رنگت بھی کچھ زیادہ سنولا گئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ سیمل، کھڑی کیوں ہو۔'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔ ''تم ٹھیک ہو نا سیمل اور اماں جان کیسی

www.paksociety.com

ہیں؟‘‘ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ سیمل کو بھی اس کا تم کہنا برا نہیں لگا تھا۔

’’سب ٹھیک ہیں۔‘‘ حیدر کی بیوی نے کچن سے باہر آ کر اسے سلام کیا تو نوشیرواں نے اس کا بھی حال احوال پوچھا۔

’’آپا آپ اماں جان کو بتا دیں کہ نوشیرواں آ گئے ہیں۔‘‘ حیدر کی بیوی چلی گئی تو سیمل نے دیکھا وہ سر جھکائے پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

’’آپ نے بہت دن لگا دیے، اماں جان اداس ہو گئی تھیں۔‘‘

’’ہاں، دن کچھ زیادہ ہی لگ گئے۔‘‘ اس نے بغور سیمل کی طرف دیکھا۔

’’وہ میں آپا کے ساتھ اِدھر صفائی کروانے آئی تھی۔‘‘ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر سیمل نے وضاحت کی۔

’’میں نے آپ سے یہاں ہونے کی وضاحت تو نہیں مانگی سیمل...... بلکہ مجھے اچھا لگا آپ کو یہاں دیکھ کر جیسے کوئی خواب تعبیر پا جائے۔ جیسے مدتوں بعد کوئی مسافر گھر آئے تو گھر میں وہی اس کا منتظر ہو جس کے منتظر ہونے کی اس نے چاہ کی ہو۔ سارے سفر کے دوران اسے سوچا ہو۔‘‘ سیمل نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر سیمل نے نگاہیں جھکا لیں۔

’’گل...... گل کا کچھ پتا چلا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سیمل کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

’’میں جان عالم سے ملا...... وہ کہتا ہے گل کسی بھی قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ ہاں اپنے خاندان کے اتنے افراد کی موت نے اسے بالکل چپ کر دیا تھا۔ وہ پشاور آنے کے بعد کئی دن تک بالکل چپ رہا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا پھر ایک دن وہ ایک تنظیم کے دفتر میں جا کر رائفل چلانا سیکھنے لگا۔ وہ ایک ایسا قبائلی تھا سیمل جس نے کبھی بندوق نہیں پکڑی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا جان عالم نہیں جانتا تھا لیکن پھر ایک دن اس نے بندوق پھینک دی۔

’’نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔‘‘ اس روز وہ ہاسٹل کے کمرے میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ بس وہ چند دن وہاں گیا تھا ابھی تو اسے صحیح طرح سے نشانہ لگانا بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بندوق نہیں اٹھا سکتا تھا، میں جانتا ہوں۔ وہ لفظوں پھولوں، رنگوں اور تتلیوں سے محبت کرنے والا تھا۔ شاعر...... نازک دل شاعر۔ وہ آرمی میں نہیں گیا...... اس نے ماموں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آرمی میں نہیں جا سکتا۔ جان عالم کہتا ہے اس روز کے بعد وہ پھر چپ ہو گیا تھا۔ وہ تھا اس کا کمرا اور اس کی کتابیں پھر ایک روز پتا نہیں کیوں کس شبہے میں......‘‘ وہ خاموش ہو گیا تو سیمل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

’’یہاں اخباروں میں اچھی خبریں نہیں آتیں۔ ہر روز حملے...... ہر روز مرنے کی اطلاع...... تو پھر......‘‘ سیمل پوچھنا چاہتی تھی کہ وہاں پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے اور نوشیرواں جیسے اس کے دل کی بات جان گیا۔

’’ہاں، پتا نہیں کون لوگ ہیں اور ان کی پشت پر کون ہیں۔ کوئی غدار...... بکے ہوئے لوگ۔ قبائلیوں کی ساٹھ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی حکومت کے خلاف کچھ نہیں کیا پھر اب یکا یک وہ کہتے ہیں یہاں دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں۔ سرکاری اہلکار مارے جاتے ہیں۔ حملہ کرنے والے کون ہیں۔ دہشت گرد...... لیکن یہ دہشت گرد اچانک کہاں سے ہماری زمینوں پر اُگ آئے ہیں۔‘‘ اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور بے حد الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ تب ہی





دروازہ کھلا اور میراں اماں اور ان کے پیچھے پیچھے فضیلت ہاتھ میں روح افزا کا جگ لیے آ رہی تھیں۔ نوشیرواں کھڑا ہو گیا۔ میراں اماں بے تابی سے اس کی طرف بڑھیں نوشیرواں نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔

’’ارے بچہ گرمی سے گھبرا کر نہانے چلی گئی تھی میں، کب آیا؟‘‘ وہ اس کی پیشانی چوم رہی تھیں۔

’’میں نے کہا گرمی سے آئے ہیں میجر صاحب تو فٹافٹ ٹھنڈا شربت بنا لوں۔‘‘ فضیلت نے جگ تخت پر رکھا۔ فضیلت نے اپنی کارکردگی جتائی تو سیمل مسکرا دی۔

’’یہ تم نے اچھا کیا۔ اب فٹافٹ کچن سے گلاس بھی لے آؤ۔‘‘

’’یہاں تپش ہے بچہ اندر کمرے میں چلو۔‘‘ نوشیرواں بیٹھنے لگا تو میراں اماں نے کہا۔

’’میں اب چلتی ہوں اماں جان، کھانا اُدھر سے بھجوا دوں گی۔‘‘ سیمل کھڑی ہو گئی تھی۔ نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

’’آپ فریش ہو جائیں تو پہلے چائے بھجوا دوں۔‘‘ وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں کو لگا جیسے اندر دور تک کوئی مٹھاس سی گھل گئی ہو۔

’’نہیں، میں کھانے کے بعد ہی چائے پیوں گا۔‘‘ وہ مسکرایا تھا اور سیمل دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے سنا تھا میراں اماں کہہ رہی تھیں۔

’’سیمل بہت اچھی بچی ہے شیری بہت محبت کرنے والی...... میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ......‘‘ اور سیمل ان کی پوری بات نہیں سن سکی تھی پھر کتنے ہی دن تک وہ اس نامکمل بات کو مکمل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

جبکہ میراں اماں نے بات مکمل کی ہی نہیں تھی اور ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے نوشیرواں عادل سوچ رہا تھا کہ کاش اماں جان بات مکمل کر دیتیں تو میں بھی اپنے دل کی خواہش ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا اور کیا ہی اچھا ہو کہ میری اور اماں جان کی خواہش ایک ہو اور اس بے رنگ زندگی میں رنگ اتر آئیں۔ بلاشبہ سیمل خان بہت پیاری تھی اور پہلی نظر میں ہی وہ اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت دیر تک سیمل کے متعلق سوچتا رہا تھا حتیٰ کہ شام گہری ہو گئی اور میراں اماں نے مغرب کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ چیئر پر بیٹھا کمپیوٹر کی خالی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ میراں اماں نے لائٹ جلائی۔

’’مغرب ہو گئی اور تم اندھیرے میں کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں اماں جان۔‘‘ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

’’بچہ تم نے مغرب کی نماز بھی نہیں پڑھی۔‘‘

’’جی۔‘‘ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ’’مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ مغرب ہو گئی۔‘‘

’’کیا سوچ رہے تھے بچے؟‘‘ انہوں نے اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔

’’اماں جان دل بہت اداس ہے، کتنے گہرے سناٹے اتر آئے ہیں ہماری زندگی میں ... اندر باہر ہر جگہ سناٹا ہے اور اب کیا یہ سناٹے ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر ہو گئے ہیں۔ جو چلے گئے وہ تو چلے گئے اور جو ہے وہ نہ جانے کہاں ہے۔ پتا نہیں ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو جانے کس اذیت کتنی تکلیف میں ہے میں تو گیارہ ماہ سے اسے کھوج کھوج کر تھک گیا ہوں، کہیں سے کوئی خبر کوئی پتا نہیں۔‘‘ اس کی خمار پلکیں بھیگ رہی تھیں اور آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اماں جان



www.paksociety.com

اس کی کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی چیئر پر بیٹھ گئیں۔

''شیری بچے ایسا کیا ہوگیا ہے جب سے علاقے سے ہو کر آیا ہے اتنی ناامیدی اتنی مایوسی......''

''اب ہونے کو اور کیا رہ گیا ہے اماں جان۔''

''نہ بچہ ایسا نہیں کہتے، اٹھ کے دو نفل پڑھ کے اللہ سے صبر و استقامت مانگ۔ اللہ ہمارے گل کو ہم سے ملائے۔ وہ ہے نا ہمارے لیے امید کی کرن، آس کا تارا جینے کا آسرا۔''

''اماں جان۔'' اس نے تھوڑا سا ان کی طرف جھکتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''میں آپ جیسا حوصلہ اور صبر کہاں سے لاؤں۔ میرا دل پھٹ جانے کو ہے۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف ملبے اور اینٹوں کا ڈھیر۔ ویران بے آباد، آدھی گری، آدھی کھڑی دیواریں، ٹوٹی چھتیں، صرف ڈیڑھ سال پہلے وہاں ایک گھر تھا، ایک چار دیواری تھی جہاں زیمرینے کی معصوم کھلکھلاہٹیں تھیں، جہاں زینے کدکڑے بھرتی تھی اور آپ کی ڈانٹ کھا کر ہنستی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں چبوترے پر بیٹھ کر گل اپنی غزلیں اور نظمیں سناتا تھا اور سب اسے چھیڑتے تھے اور اب وہاں صرف دلدار ہے جو کسی ٹوٹی دیوار پر بیٹھ کر سارا دن روتا ہے اور آوارہ کتے ہیں جو اس کھنڈر میں دلدار کے پتھر کھا کر چلاتے ہیں۔''

''بس کر بچہ بس کر کیوں ماں کا صبر آزماتا ہے اور اس کا سینہ چھلنی کرتا ہے۔'' نوشیرواں عادل نے ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تو میراں اماں کا دل جیسے پانی بن کر آنکھوں سے بہنے کو بے تاب ہوا۔

☆☆☆

سیمل اپنے بیڈ پر لیٹی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا رخ اماں کی طرف تھا۔ اماں اپنے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں ایک دوسرے سے جوڑے وہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا اماں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنی قسمت دیکھ رہی تھیں۔

''اماں کیا دیکھ رہی ہیں؟'' کہنی کے بل ذرا سا اونچا ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''یہ......'' اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

''اِدھر آ۔'' وہ اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑے ہوئے اماں نے دل کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں ہاتھوں کی لکیریں مل کر خوب صورت ب بنا رہی تھیں۔ اماں کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور تب اچانک اسے یاد آیا کہ اسکول میں لڑکیاں یونہی ایک دوسرے کے ہاتھ جوڑ کر ب بناتی تھیں۔ جس کی ب خوب صورت بنتی وہ کہتیں اس کا شوہر خوب صورت ہوگا اور اماں کے شوہر خوب صورت تھے اور کیا وہ واقعی خوب صورت تھے؟ اس نے سوچا اور واپس اپنے بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ کل سے اس کا دل بہت اداس تھا۔ آج صبح وہ یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی۔ حمنہ نے بھی چھٹی کرلی تھی۔ اس نے میراں اماں کا حال بھی نہیں پوچھا تھا اور...... اور نوشیرواں......وہ پتا نہیں گھر پر ہے یا...... ایک لمحے کے لیے اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا دوسرے لمحے وہ پھر اماں کو دیکھنے لگی تھی۔ جو ہتھیلیاں جوڑے ابھی تک اپنے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جارہی تھیں۔

''اماں آپ کو پتا ہے کل سولہ جون ہے، سولہ جون۔'' اس نے دل ہی دل میں انہیں مخاطب کیا۔ کاش سولہ جون کبھی نہیں آتی۔ وہ سولہ جون کو کیلنڈر کے صفحات سے نکال سکتی۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کیا اور کھڑی ہوگئی۔

''اماں چلیں باہر چلتے ہیں۔ یہاں اندر بہت گھٹن ہے۔'' اماں نے دونوں ہاتھ نیچے کیے اور نفی





میں سر ہلایا۔ تب وہ خود ہی اٹھ کر باہر آگئی۔ اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔

''مجھے یہ گھر اس لیے پسند ہے کہ یہاں صحن میں سے اوپر آسمان نظر آتا ہے اور آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتے ستارے بالکل دادا جان کی حویلی کی طرح وہاں سے بھی آسمان ایسا ہی نظر آتا تھا لیکن......''

قریب سے ہی مروان کی سرگوشی سنائی دی تھی اس نے برآمدے میں کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

''مروان۔'' اس کے لبوں سے سسکی نکلی اور وہ تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس نے دونوں پاؤں تخت پر رکھ لیے تھے اور گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ہولے ہولے اس کی سسکیاں بلند ہوگئی تھیں۔

نوشیرواں اماں کو نماز میں مشغول دیکھ کر پھر باہر آگیا تھا اب وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ جون کے اس تپتے دن کی رات خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور ہوا میں تپش بھی نہیں تھی۔ آٹھ سال پہلے وہ پندرہ جون کی رات تھی جب وہ ایک ماہ سیکٹر بٹالک پر ڈیوٹی دینے کے بعد کارگل سیکٹر میں آیا تھا۔ وہ نومبر سے جنوری تک سیاچن محاذ پر موجود تھا سردی کی شدت چار سو برف ہی برف فضا میں آکسیجن کی شدید کمی کے باوجود وہ ان برف زاروں پر ڈیوٹی دیتا رہا تھا۔ اس کے پاؤں frostbite کا شکار ہو چکے تھے لیکن ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود وہ رضا کارانہ طور پر پھر آگیا تھا۔ پندرہ جون کی اس رات جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ہوا تیز چلتی تھی۔ دشمن کی سنسناتی گولیاں بارود اگلتی توپیں......اور زمین کے اندر چھپے مائنز کی پروا کیے بغیر وہ دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے کیپٹن خان کی قیادت میں سب کئی دنوں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے کیپٹن خان کے جذبے کو دل ہی دل میں سراہا تھا کیپٹن خان سے اس کی دوستی اسکردو میں ہوئی تھی۔ کیپٹن خان بہت پُرجوش تھے پھر انہوں نے کئی اہم چوکیوں پر قبضہ کرلیا تھا اور جب بھارتی فوجی چوکیوں سے فرار ہو رہے تھے تو کسی فوجی نے دستی بم پھینکا تھا اور بم کے کئی ٹکڑے اس کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔ جب وہ اسے کیمپ میں لے جا رہے تھے تو کیپٹن خان نے وکٹری کا نشان بنایا تھا اور اس نے بھی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اور نیچے عارضی قائم کیے اسپتال میں جب اس کی ٹانگ سے بم کے ٹکڑے نکالے جا رہے تھے تو اس نے سنا کہ دشمن نے گن شپ ہیلی کاپٹروں سے گولیوں اور بموں کی بارش کردی تھی اور یہ سولہ جون تھی جب اسے راول پنڈی بھجوانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں جب کسی نے بتایا کہ کیپٹن خان شہید ہوگئے۔ یقیناً کیپٹن خان نے ابدی زندگی پالی تھی لیکن پچھلے ایک سال سے ان کا ساتھ تھا۔ اسکردو میں، چراٹ آرمی میس میں لبچپال پوسٹ پر ہر جگہ وہ ساتھ تھے۔ اسٹریچر پر لیٹے لیٹے نوشیرواں نے کیپٹن خان کے لیے بہت سارے آنسو بہائے تھے۔ جب اسے ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا جارہا تھا وہ تب رو رہا تھا۔

صحن میں ٹہلتے ٹہلتے نوشیرواں کو لگا جیسے اس کے رخسار گیلے ہو رہے ہوں۔ اس نے ہاتھ رخسار پر رکھے تو وہ بھیگ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شہادت اس کا نصیب کیوں نہیں بنی......تب اس نے سوچا تھا لیکن جب وہ ایک ایک کر کے سترہ بندے دفنا کر کھڑا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ شاید اللہ نے اس دن کے لیے اسے بچایا تھا کہ اسے ان پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دبانا تھا اور میراں اماں اور گل کو سہارا دینا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رکا۔ وہ بالکل سیمل کے گھر کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ فضا میں موتیے کے پھولوں کی مہک تھی اور سناٹے میں



www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی کی سسکیاں سنائی دی تھیں اور یہ سسکیاں دیوار کے اس طرف سے آرہی تھیں۔
''کیا یسمل......؟'' وہ بے قرار سا ہو کر دیوار کے قریب چلا گیا۔ خاموشی اور سناٹے میں سسکیاں بہت واضح تھیں۔
''پتا نہیں یسمل اتنا روتی کیوں ہے؟ ہمیشہ اس کی پلکیں بھیگی دکھتی ہیں اور غزال آنکھوں میں شکاریوں کے ڈر سے بھاگنے والی ہرنی کا سا ڈر اور ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا ملال ہوتا ہے۔
''کیا وہ مروان کو یاد کر کے روتی ہے اور کیا اسے اپنے ابا کا خوف ہے لیکن اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اسے اپنے ابا سے کیا خوف ہے۔'' وہ بے چین سا مڑا تو اس نے دیکھا میراں اماں نماز سے فارغ ہو کر اس کے کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ برآمدے میں آکر انہوں نے نوشیرواں کی طرف دیکھا۔
''شیری بچہ دو پھلکے پکا لوں تیرے لیے۔''
''ابھی نہیں اماں جان۔'' وہ برآمدے میں آگیا۔
''دس تو بجنے والے ہیں بچہ پھر کس وقت کھائے گا، میں پھلکے ڈال لیتی ہوں تو اتنے میں مائیکرو میں سالن گرم کرلے۔''
''اماں جان۔'' ان کی بات کا جواب دیے بغیر اس نے بے قراری سے کہا۔ اماں جان اُدھر سے رونے کی آواز آرہی ہے۔ شاید یسمل رو رہی ہے۔''
''ہاں' وہی روتی ہوگی۔''
کیوں اماں جان' وہ کیوں روتی ہے اتنا۔ کیا مروان کے لیے؟''
''ہاں بچہ۔'' میراں اماں تخت کے کونے پر ٹک سی گئیں۔ ''نازک ہے کمزور دل ہے اور دکھ اس کی طاقت اور ہمت سے زیادہ، جب ہمت جواب دے دیتی ہے تو...... میں نے اکثر راتوں کو اسے روتے اور مروان سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔''
''تو اماں جان۔'' وہ بھی وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔
''وہ کیوں نہیں مروان سے کہتی کہ وہ آجائے۔'' یسمل کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے اور سسکیاں سماعت کو اذیت دیتی تھیں۔ میراں اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''پاغلا (پاگل) بھلا اُدھر سے بھی کوئی آسکتا ہے۔''
''اماں جان۔'' ان کی بات کا مطلب سمجھے بغیر نوشیرواں جھنجلایا۔ ''آج کل فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ کینیڈا ہو یا دنیا کا آخری کنارہ جس نے آنا ہو وہ آجاتا ہے۔'' اماں جان نے ایک گہری سانس لی۔
''پر اُدھر سے کب کوئی آیا ہے، آسکتے تو ہم زینبے، شمو، خانیاں، زبیر سب کو نہ بلا لیتے پاغلا۔''
''کیا مروان......؟'' نوشیرواں کا منہ کھلا رہ گیا۔
''ہاں بچے۔''
''نہیں۔'' وہ ابھی تک حیرت سے اماں جان کو دیکھ رہا تھا۔ ''پر وہ تو ایسے بات کرتی ہے مروان کی جیسے وہ زندہ ہو اور اس سے بات کرتا ہو۔ اس کی بات سنتا ہو۔''
''ہاں، اس نے اپنے اندر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اپنی ڈائری میں لکھ کر اس سے باتیں کرتی ہے۔ جس صبح تو آیا تھا اس کی تو پوری رات وہ جاگی ہے، میں دیکھ رہی تھی اس کی بے چینی اور تڑپ اور اب آج رات بھی کہاں سو پائے گی کل سولہ جون ہے۔ سولہ جون کو ہی مروان شہید ہوا تھا۔ ادھر کارگل سیکٹر میں...... تو بھی تو ادھر رہا شیری، جانتا ہوگا اسے۔'' 16 جون، مروان کیپٹن مروان خان شہید، لاہور۔ وہ چونکا تھا۔





مروان خان جسے وہاں سب کیپٹن خان کہتے تھے اور چراٹ آرمی میس میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے رومی کہتے تھے۔ وہ جواں سال کیپٹن حسام اسے ہمیشہ مولانا رومی کہتا تھا۔ رومی اس کا نک نیم تھا اور کیپٹن حسام اس کا کالج کا ساتھی۔ کیپٹن خان جو اسکردو میں اور جو سیاچن کی برف پر بیٹھ کر کھلے آسمان تلے اپنی گڑیا کی باتیں کرتا تھا۔ جو اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی اس کے پاس گڑیا کے علاوہ اور کوئی موضوع ہوتا نہیں تھا۔ وہ گڑیا کے ساتھ حامو چاچا سے پرانی کتابیں خریدتا تھا۔ اسے کہانیاں سناتا تھا، کتنی ہی باتیں اس نے نوشیرواں سے شیئر کی تھیں۔
''حامو چاچا ہمارے لیے اچھی کتابیں الگ کر کے رکھ دیتا تھا۔'' 14 جون کی صبح کارگل محاذ کے متعلق باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے کہا تھا۔
''اور شاید اب گڑیا کبھی حامو چاچا سے کتابیں خریدنے نہیں جاسکے گی۔ وہ اکیلی تو کبھی گئی ہی نہیں اور حامو چاچا ہمارا انتظار کرتا رہے گا۔ تم کبھی لاہور جاؤ شیری تو حامو چاچا کو ضرور بتا دینا۔'' اس نے کیپٹن خان کو ٹوکا نہیں تھا۔ وہاں سب ہی شہادت سے گلے ملنے کو تیار بیٹھے تھے۔
''مجھے شہادت کی خواہش تو ہے لیکن مجھے اماں اور گڑیا کا خیال آتا ہے۔'' پندرہ جون کو جب اسے اسٹریچر پر لٹایا جارہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ وہ کبھی حامو چاچا کے پاس انارکلی نہیں جاسکا تھا۔ کیا پتا وہ اب بھی یسمل اور مروان کا انتظار کرتا ہو اور ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتا ہو۔ میراں اماں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
''اچھا میں اب روٹیاں بنالوں؟'' انداز سوالیہ تھا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا حالانکہ اس کا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور اگر وہ نہ کھاتا تو پھر

## غزل

وصل بہار میں کٹ جائے ٹہنی تو عزم رکھتا ہے
گر نہ ہو امید وفا تو قدم رکھتا ہے

رکھتا تو ہے وہ بھی زبان منہ میں
نہ جانے کیوں، کچھ کہنے سے صنم رکھتا ہے

میدان الفت میں ہم ہار گئے اس سے
بات تو ہے سچ مگر پھر بھی قلم رکھتا ہے

نئے چہرے، نئی باتیں، نئے وعدے
ایسا کرنے سے کہاں دیرینہ ظلم رکھتا ہے

آج اس کے چہرے پہ وہ مسکان نہ تھی
نہ دیکھوں جس کو خضر تو دم رکھتا ہے

شاعر: محمد امین خضر

مرسلہ: میمونہ عزیز، کراچی

میراں اماں بھی بھوکی ہی سو جاتیں۔ میراں اماں کچن میں چلی گئی تھیں وہ اٹھ کر پھر صحن میں آگیا تھا۔ دیوار کے اس پار سے اب بھی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، وقفے وقفے سے اور اس کا دل دیوار سے ادھر کرلاتا تھا۔ کاش وہ یسمل کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن سکتا۔ اس کے اس غم پر اسے گلے لگا کر تسلی دے سکتا۔ سسکیاں تھم گئی تھیں شاید وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی، اس نے سوچا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو کچن سے نکل کر روٹیاں پکنے کا بتا رہی تھیں۔ اس نے صحن میں پھیلی موتیے کی مہک کو سانس کے ذریعے اندر اتارا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔
یسمل روتے روتے تھک گئی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور برآمدے میں لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ بلب کی مدھم روشنی



www.paksociety.com

میں اس نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ برآمدے میں دائیں طرف لگے بیسن کی طرف بڑھی۔ منہ ہاتھ دھو کر دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے جب وہ کمرے میں آئی تو اماں ایک بار پھر ہاتھ جوڑے دل کی لکیروں کو ملا رہی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے مسکراتی تھیں اور پھر ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتی تھیں۔ وہ آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گئی پھر اسے خیال آیا کہ اماں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا اور کھانے کے بعد اماں کو دوا بھی کھانی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں جی کھانا لاؤں کھائیں گی؟'' اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور ہاتھ نیچے کر لیے تھے۔ اب وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ سیمل اٹھ کر ان کے قریب آئی تھی۔

''تو اتنا روتی کیوں ہے؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''میں کیوں روتی ہوں اماں جی!'' سیمل کی آنکھیں پھر جل تھل ہونے لگی تھیں۔ ''آپ کو نہیں پتا میں کیوں روتی ہوں۔ اماں مجھے مروان یاد آتا ہے۔ میں اس کے چلے جانے پر روتی ہوں۔ کیا وہ آپ کو یاد نہیں آتا؟ کیا آپ کو پتا نہیں چلتا کہ وہ آٹھ سال سے ہمارے پاس نہیں آیا۔ اس گھر نے اس کے قدموں کی دھمک نہیں سنی، فضاؤں نے اس کی گنگناہٹیں نہیں سنیں۔ اس نے آپ کو نوالے بنا بنا کر نہیں کھلائے۔ اماں یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر کسی نے آپ کی گڑیا کو آٹھ سالوں سے کوئی کہانی نہیں سنائی۔ آپ کی آنکھیں بھی تو اسے ہی ڈھونڈتی ہیں، پھر آپ کیوں نہیں روتیں، کیوں نہیں اسے پکارتیں کہ آپ کی پکار سن کر ہی وہ آجائے۔'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں اور سیمل بولے جارہی تھی

''لیکن وہ نہیں آئے گا اماں جی کبھی نہیں آئے گا۔ ہم اسے اب کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ اب کبھی آپ کو اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر نہیں کھلائے گا۔ وہ اب مجھے کہانیاں نہیں سنائے گا۔ اماں ہوم سوئٹ ہوم کی نیلی کا بھائی ایک گھر بنانے کی چاہ میں مشقت کرتے کرتے خون تھوکنے لگا اور پھر مرگیا...... اور گڑیا کا بھائی بھی اس کے لیے ایک پُرامن محبت بھرا گھر تلاشتے تلاشتے مرگیا۔ اماں مروان مرگیا، شہید ہوگیا۔ کارگل کی برف پوش چوٹی کو اس کا خون رنگین بنا گیا۔'' آٹھ سالوں بعد مروان کی موت پر وہ اماں کے گلے لگے دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''ہمارا رومی مرگیا، اماں جی ہمارا رومی مرگیا۔'' اماں نے اسے اپنے کمزور بازوؤں میں دبوچ لیا تھا اور اب اسے اپنے ساتھ بھینچے وہ بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ مروان کی شہادت پر آٹھ سالوں بعد وہ سیمل کو گلے لگائے رو رہی تھیں اور ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔

''میرا بچہ، میرا رومی۔'' اچانک روتے روتے سیمل کو لگا جیسے ان کی گرفت کمزور پڑ گئی ہو۔ ان کے بازو اس کے اطراف میں لٹک گئے تھے۔

''اماں جی۔'' اس نے انہیں جلدی سے لٹایا۔ وہ نڈھال ہو رہی تھیں۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کا چہرہ صاف کر کے اس نے جلدی سے انہیں پانی پلایا۔

''یا اللہ، یہ میں نے کیا کیا...... میں نے کیوں ...... یا اللہ میری اماں کو کچھ نہ ہو۔'' اس نے سکون والی ٹیبلٹ نکال کر اماں کو دی۔

''کسی بھی قسم کا ہیجان ان کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اگر کبھی ایسا محسوس ہو تو



www.paksociety.com



انہیں فوراً یہ دوا دے دیجیے گا۔'' ایک بار ڈاکٹر عرفان نے کہا تھا۔ دوا کھانے کے کچھ دیر بعد ہی اماں سوگئی تھیں لیکن اسے بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے وہ آخری رات یاد آرہی تھی جب کڑکتی سردی میں وہ اور مروان سڑک پر واک کر رہے تھے۔ اور جھاگ اڑاتی کافی پیتے ہوئے مروان بڑی سنجیدگی سے اسے تک رہا تھا۔ مروان کو سوچتے سوچتے وہ جانے کب سوگئی تھی۔

صبح ابھی وہ ناشتا کر رہی تھی کہ حمنہ آگئی اور یہ پچھلے سات سالوں سے حمنہ کا معمول تھا۔ ان بالکل غیر لوگوں نے اسے کتنی اپنائیت دی تھی۔ ''ابو نے سب جگہوں پر کھانا بھجوانے کو کہہ دیا ہے۔ اور بھائی نے مسجد میں دعا اور قرآن خوانی کے لیے کہہ دیا ہے۔'' حمنہ بتا کر خود قرآن لے کر پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

''اس بار میں نے اِدھر جھگیوں میں بھی ایک دیگ بھجوانے کا کہا تھا۔''

''ہاں میں نے ابو کو بتا دیا تھا۔'' حمنہ قرآن پڑھ رہی تھی وہ کمرے میں آئی تاکہ اگر اماں جاگ رہی ہوں تو انہیں ناشتا دے سکے۔ اماں کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں اور ان کے ہاتھ میں مروان کی تصویر تھی۔ اس نے دیکھا اس کی ڈائری زمین پر گری تھی شاید بیڈ سے اٹھتے ہوئے گرگئی ہوگی۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کی ڈائری میں ہوتی تھی۔ اماں تصویر کو دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اماں جی......'' وہ ان کے قریب آئی تھی۔

''تو نے کیا کہا تھا ابھی؟'' انہوں نے سیمل کی طرف دیکھا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کہا اماں جی۔''

''نہیں تو کہہ رہی تھی کہ رومی...... رومی چلا گیا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ حمنہ ان کے رونے کی آواز سن کر اندر آگئی تھی۔

''حمنہ...... حمنہ اماں کو آٹھ سال بعد احساس ہوا ہے کہ رومی بھائی...... حمنہ اماں شاید......'' وہ رونے لگی۔ حمنہ نے اسے اماں کے گلے لگے روتے دیکھا۔

''سیمل...... یمی اس وقت اماں کو ڈاکٹر کی سخت ضرورت ہے، میں بھائی سے کہتی ہوں ڈاکٹر عرفان ابھی گھر میں ہی ہوں گے انہیں بلا لائیں۔

میرا خیال ہے سیمل اماں ٹھیک ہو رہی ہیں۔ اماں پلٹ رہی ہیں واپس......'' ڈاکٹر عرفان نے اماں کو چیک کر کے انجکشن لگایا تھا۔

''انہیں اس حالت میں سکون کی سخت ضرورت ہے یہ جب جاگیں تو مروان کا ذکر مت کیجیے گا۔'' ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔ ''اچانک صورتِ حال بگڑ بھی سکتی ہے۔'' وہ سیمل کو ہدایت دے کر چلے گئے۔ دن میں میراں اماں بھی آئی تھیں اور بہت دیر تک اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔ انہیں دیکھ کر اسے حوصلہ ملتا تھا۔

''شیری صبح صبح ہی دفتر چلا گیا ہے۔ جب سے آیا ہے وہاں سے بہت اپ سیٹ ہے۔'' انہوں نے اسے بتایا تھا۔ وہ فوج سے فارغ ہونے کے بعد فوجی فاؤنڈیشن کے کسی ادارے میں کام کر رہا تھا۔

''کارگل میں اس کی ٹانگ میں بم کے ٹکڑے گھس گئے تھے۔ دو تین بار آپریشن ہوا ایک بار تو اس کے بابا بہت مایوس نظر آنے لگے تھے انہوں نے مجھ سے کہا۔ اماں شاید وہ اس کی ٹانگ کاٹ دیں گے لیکن پھر اللہ کا کرم ہوا۔'' اس روز میراں اماں نے اسے بتایا تھا۔

''کارگل کے محاذ پر...... مروان بھی تو وہاں ہی تھا۔'' اس نے سوچا۔ میراں اماں اسے صبر اور حوصلے کی تلقین کر کے چلی گئی تھیں۔ شام کو وہ انھیں تو پُرسکون تھیں۔ انہوں نے مروان کی کوئی بات نہیں کی

تھی۔ وہ ان کے لیے چائے کے ساتھ کباب اور کیک لے کر آئی تھی۔ رات سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رغبت سے کباب کھاتی رہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے اس طرح رغبت سے کبھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ خود ہی انہیں کھلاتی تھی تو وہ ایک روبوٹ کی طرح کھالیتی تھیں۔

''اماں اگر آپ کو بھوک لگی ہو تو کھانا لے آؤں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا پھر اس نے ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو باہر لے آئی تھی۔ باہر موسم اچھا تھا۔ ہوا میں مٹی کی خوشبو اور نمی تھی شاید کہیں بارش ہوئی تھی۔ اماں کو تخت پر بٹھا کر وہ خود بھی تخت پر بیٹھ کر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ یونیورسٹی کی، حمنہ کی، میراں اماں کی لیکن آج ان باتوں میں وہ جان بوجھ کر مروان کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ اماں کے ساتھ اس کی باتوں میں صرف مروان کا ہی ذکر ہوتا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔ بالکل پہلے جیسی لیکن سب کچھ پہلے جیسا تو نہیں ہوگا مروان نہیں ہوگا۔ اس نے افسردگی سے اماں کی طرف دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور اب اسے چپ دیکھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟'' یمل نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا لیکن وہ کچھ الجھی الجھی سی نظر آرہی تھیں۔ اور یہ بھی تو مثبت تبدیلی تھی کہ اماں اس کی بات کا جواب دے رہی تھیں پھر وہ یکا یک اٹھیں، تخت سے اتر کر چپل پہنے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ سب جو اماں کر رہی تھیں پچھلے کئی سالوں کی روٹین سے مختلف تھا۔ وہ ان کے پیچھے ہی کمرے تک گئی تھی وہ اپنے بیڈ پر لیٹ رہی تھیں۔

''کیوں اماں، آپ تھک گئی ہیں۔ سوئیں گی کیا؟''

''ہاں!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کروٹ بدل کر رخ دیوار کی طرف کر لیا۔ اب ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ یمل کچھ دیر کھڑی ان کی پشت دیکھتی رہی پھر واپس باہر آگئی۔ باہر شام کی اداسی پھیل رہی تھی۔ سورج کا سرخ گولا افق کے کنارے پر تھا اور بس کوئی دیر میں غروب ہونے والا تھا۔ سارا دن گزر جاتا ہے لیکن شام اتنی اداس اتنی افسردہ کیوں ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ شامیں اسے ہی اداس لگتی ہیں یا پھر ہوتی ہی اداس ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پرندوں کی قطاریں اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی یہ جانے کہاں کس تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ شاید رزق کی تلاش میں اور پھر شام ہوتے ہی گھروں کی طرف۔ صبح سفر پر جانے والے سارے پرندوں میں شاید کوئی ایسا بھی ہوتا ہوگا جو گھر واپس نہ پلٹ پاتا ہو۔ وہ یونہی اوٹ پٹانگ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہی تھی۔ یکدم اس کی نظر میراں اماں کے گھر کی دیوار پر پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیکھوں میراں اماں کیا کر رہی ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چلتے ہوئے صحن کی دیوار کے پاس آئی اور کرسی پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھا۔ میراں اماں تو کہیں نہیں تھیں ہاں نوشیرواں دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی کھڑی نوشیرواں کو دیکھتی رہی۔ برآمدے میں اب ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن نوشیرواں پڑھ رہا تھا اور اسے لگا جیسے وہ بہت اداس ہو۔ وہ واپس اترنے لگی تھی جب نوشیرواں کو اس کی جھلک نظر آئی تھی۔

یمل......'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا

www.paksociety.com

اور وہ اٹھ کر صحن میں آ گیا تھا اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کی ڈائری تھی شاید۔ سیمل نے اسے دیکھا اور سلام کیا۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کہاں تھیں آپ؟ نظر ہی نہیں آئیں۔''

''گھر پر ہی تھی۔''

''اماں جان سے کوئی کام تھا کیا؟''

''نہیں تو بس ایسے ہی۔'' وہ گھبرائی۔

''اماں جان صبح آئی تھیں نا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''جی، اب کہاں ہیں وہ؟''

''سامنے آمنہ آپا کے گھر گئی ہیں ان کے بیٹے کو بخار تھا۔''

''اچھا۔'' وہ مڑی۔

''سنیں۔'' اب وہ صحن کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔

''اماں جی کیسی ہیں؟''

بہت بہتر۔'' اس کی آنکھیں یکدم چمکنے لگیں اور وہیں کرسی پر کھڑے کھڑے اس نے صبح اور رات کی کیفیت بتا ڈالی۔

''تو مجھے بتاتیں میں ڈاکٹر کی طرف لے جاتا۔''

''جی وہ حمنہ کا بھائی ہے نا وہ لے آیا تھا ڈاکٹر عرفان کو۔''

''اچھا۔'' نوشیرواں یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا اور واپس مڑ گیا..... مسجد میں مغرب کی اذان شروع ہو گئی تھی۔ وہ کرسی سے نیچے اتری اور حیرت سے سوچا یہ یکدم نوشیرواں کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا اسے برا لگا کہ حمنہ کا بھائی ڈاکٹر عرفان کو گھر کیوں لایا۔ پہلے بھی تو وہی...... جب نوشیرواں اس گھر میں نہیں تھا تو...... اور پھر بھلا اس میں برا ماننے کی کیا بات تھی ایسے ہی مجھے وہم ہوا۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اب بھی پرندوں کی قطاریں نیچی پرواز کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔ اس نے برآمدے میں آ کر بلب جلایا اور وضو کرنے چلی گئی۔

یہ رات بھی پچھلی رات کی طرح بے چین ہی گزری تھی پھر بھی وہ وقت پر اٹھ گئی تھی۔ آج اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ ایک دو روز میں یونیورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو رہی تھی اور پھر اگست میں ان کے فائنل پیپرز ہونے تھے۔ 18 جون لاسٹ ورکنگ ڈے تھا۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا پر پولیس والے فیرویل پارٹی بھی دے رہے تھے۔ پتا نہیں اب یا چھٹیوں کے بعد، یہ آج ہی پتا چلنا تھا۔ فضیلت کو اماں کے متعلق سمجھا کر وہ صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکل آئی تھی۔ گلی عبور کر کے اس نے حمنہ کے دروازے پر دستک دی۔ حمنہ تیار ہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں جب اس نے ایک گلی سے نوشیرواں عادل کو آتے دیکھا۔ ایک پاؤں پر زور دیتا وہ بے حد تھکا تھکا سا چل رہا تھا۔ حمنہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''ابو بہت تعریف کرتے ہیں نوشیرواں کی اور میراں اماں تو خیر ہیں ہی پورے محلے کی جان۔'' سیمل نوشیرواں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کے پیکٹ تھے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا تھا، حمنہ اور سیمل نے ایک ساتھ سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دے کر سیمل کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات بھر جاگتا رہا ہو۔

''اماں جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ رات یکدم تیز بخار ہو گیا تھا۔ رات بھر پٹیاں رکھتا رہا۔ ابھی بخار کم ہے کچھ۔'' سیمل یکدم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

''پریشانی والی کوئی بات نہیں، ابھی کلینک کھلا





ہے تو ڈاکٹر سے میڈیسن لے لوں گا۔'' وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا تو حمنہ نے رائے ظاہر کی۔

''اب میراں اماں کو اپنے نواسے کی شادی کر دینی چاہیے۔'' سیمل خاموش رہی، وہ میراں اماں کے لیے سچ مچ پریشان تھی۔ یونیورسٹی سے آ کر وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر میراں اماں کی طرف گئی۔ وہ سو رہی تھیں اور نوشیرواں ان کے پاس ہی کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی براؤن ڈائری تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب اماں جان کی؟'' وہ دروازے میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں چونک کر یکدم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ حسبِ معمول دیوار پھلانگ کر آئی تھی۔

''اب بہتر ہیں۔''

''ڈاکٹر نے کیا کہا؟'' اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

''کچھ نہیں، موسمی بخار ہے۔'' وہ بہت گہری نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''آ جائیں پلیز وہاں ہی کیوں کھڑی ہیں۔''

''نہیں، چلتی ہوں اماں جان تو سو رہی ہیں، شام کو آ جاؤں گی۔'' وہ مڑی اور ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی کہ وہ بھی باہر آ گیا، ہاتھ میں وہی ڈائری تھی۔

''سیمل۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ سیمل نے مڑ کر دیکھا وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھیں نا پلیز کچھ دیر تو...... آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔'' سیمل نے صحن میں پھیلی دھوپ کو دیکھا۔ پانچ بج رہے تھے لیکن باہر تپش تھی اور دھوپ آنکھوں میں چبھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ سیمل مسکرائی اور تخت پر بیٹھنے لگی تھی کہ بے اختیار نوشیرواں نے کہا۔

''یہاں بہت تپش ہے، اندر آ جائیں پلیز میرے روم میں۔'' سیمل بنا کچھ کہے ہولے ہولے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا تھا اور دروازہ کھول دیا۔ سیمل نے دیکھا اس کے بیڈ پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کمپیوٹر ٹیبل پر کچھ سی ڈیز پڑی تھیں۔ سیمل نے بیڈ پر سے کتابیں ایک طرف کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا سا شرمندہ ہوا۔

''دراصل میں کل سے اپنے کمرے میں نہیں آیا۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''اماں جی کیسی ہیں اب؟''

''بہت بہتر ابھی سو رہی تھیں، فضیلت ہے ان کے پاس۔''

''سیمل مجھے آپ سے مروان کے متعلق بات کرنا تھی۔''

''جی......!'' سیمل چونکی۔

''مجھے کل ہی اماں جان نے بتایا کہ مروان......'' سیمل نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

''مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ آپ کیپٹن مروان خان کی سسٹر ہیں۔ میں سمجھتا تھا شاید مروان کہیں کینیڈا یا امریکا گیا ہوا ہے۔ وہ تو اماں جان نے بتایا کہ مروان کارگل میں سولہ جون کو...... سیمل، میرا اور مروان کا تقریباً چھ سات ماہ ساتھ رہا، اسکردو میں سیاہ چن پر اور پھر کارگل میں...... جس صبح وہ شہید ہوا اس رات بھی کارگل کے محاذ پر ہم اکٹھے تھے۔ مجھے زخمی ہو کر نیچے آنا پڑا اور وہ...... وہ بہت پیارا شخص تھا اور آپ کے متعلق بہت باتیں کرتا تھا۔ جب بھی ہم فارغ بیٹھتے وہ آپ کا ذکر کرتا...... آپ کا شوق، آپ کی دلچسپیاں، آپ کی باتیں کرتے کرتے وہ تھکتا ہی نہیں تھا۔'' سیمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے



www.paksociety.com

تب ہی یہ شخص اپنا اپنا لگتا تھا کہ یہ مروان کا دوست تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اس سے مروان کے ایک ایک لمحے کی تفصیل پوچھے جو لمحے اس نے نوشیرواں کے ساتھ گزارے تھے لیکن وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تو نوشیرواں نے مضطرب ہو کر کہا۔

''پلیز سیمل روئیں نہیں۔ مروان کو اللہ نے بہت بڑا اعزاز عطا کیا۔ شہادت کا اعزاز۔'' پتا نہیں اب یہ اعزاز بڑا تھا یا اس کا دکھ بڑا تھا۔ مروان کے بچھڑ جانے کا دکھ، اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکنے کا دکھ۔ ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی اس نے اس کی شہادت پر فخر نہیں کیا تھا۔ ہاں صرف دکھ تھا اندر باہر ہر جگہ دکھ...... وہ تو بہت معمولی بہت عام سی لڑکی تھی وہ اپنے بھائی کے بچھڑ جانے پر روتی تھی۔ وہ بھائی جو ہمیشہ اس کا سائبان بنا رہا تھا جس نے ہمیشہ اس کے آنسو پونچھے اس کے درد دور کیے۔ جو صرف اس کی خاطر گھر چھوڑ آیا کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو وہ جنوری میں آخری بار ملنے آیا تھا پھر...... جنوری سے جون تک کے ہر دن ہر لمحے کی باتیں وہ جاننا چاہتی تھی پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ کیسا تھا، ان پانچ ماہ میں اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی تھی۔ وہ کمزور ہو گیا ہوگا، اتنی سردی میں جب وہاں برف پڑتی تھی اور...... وہ یہ سب پوچھنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اندر ہی کہیں گم ہو گئے تھے۔

''سیم پلیز......'' نوشیرواں نے پھر التجا کی تو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر حسبِ معمول دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

''ہم میں سے وہاں سب ہی شہادت کے تمنائی تھے لیکن قدرت جسے منتخب کر لے۔''

''کاش ان میں سے کسی کو یہ اعزاز مل جاتا جو اس کا تمنائی تھا اور مروان کو کچھ نہ ہوتا۔'' اس نے دلگرفتگی سے سوچا تھا۔

''اور کیا ضروری تھا یہ جنگ لڑی جاتی۔ لاحاصل، رائگاں۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ نوشیرواں کا رنگ لحہ بھر کو تبدیل ہوا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے سیمل کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا۔ اس کی بے حد خوب صورت ناک سرخ ہو رہی تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''بہت سارے لوگ نہیں جانتے سیمل لیکن......''

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ رول کیا ہوا نقشہ ٹیبل پر پھیلایا یہ وہی کارگل کا نقشہ تھا۔ ''یہ دیکھ رہی ہو؟'' اس نے اشارے سے سیمل کو قریب بلایا۔

''یہ کارگل کی پہاڑیاں......'' سیمل اس کے قریب کھڑی خاموشی سے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔

''پاکستان کے نقطۂ نظر سے اس علاقے کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی ہے کہ دریائے سندھ کا آغاز کارگل کے آس پاس کی پہاڑیوں سے ہی ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہو کارگل کی جنگ کیوں ہوئی؟'' اس کے بعد اس نے اپنا رخ موڑ کر سیمل کی طرف دیکھا تو سیمل نے نفی میں سر ہلایا۔

''کارگل کا منصوبہ زبردست دفاعی اہمیت کا حامل تھا۔ ہم نے یہاں بہت قیمتی جانیں قربان کیں سیمل...... ایک مقصد تھا کہ کشمیر کاز کو عالمی سطح پر واضح کیا جائے لیکن...... شاید ہم......'' وہ جیسے کسی گہرے دکھ میں ڈوب گیا اور رخ موڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیمل ابھی تک ٹیبل کے پاس کھڑی نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ کارگل کی جنگ کیوں ہوئی تھی۔

''تم بیٹھو سیمل میں آتا ہوں۔'' پھر وہ یکدم اٹھ کر باہر چلا گیا۔ سیمل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹیبل پر وہ براؤن ڈائری الٹی پڑی تھی۔ اس نے یونہی بے خیالی میں اسے اٹھا لیا اور پھر وہ چونک گئی۔

باقی آئندہ ماہ پڑھیں

# ملن کی رات

کرن احمد

''اماں بی نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا ساحرہ آپی۔'' ندا نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں، ایسا کب تک چلے گا، اچھے رشتے ہمیشہ نہیں آئیں گے، وقت بھاگ رہا ہے آپی۔''

''ندی میں کیا کروں تو ہی بتا؟'' اس نے اپنی ہلکی سرخ ہوتی گہری آنکھوں کو اوپر اٹھایا۔ ''میں جان بوجھ کر تو نہیں کرتی ایسا، میری عادت ہی ایسی ہے۔'' اس کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا۔

آپی۔'' ندا نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ عادتیں بدل لینی چاہیں جو آپ کی خوشیوں کا راستہ روکے ہوئے ہوں۔ آپ کے لیے اذیت کا باعث بنتی



www.paksociety.com

ہوں۔ اب میری طرف دیکھیے۔'' ندا نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ ''مجھ سے وعدہ کیجیے آپ اپنے آپ کو بدلیں گی۔''

وہ بت بنی کھڑی رہی۔

''کیجیے نا وعدہ.....'' ندا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''میں کوشش کروں گی۔'' ساحرہ نے خفیف سی آواز میں کہا۔

''ویری گڈ...... یہ ہوئی نا بات۔'' ندا نے اسے گلے لگالیا۔

☆☆☆

منصور شاہ کی وفات ہوئے 27 سال گزر گئے تھے۔ اماں بی ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر بیوہ بہو اور پوتیوں کی ڈھارس بنتے بڑی حویلی شفٹ ہوگئیں۔ ان کا دل نوجوان بہو کو بیوگی کے لباس میں دیکھ کر بہت کڑھتا۔ انہوں نے کئی بار اشاروں کنایوں میں شازیہ بیگم سے دوسری شادی کے لیے کہا مگر شازیہ بیگم کے لیے اب سب کچھ منصور شاہ کی نشانی یہ دونوں بیٹیاں ہی تھیں۔ وقت گزرتا گیا۔ شازیہ بیگم کے بالوں میں سفیدی اتر گئی۔ دونوں بیٹیوں کے چہروں پر جوانی پھولوں میں جوبن کی طرح کھلکھلا اٹھی تھی۔ ایک عرصے تک خاموش رہنے والی منصور حویلی اب چھوٹی ندا کی ہنسی، شرارتوں اور قہقہوں سے گونجنے لگی۔ ندا جتنی شوخ اور چنچل تھی ساحرہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ ندا جتنی باتونی وہ اتنی ہی خاموش۔ سارے دن میں وہ بہ مشکل تین چار جملے بولتی تھی۔ بقول اماں بی..... جب سے ان کی سماعت کمزور ہوئی ہے کئی کئی ہفتے گزر جاتے ہیں ساحرہ کی آواز سنے یوں لگتا ہے جیسے وہ اس گھر میں ہے ہی نہیں۔

''ارے بیٹا..... تھوڑا سا تو بول لیا کر..... ان بوڑھے کانوں کو ہمیشہ تیری آس رہتی ہے۔'' اماں بی اکثر اسے سمجھاتیں۔

''ٹھیک ہے اماں۔'' وہ بھی اکثر اتنا ہی کہہ کر چلی جاتی۔

پھر ایک دن منصور حویلی ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ دو سال پہلے ساحرہ کے لیے ایک بہت بھلے گھر سے رشتہ آیا۔ اماں بی کو پورا یقین تھا کہ رشتہ طے ہوجائے گا اور ان کا یقین سچ بھی ہوا۔ فون کی گھنٹی بجتے ہی شازیہ بیگم نے بے صبری سے فون اٹھایا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے جتنی گرمجوشی سے فون اٹھایا تھا اتنے ہی دُکھ سے رکھ دیا۔ اماں بی جو بڑی توجہ سے شازیہ بیگم کی طرف دیکھ رہی تھیں اور من ہی من میں خوشخبری کا انتظار کررہی تھیں شازیہ بیگم کو اتنا پریشان دیکھ کر چونک گئیں۔

''ارے، کیا ہوا بیٹی؟'' اماں بی نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بتاؤں اماں!'' شازیہ بیگم نے تخت پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا ہے کچھ بولے گی بھی۔'' اماں بی نے ماتھے پر سلوٹیں لاتے ہوئے کہا۔

''اماں وہ شہلا بہن کا فون تھا۔'' انہوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ تو اچھی بات ہے۔'' اماں بی نے پاندان گود میں رکھا۔

''اچھی بات نہیں ہے اماں۔'' شازیہ بیگم نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے ساحرہ نہیں ندا پسند ہے۔''

''ہائے وہ کیوں؟'' اماں بی نے سینے پر ہاتھ مارا۔

''پتا نہیں اماں، کہنے لگیں ساحرہ بھی بہت پیاری ہے پر انہیں اپنے بیٹے کے لیے ندا زیادہ پسند ہے۔''

''اوہ خدایا...... یہ کیا ہوگیا۔'' اماں بی نے سرہانے سے سر ٹکا دیا۔

www.paksociety.com





کئی دن تک گھر میں بحث چلتی رہی۔ آخرکار ندا کے رشتے کے لیے ہاں کردی گئی۔ اب اس کی شادی کو بھی دو سال ہوگئے تھے۔ منصور حویلی بالکل خاموش ہوگئی۔ ساحرہ جو پہلے ہی کم باتیں کرتی تھی اب وہ مزید کم ہوگئیں۔ کچھ عرصے بعد چچی نصیراں، ساحرہ کے لیے ایک اور رشتہ لائیں۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اماں بی نے ندا کو بھی فون کردیا۔ آنے والے مہمانوں کے لیے اس طرح تیاریاں ہورہی تھیں جیسے ابھی ساحرہ کی شادی ہورہی ہو۔ زرد اور فیروزی کنٹراسٹ سوٹ میں ساحرہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''آپی پلیز! تھوڑی سی بات چیت بھی کرنا، اچھے خوشگوار موڈ میں رہنا۔ خاموش گم صم نہ بیٹھی رہنا۔'' ندا نے یہ بات اسے چوتھی مرتبہ سمجھائی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے ندی۔'' وہ اب جھنجلا گئی۔

''آئے ہائے ندی، کیوں میری بچی کو ستا رہی ہے۔'' اماں نے ندی کو ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی زیادہ بولنا اچھی بات نہیں۔'' اماں نے ساحرہ کی سائڈلی۔

''زیادہ بولنے کو کون کمبخت کہہ رہا ہے اماں بی، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ بالکل خاموش نہ رہنا آپی۔ تھوڑی بات چیت کرنا تھوڑا ہنسی مذاق کرنا ان لوگوں کو اچھا لگے گا۔'' ندا نے ساحرہ کا دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

ساحرہ نے بہ مشکل دو یا تین مرتبہ بات کی ہوگی وہ بھی ندا کے اس دوران بار بار گھورنے پر۔ عثمان عزیز کی فیملی رشتے کے بارے میں فون کر کے بتائیں گے کہہ کر رخصت ہوگئی۔ ایک ہفتے کے انتظار کے بعد مسز عثمان کا فون آیا۔

''کیسی ہیں بہن؟'' شازیہ بیگم نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں اور اماں بی اور آپ کیسی ہیں؟''

''ہم بھی ٹھیک ہیں۔'' شازیہ بیگم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آخرکار شازیہ بیگم نے پوچھ ہی لیا۔

''آپ نے رشتے کے بارے میں کیا سوچا ہے بہن؟''

''میں وہی بتانے لگی تھی۔'' مسز عثمان نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جی جی بتائیں، میں سن رہی ہوں۔'' شازیہ بیگم نے ریسیور کو کان پر دباتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بیٹی پیاری تو ہے مگر مجھے ایسی بہو نہیں چاہیے۔'' مسز عثمان نے ہلکے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شازیہ بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''تو پھر کیسی بہو چاہیے۔'' وہ اگلے ہی لمحے سنبھل گئیں۔

''میرا مطلب یہ ہے۔'' مسز عثمان نے کہا۔ ''میری بہو ایسی ہونی چاہیے جس کے آنے سے گھر میں رونق ہوجائے۔ جس کی باتوں اور ہنسی سے گھر چہک اٹھے مگر آپ کی بیٹی......'' وہ کچھ لمحوں کے لیے رک گئیں۔ شازیہ بیگم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''مگر آپ کی بیٹی تو کچھ بولتی ہی نہیں۔'' وہ پھر بولیں۔ ''بولنا تو درکنار وہ تو کسی بات کا ٹھیک سے جواب تک نہیں دیتی، نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے بس گم صم رہتی ہے۔ معاف کیجیے گا بہن مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے کہیں کوئی اور تو......''

''نہیں، نہیں۔'' شازیہ بیگم نے ٹوک دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے تردید کی۔

''ٹھیک ہے، خیر ہمیں اس سے کیا...... ہماری طرف سے تو انکار ہے۔''

''ایسا نہ کہیے بہن۔'' شازیہ بیگم نے ملتجی

انداز میں کہا۔ ''اس کی عادت ہے وہ شروع ہی سے ایسی ہے۔ آہستہ آہستہ بدل جائے گی۔''

''رہنے دیجیے بہن۔'' دوسری طرف فیصلہ اٹل تھا۔ اس لیے اگلے ہی سیکنڈ فون پٹاخ سے رکھنے کی آواز آئی۔ شازیہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا امی؟'' ندا نے ماں کو اس طرح بیٹھا دیکھا تو سوال کیا۔ ''انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''امی......'' ندا نے اپنی ماں کا بازو جھنجوڑا۔

''مسز عثمان کا فون تھا۔'' ماں نے سر اٹھا کر تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''اوہ...... پھر......'' ندا نے ماں کی حالت دیکھ کر صورتِ حال سمجھتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا...... انکار کر دیا۔'' شازیہ بیگم نے بیمار سی آواز میں کہا۔

''انکار کر دیا!'' ندا نے ماں کی بات زیرِ لب دُہرائی۔ گویا خود کو یقین دلا رہی ہو۔ ''مگر کیوں امی؟'' ندا نے تڑپ کر پوچھا۔

''انہوں نے کہا کہ انہیں گھر کے لیے رونق چاہیے پر ہماری ساحرہ تو ٹھیک سے بات کا جواب بھی نہیں دیتی۔ نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے یوں لگتا ہے کسی چیز کا روگ لگا ہو، اتنی خاموش لڑکی کیسے گھر کی رونق بڑھا سکتی ہے۔'' اپنی ماں کے الفاظ ساحرہ کے کانوں میں بجلی کی طرح گر رہے تھے۔ وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی۔

''میں کہتی تھی اس لڑکی سے تھوڑا بول لیا کر، کیا ساری عمر باوا کے گھر میں ہی رہنا ہے۔'' اماں بی نے چیختے ہوئے کہا۔

''یہی وجہ تھی اماں بی۔'' ندا نے کھڑے ہوتے ہوئے اونچی آواز سے کہا۔ ''جانتے ہیں آپ لوگ میں کیوں بار بار ساحرہ آپی سے کہہ رہی تھی کہ ان لوگوں سے کچھ باتیں کچھ ہنسی مذاق کرنا کیونکہ میں جانتی ہوں ان کے پہلے رشتے کے انکار کی وجہ بھی یہی رہی تھی۔'' ندا نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا۔ شازیہ بیگم اور اماں بی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اندر ساحرہ کے کانوں میں ندا کی آواز بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں آنسو ٹھہر گئے۔

''امی قصور آپی کا نہیں ہے۔'' ندا نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''مگر زمانہ یہ باتیں نہیں سمجھتا ہے بلکہ کچھ اور ہی سمجھتا ہے۔ آپ آپی کو بدلنے کی کوشش کریں۔'' ندا لگاتار بولتی گئی۔

وہ شام منصور حویلی کی باقی شاموں سے زیادہ خاموش اور اداس تھی۔ اگلی صبح سے ہی ساحرہ پہ محنت شروع ہوگئی خود ساحرہ بھی ان حالات سے تنگ آگئی تھی۔ وہ بھی خود کو بدلنا چاہتی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اماں اور شازیہ بیگم سارا دن بغیر کسی وجہ کے ساحرہ سے باتیں کرتیں مگر ساحرہ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس کی شخصیت میں صرف انیس بیس کا فرق آیا۔ وہ جوں کی توں تھی۔ اماں بی اور شازیہ بیگم کچھ اس لیے بھی پریشان تھیں کہ اتنے مہینے گزر گئے ساحرہ کے لیے کوئی بھلا رشتہ نہیں آیا۔

☆☆☆

''روزے آنے والے ہیں۔ اماں بی سوچ رہی ہوں ندا کو رمضان میں یہیں بلوا لوں۔ ساحرہ کا من بھی بٹ جائے گا۔'' شازیہ بیگم نے شائستگی سے اماں سے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اماں بی نے آہستگی سے جواب دیا۔ شازیہ بیگم نے ندا کو فون کیا۔

''ہیلو امی کیسی ہیں آپ؟ اماں بی اور ساحرہ آپی کیسی ہیں؟'' ندا نے شوخ سی آواز میں پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں بیٹا...... اور تمہیں یاد بھی کر رہے ہیں، سوچ رہی ہوں کہ تم رمضان میں یہیں آجاؤ۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''امی میں آپ کو ایک دو دن میں بتاؤں گی اس بارے میں بلکہ ایک بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔'' ندا نے رازدارانہ طریقے سے کہا۔

''ہاں، ہاں، تو کرو، کیا بات کرنی ہے۔'' شازیہ بیگم نے زور دے کر پوچھا۔

''وہ میں آکر بتاؤں گی۔'' ندا نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''اچھا اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا، ٹھیک ہے۔'' انہوں نے دعا دیتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے۔ اماں بی مصلیٰ پر بیٹھی مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں کہ شازیہ بیگم کی خوشی والی آواز گونجی۔

''اماں بی، ساحرہ رمضان کا چاند نظر آگیا۔ رمضان مبارک ہو۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے رمضان کے روزے رکھنے کی سعادت بخشی۔'' اماں بی نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو چھت کی طرف نگاہ چلی گئی۔ ساحرہ خاموش گم صم سی کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اماں بی کا کلیجا منہ کو آگیا۔

''اے اللہ، میرے پروردگار...... میری بچی کا نصیب کھول دے، میری بچی کو ایسا ساتھی عطا فرما جو اسے سمجھ سکے، آمین۔'' اماں بی نے جھکے جھکے ہی مصلیٰ اٹھایا اور تخت پر بیٹھ گئیں۔ تبھی پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ہی فون اٹھایا۔

''ہیلو کون......؟''

''اماں بی میں آپ کی ندی، رمضان مبارک اماں بی۔''

''ارے خیر مبارک بیٹی...... تمہیں بھی مبارک ہو، اب کب آرہی ہو تم؟''

''اماں بی پہلے ایک خوشخبری تو سنیں۔'' ندا نے پُرجوش آواز میں کہا۔

''کیسی خوش خبری بیٹا۔'' اماں بی نے حیرانی سے پوچھا۔

''اماں بی میری ایک دوست ہے شائستہ، اس کی فیملی ساحرہ آپی کو اپنے بیٹے علی کے لیے دیکھنا چاہتی ہے۔''

''شکر الحمدللہ۔'' اماں بی نے فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ خوشی سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اے شازیہ بہو۔'' وہ جب بھی خوش ہوتیں تو شازیہ بہو کہہ کر پکارتیں۔ ''دیکھو یہ اپنی ندی کیا کہہ رہی ہے بھلا۔'' شازیہ بیگم دوڑ کر آئیں۔ ندا سے بات کر کے وہ بھی خوشی سے چہک اٹھیں۔

''ندی تم اب جلدی سے آجاؤ۔'' شازیہ بیگم نے ندا کو پہلی ہدایت جاری کی۔

''ٹھیک ہے امی میں کل ہی آجاؤں گی۔'' ندا نے تابعداری سے کہا۔ ساحرہ تک بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی من ہی من میں بہت خوش ہوئی۔

''کچھ بھی ہو، میں اب اپنی ماں کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بنوں گی۔'' اس نے دل میں ٹھان لی۔

پہلا روزہ تھا۔ ساحرہ ندا کے آنے پر کافی خوش تھی...... پر وہ اپنی خوشی کا اظہار بھی بہت کم کیا کرتی تھی۔ دو تین دن ندا، ساحرہ کے ساتھ مغز خوری کرتی رہی۔

''آپی آپ یہ سوٹ پہننا، آپی آپ خوب بولنا، شائستہ میری دوست ہے اس سے خوب گپ ہانکنا۔ صبیحہ خالہ سے بھی خوب باتیں کرنا کہ وہ بس خوش ہو جائیں۔'' ندا، ساحرہ کو کوئی بیسیوں مرتبہ سبق پڑھاتی۔

''ساحرہ آپی یوں سمجھیں کہ بس آپ کو تھوڑی دیر کے لیے ندا بننے کا ڈراما کرنا ہے کسی طرح۔''

''اچھا ٹھیک ہے بابا۔'' ساحرہ نے مسکرا کر کہا

پانچویں روزے کو ندا نے افطاری پہ شائستہ کی فیملی کو مدعو کیا۔ افطاری کے لیے دوپہر سے ہی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ساحرہ نے بھی خود چکن پکوڑے بنائے۔

''آپی میں نے آپ کے چکن پکوڑوں کی بڑی تعریف کی ہے ان کے سامنے۔'' ندی نے چٹخارے لے کر کہا۔

''اچھا بس بس، ندیدی نہ ہو تو۔'' شازیہ بیگم نے ندا کے کان کھینچے اور پکوڑوں کو ہاٹ پاٹ میں رکھ دیا۔ عصر کے وقت شائستہ کی فیملی منصور حویلی پہنچی۔ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد سبھی لوگ ہال میں بیٹھ گئے۔ آج ساحرہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت اور ذہنی طور پر مکمل تیار تھی۔ شائستہ اس کے پاس آ بیٹھی اور ساحرہ نے ندا کا پڑھایا ہوا سبق ذہنی طور پر دہرایا اور اگلے ہی لمحے ندا کا لبادہ اوڑھ لیا اور ایسا اوڑھا کہ شائستہ کو بھی نہ بولنے دیا۔ وہاں پر بیٹھے سبھی لوگ خوش تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ رشتہ دیکھنے شائستہ نہیں ساحرہ آئی تھی مگر علی جو کچھ دیر پہلے اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا اب گم صم سا بیٹھا تھا۔ ساحرہ کے اس انداز پر سبھی گھر والے حیران تھے۔ ساحرہ نے نہ صرف شائستہ بلکہ اس کی ساری فیملی کے سامنے ایسے بول کر دکھایا جیسے آج اس کی زبان کا امتحان ہو۔ ان کے سوال کیے بغیر ساحرہ نے سب سوالوں کے جواب دے ڈالے۔ پُرتکلف افطاری کے بعد شائستہ کی فیملی کچھ روز بعد دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہوگئی۔ اس دن سے منصور حویلی ساحرہ کی قسمت کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

بارھویں روزے کی شام تھی دونوں ماں بیٹے میں بحث ہو رہی تھی۔

''علی بیٹا آخر کس چیز کی کمی ہے ساحرہ میں، خوب صورت ہے، خوش اخلاق ہے اس گھر میں آئے گی تو رونق ہو جائے گی۔ شائستہ تو اپنے گھر کی ہوگئی ہے اور تم اتنے خاموش رہتے ہو کہ تم سے بات کرنا دیوار پر ٹکر مارنے کے برابر ہے۔'' صبیحہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مما میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ مجھے کم گو لڑکیاں پسند ہیں۔ مجھے میری نیچر جیسی لڑکی چاہیے تھی۔ میاں بیوی اگر ایک مزاج کے ہوں تو ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے نہیں کرنی ساحرہ سے شادی جو ہم سے پہلی ہی ملاقات میں ایک منٹ کے لیے بھی چپ نہیں ہوئی۔''

''یا اللہ!'' صبیحہ بیگم نے کانپتی آواز میں کہا۔

''کیا جواب دوں گی میں شائستہ کو ندا اس کی اتنی پیاری سہیلی ہے اور وہ بچی ساحرہ کتنی آس تھی اس کی آنکھوں میں۔'' صبیحہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایک کے بعد ایک دن گزرتا گیا۔ انیسواں روزہ آ پہنچا۔ منصور حویلی میں اب اس رشتے کی آس بھی دم توڑ گئی تھی۔ اُدھر ماں بیٹے کی تکرار بڑھتی جا رہی تھی۔

''مما آپ نہیں سمجھ رہیں۔ میں خود ان کو جواب دے آؤں گا۔ شائستہ آپی کو بھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' علی نے غصے سے ماں سے کہا۔

''چپ کر نالائق۔'' صبیحہ بیگم ایک بار پھر بگڑ گئیں۔

''جا رہا ہوں میں خود ان لوگوں کو منع کرنے۔'' وہ غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔

منصور حویلی کی اداسی اس وقت کچھ چھٹی جب ندا چاندرات کے لیے منصور حویلی آ پہنچی مگر ساحرہ کے چہرے پر افسردگی پَر پھیلائے کھڑی تھی۔

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ کہتا ہے کہ اب میں کوئی دریا بھی تو دیکھوں





ساحرہ کی نم آنکھیں ندا سے چھپ نہ سکیں۔ ابھی تو ندا نے گھر والوں کو کچھ بتایا بھی نہیں تھا کیونکہ آخری بار شائستہ سے جب اس کی بات ہوئی تو وہ ان کا فیصلہ تقریباً جان گئی تھی۔

''ساحرہ آپی۔'' ندا نے دکھ سے اسے پکارا۔

''میں دروازہ بند کر آتی ہوں پتا نہیں کس نے کھلا چھوڑ دیا۔'' ساحرہ نظر چُرا کر چھت سے نیچے اتر آئی۔

''ساحرہ آپی۔'' ندا اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ''ساحرہ آپی کیا ہوگیا ہے آپ کو؟'' وہ اس کے پیچھے پیچھے گیٹ پر ہی پہنچ گئی۔

وہ خاموش رہی۔

''ساحرہ آپی پلیز کچھ تو بولیے۔'' ندا نے اس کا بازو جھنجوڑا۔

''کیا بولوں ندا؟'' وہ پھٹ پڑی۔ ''کتنی اذیت دے کر، کتنی تکلیف سہہ کر میں نے اپنے آپ کو شائستہ کی فیملی کے سامنے پیش کیا، میں نے اپنی پوری زندگی میں شاید کبھی اتنا نہ بولا ہو اور نہ اب کبھی بولوں گی۔ اپنی فطرت سے لڑ کر ایک ڈراما کیا تا کہ یہ رشتہ طے ہو جائے، میری وجہ سے تم لوگوں کو اور دکھ نہ ملیں۔'' ساحرہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔ ''پر اب مان لو ندا، میرے نصیب میں ہی شادی نہیں ہے۔ اب کم از کم یہ تو ثابت ہوگیا کہ میرے خاموش رہنے کی عادت کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اب میں جیسی ہوں ویسی ہوں اور ویسی ہی رہوں گی۔ اب کسی کو رشتے کے لیے آنا ہے تو آئے اور اگر نہیں آنا تو نہ سہی۔'' ساحرہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ندا...... او ندا۔'' اماں بی کی آواز آئی تو وہ ابھی آئی آپی کہہ کر چلی گئی۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

''ذرا رکیے۔'' ساحرہ کے سامنے وہی چہرہ ابھر آیا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''آپ یہاں؟'' ساحرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''جی میں آیا تو کسی اور مقصد کے لیے تھا مگر اب سمجھ آیا قدرت نے مجھے یہاں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' ساحرہ نے پھر کہا۔

''کوئی بات نہیں، اب تو پوری زندگی پڑی ہے سمجھنے سمجھانے کے لیے، پھر کبھی سمجھا دوں گا۔'' ساحرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایک بات کہوں!'' اس نے پھر کہا۔

''جی!'' ساحرہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''اب آپ کو خود کو بدلنے کی ضرورت نہیں کیونکہ خدا نے مجھے آپ کا نصیب بنا کر بھیج دیا ہے۔'' سفید دوپٹا اس کے سر پر تھا۔ وہ ہلکی ہلکی روشنی میں اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔

''چاند مبارک۔'' گلی سے بچوں کا شور آ رہا تھا۔

''میرے چاند کو بھی چاند مبارک ہو۔'' اس نے ساحرہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ شرما گئی۔

''کیا آپ عیدی کے طور پر اس ناچیز کے ساتھ پوری زندگی گزارنا پسند کریں گی؟'' ساحرہ کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' پیچھے سے زور دار آواز آئی۔ ''میرا مطلب ہے، آپی کیوں نہیں گزاریں گی آپ کے ساتھ زندگی۔'' ندا کی شوخ سی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

''اور علی بھائی...... ایسی عیدی تو آپی کبھی نہ چھوڑیں۔'' ندا نے ساحرہ کو کہنی ماری تو وہ ہڑبڑا گئی۔

یہ عید منصور حویلی کے لیے خوشیاں لائی تھی۔ ساحرہ کی مسکراہٹ اور جھکی نظریں ان دونوں کے ملن کا اعتراف کر رہی تھیں۔



www.paksociety.com

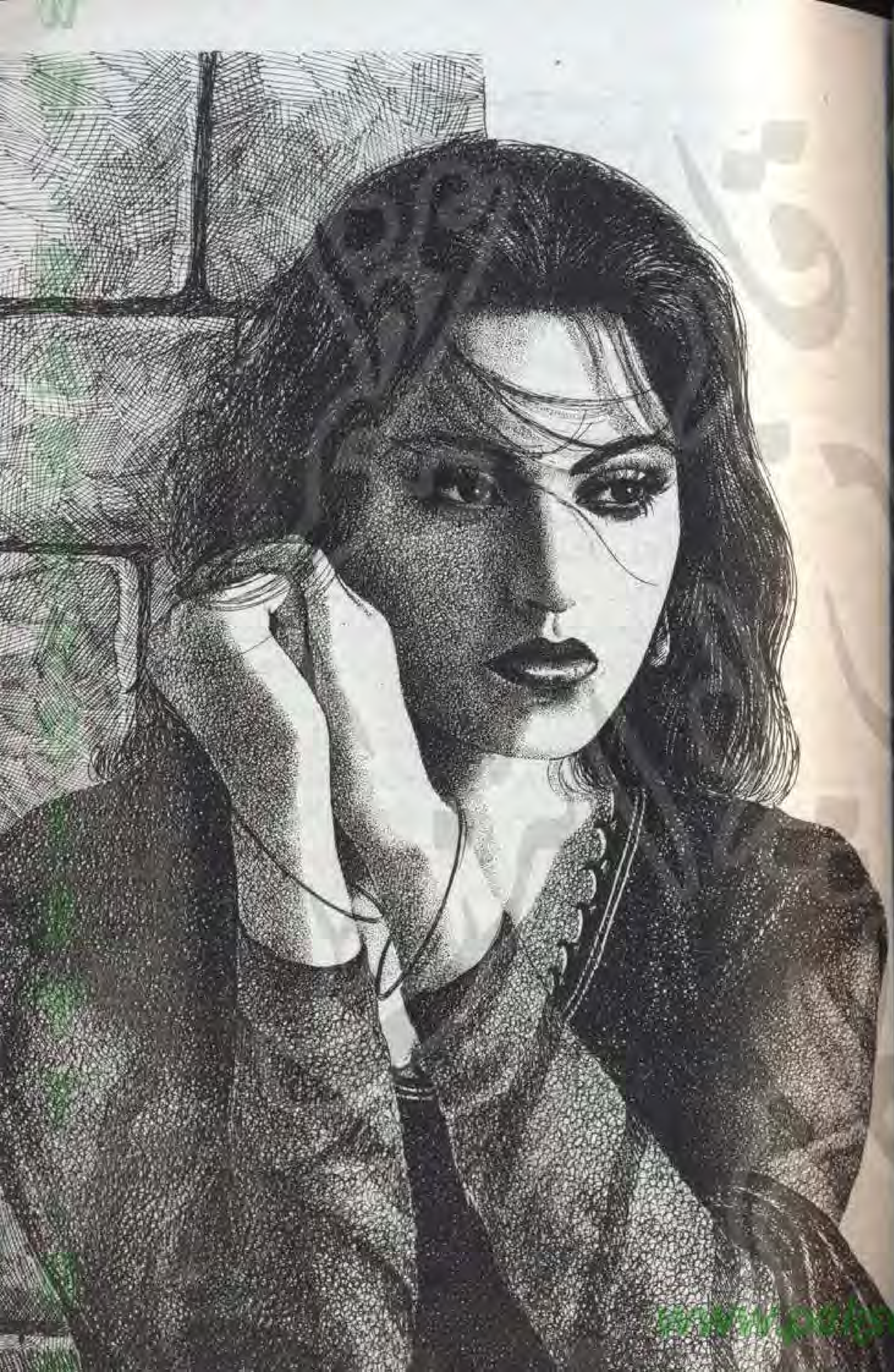

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور رواُبط بہت اہم ہوا کرتے ہیں
...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے
لوگ، بہت سے مواقع ایسے
ضرور ملتے ہیں... جب
محبت دستک دیتی ہے
...اور اس کی خوشبو
میں روشنی کی تابناکی
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ... مکر و فریب
... سفاکی اور تنگ نظری کے
سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی
کبھی ترپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی

# زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

قسط 9

www.paksociety.com

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے۔ آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جارہی تھی۔ نایاب کے دو بیٹے تھے اور بہجت کی ایک بیٹی تھی انعم۔ تسنیم یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی طالبہ تھی مونس فوج میں تھا۔ مدثر، تسنیم کو کورٹ میرج کے لیے زور دیتا ہے، عقیل چھوٹی پر جاتا ہے تو صبور احمد مونس کو عائزہ کی برتھ ڈے کے لیے بلاتے ہیں، تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتادیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جاکر کورٹ میرج کرلیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تسنیم نے کورٹ میرج کرلی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تسنیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ تقدیم، مدثر سے کہتی ہے کہ اگر وہ تسنیم کو بھیج دے تو وہ لوگ اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ لوگوں کو بلا کر اس کی رخصتی کردیں گے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تسنیم کو بھیجنے کی حامی بھرلیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہوگئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آجائیں۔ حجاب سیمہ سے کہتی ہے کہ وہ الطاف سے اپنا رشتہ ختم کردے گی، گھر والے حجاب کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔ تسنیم گھر واپس آکر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تسنیم مدثر سے کہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آجاتے ہیں اور بسمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کاکول آگئے۔ زیتون ان کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ الطاف، حجاب کو راستے میں روک کر اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر حجاب رکشے میں اسکول چلی جاتی ہے۔ زیتون بیگم عباد کی امی کو آکر بتاتی ہیں کہ عباد نے جہیز کی لسٹ بنا کر بھیجی تو ان لوگوں نے رشتے سے انکار کردیا۔ ابا پریشان ہوتے ہیں کہ مدثر نے ابھی تک کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔ مدثر پریشان تھا کہ ڈیڈی نے وہاں جانے سے منع کردیا تھا۔ تسنیم، مدثر سے بات کرتی ہے تو مدثر کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتادے گا۔ تقدیم اور ابا مونس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فیملی کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مونس گھر آتا ہے تو اماں چاہتی ہیں کہ خوش بخت سے اس کا رشتہ طے کردیں لیکن مونس انہیں ٹال دیتا ہے۔ تقدیم سمجھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی عائزہ ہے جس کی وجہ سے مونس انکار کررہا ہے۔ وہ مونس سے بات کرتی ہے تو مونس کو یہ ڈھارس ہوجاتی ہے کہ اس معاملے کو اب تقدیم سنبھال لے گی۔ تقدیم اماں کو بتادیتی ہے کہ مونس، عائزہ میں انٹرسٹڈ ہے اس لیے وہ خوش بخت کا خیال دل سے نکال دیں۔ عباد اچھی جگہ شادی کرنے کے لیے شادی دفتر میں اپنا اندراج کراتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ مدثر، تسنیم کو طلاق بھجواتا ہے بذریعہ رجسٹری تو مونس کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے، تسنیم، مدثر کو فون کرتی ہے تو وہ فون ریسیو نہیں کرتا اور میسج کے ذریعے بتاتا ہے کہ ڈیڈی راضی نہیں ہوئے اس لیے طلاق دینی پڑی۔ مونس، مدثر کا ایڈریس پوچھتا ہے تاکہ اس سے طلاق کی وجہ پوچھ سکے لیکن تسنیم اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کردیتی ہے۔ الطاف امی کو دھمکی دیتا ہے اب وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کردے گا۔

اب آگے پڑھیں۔





مونس کے تسنیم کو دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کرنے کے مشورے پر اماں نے اپنے تحفظات کا اظہار مونس کے جانے کے بعد کیا۔ ''طلاق ہوئی ہے کوئی مذاق نہیں۔ عدت لاگو ہوچکی، اسے گھر بیٹھ کر عدت کرنی چاہیے۔'' اماں نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔'' ابا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے نہایت دل گرفتگی سے کہا۔ ''لیکن یہ کتنی عجیب اور افسوس کی بات ہے کہ نہ ہم بیٹی کے نکاح کا اعلان کرپائے نہ رخصتی ہوئی اور...... وہ طلاق یافتہ بھی ہوبیٹھی۔''

''قسمت!'' اماں نے ایک سرد آہ کھینچی۔

''بدقسمتی کہو تقدیم کی ماں بدقسمتی...... اس کی بھی اور ہماری بھی۔'' ابا دکھ سے بولے۔

''غلطی ہم سے بھی ہوئی...... اچھے بھلے دو تین رشتے آئے اس کے لیے...... کردیتے تو آج عزت سے اپنے گھر بیٹھی ہوتی اور ہم بھی چین سے ہوتے۔''

''کیسے کردیتے...... اس سے بڑی دو اور بھی تو بیٹھی تھیں۔''

''یہی تو غلطی ہوئی ہم سے کہ ہم پہلے بڑی کی ضد پر اڑے بیٹھے رہے۔ بیٹیوں والوں کو چاہیے کہ جب گھر میں شادی کے لائق ایک سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو جس کا پہلے مناسب بر ملے اس سے نمٹ لیں۔'' اماں نے کہا۔

''تقدیم کی ماں وہ پڑھ بھی تو رہی تھی۔'' ابا نے پچھتاوے کو تاویل دینے کی کوشش کی۔

''پڑھتی رہتی اپنے گھر جاکر۔''

''ماں باپ یہ بھی تو سوچتے ہیں کہ بیٹیوں کو اتنا پڑھا لکھا کر ان کے گھر بار کا کریں کہ خدانخواستہ کوئی سخت وقت آپڑے تو وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں، دوسروں کی محتاج اور دست نگر نہ بنیں۔'' ابا نے جوازِ خطا پیش کر کے اماں کا ملال کم کرنا چاہا۔

''یہ تو ہم، آپ جیسے لوگوں کی سوچ ہے آخر پرانے وقتوں میں بھی تو لوگ ان وسوسوں میں پڑنے کے بجائے تیرہ تیرہ چودہ چودہ سال کی بچیوں کو بیاہ ہی دیتے تھے۔ وہ خوش بھی رہتی تھیں...... خود بھی ہاتھ پیروں کی مضبوط ہوتیں کہ ان کے بچے بھی جوان ہوجاتے...... طلاق سیکڑوں ہزاروں میں کسی کسی کو ہوتی اور وہ بھی کسی بہت بڑی وجہ پر۔ آج کل کی طرح کھیل نہ تھا کہ ذرا سی بات ہوئی اور طلاق...... پہلے وقتوں میں تو جس گھر کی لڑکی کو طلاق ہوتی تھی اس گھر میں ہی نہیں خاندان کے خاندان میں اور آس پڑوس کے دس گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی۔ لوگ میت کی طرح طلاق کا بھی پرسا دینے آتے۔'' اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''قدریں بدل گئیں تقدیم کی ماں۔''

''قدریں تو آج بھی وہی ہیں۔ ہم انسان شیطان کے چنگل میں زیادہ پھنس گئے۔ کہتے ہیں حلال کاموں میں طلاق سب سے بُرا فعل ہے۔ اس مردود کو دیکھو اس نے نکاح کو بھی مذاق سمجھا اور طلاق کو بھی کھیل...... کچہری لے جاکر ہماری لڑکی سے نکاح پڑھا لیا اور گنتی کے دن اسے رکھ کر طلاق کا طمانچہ کھینچ مارا۔ خدا اسے غارت کرے۔'' اماں کی آواز بھرا گئی۔ ''اور ہم ایسے مُردار اتنے کمزور کہ ہم نے اُف تک نہیں کی۔ نصیب کا لکھا سمجھ کر چپ ہو رہے۔'' اماں ہاتھ مسلنے لگیں۔

''اور کر بھی کیا سکتے تھے۔'' ابا نے دل شکستگی سے کہا۔

''کر کیا سکتے تھے۔'' اماں نے ان کے الفاظ تلخی سے دُہرائے۔ ''مونس کے سامنے تو میں اس لیے چپ رہی کہ ایک ہی میرا بچہ...... جوان خون...... جوش اور غیرت میں آکر کوئی بڑا قدم اٹھا بیٹھے تو میں کس کی ماں کو



www.paksociety.com

ماں کہوں گی۔ اب جب وہ چلا گیا ہے تو میرا جی چاہتا ہے جاؤں اس کمینے کے گھر اور اس کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھوں کہ کیا اس لیے پیدا کیا تھا تیرے ماں باپ نے تجھے کہ تو دوسروں کی عزت خاک میں رولتا پھرے۔"

"فائدہ؟"

"فائدہ!" اماں کو ابا کے سوال پر تعجب ہوا۔ "تقدیم کے ابا! غلطی بے شک ہماری اپنی بیٹی کی بھی ہے مگر اس کی بربادی پر میرے سینے میں آگ سی بھر گئی ہے۔ وہ اپنے گھر میں آباد کر لیتا اسے تو شاید اتنا دکھ، اتنا صدمہ نہ ہوتا مجھے جتنا کہ اب ہے۔ اسے کٹی پٹی دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں میں اور آپ چلیں...... چل کر ایک مرتبہ بات تو کریں اس سے اور اس شیطان کے ماں باپ سے۔" اماں نے یک گونہ بے تابی سے کہا۔

"کیا بات کرو گی؟"

"یہی کہ اس خبیث نے ہم سے کس بات کی دشمنی نکالی۔"

"وہ کہیں گے آپ کی بیٹی دودھ پیتی بچی تھی کیا؟"

"دودھ پیتی نہیں تھی مگر لڑکی ذات ہونے کے ناتے عقل کی کچی تھی...... اس سے نکاح کے بعد اس مردود کے رحم و کرم پر تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ عزت سے نباہتا...... اس نے تو کھیل سمجھا...... ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسوں کا گریبان نہ پکڑا جائے تو ان کا ہیاؤ بڑھ جاتا ہے۔ ان جیسے دس اور حوصلہ پاتے ہیں۔ اس کا اور اس کے گھر والوں کا کیا بگڑا ہم ہی مٹ رہے ہیں۔"

"کیا پتا اس نے اپنے ماں باپ کو بتایا بھی کہ نہیں۔" ابا بولے۔

"ارے کیوں نہ بتایا ہوگا...... اور نہ بھی بتایا ہو تو ایسے لفنگوں کے لچھن ماں باپ سے چھپے ہوتے ہیں بھلا...... انہیں اولاد کے گن اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹیوں اور بیٹے کی اچھائیوں، برائیوں کا علم نہیں ہے کیا...... تسنیم کا ہمیں پتا تھا کہ نہیں کہ اسے صرف اپنی پروا ہے۔"

"کبھی کبھی ماں باپ کے اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں تقدیم کی ماں...... مونس کے بارے میں ہم کبھی سوچ سکتے تھے کہ وہ ہم دونوں کی خواہش کو ٹھکرا کر کسی اور لڑکی کو پسند کر بیٹھے گا۔"

"ارے نہ چھیڑیں میرے دل کے زخموں کو...... ان کم بختوں نے پھنسا لیا میرے بچے کو۔" اماں نے کرب سے کہا۔

"وہ بھی یہی کہیں گے۔ ہمارے بیٹے کو پھنسا لیا تھا۔" ابا ماندے لہجے میں بولے۔

"خدا بیڑا غرق کرے اس مردود کا۔ لڑکی کو برباد کر گیا۔" اماں نے مدثر کو کوسا۔

"ایسے لوگوں کو نہ اپنا بیڑا غرق ہونے کی فکر ہوتی ہے نہ دوسروں کی عزت کا پاس...... اللہ پر چھوڑ دو وہی انصاف کرے گا۔"

"وہ تو انصاف کرے گا ہی مگر کچھ تو ہمیں بھی کرنا لازم ہے، یوں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جانا تو بزدلی ہے۔"

"تمہارے خیال میں بہادری کیا ہوگی؟"

"اس کے منہ پر تھپڑ مارنا...... تھوکنا اس کے منہ پر۔" اماں کا لہجہ جارحانہ تھا۔

"برائی کو جتنا کریدو اسی قدر باس اٹھتی ہے۔ تم یہی چاہتی تھیں نا کہ لوگوں کو اس بات کا پتا نہ چلے...... لڑکی جس خاموشی سے گھر سے گئی تھی اسی خاموشی سے واپس آ کر بیٹھ گئی۔ تم اس کی رخصتی بھی دنیا دکھاوے کو ہی کرنا چاہتی تھیں تا...... سمجھ لو کچھ ہوا ہی نہیں۔"





"کیسے سمجھ لوں تقدیم کے ابا......" اماں روہانسی ہو گئیں۔

"صبر کرنا پڑے گا تقدیم کی ماں۔"

"اے اللہ......" اماں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو باہم مسلتے ہوئے انتہائی بے بسی سے آسمان کے رخ پر دیکھا۔ "کیسی بے بسی ہے، کیسی لاچاری کہ اتنا بڑا ظلم کر گیا وہ ہمارے ساتھ اور ہم اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ فریاد بھی نہیں کر سکتے۔" اماں رو دیں۔

"کس سے کرو گی فریاد!" ابا بولے۔

اماں چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"پولیس، تھانہ کچہری!" ابا نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھانے جاؤ گی تو پولیس تماشا بنا لے گی، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گی تو...... پتا چلے گا وکیلوں اور ججوں کی درونِ خانہ دوستیاں ہوتی ہیں، ان کے آپس کے تعلقات تگڑی پارٹی کو اس کی مرضی کا فیصلہ دلواتے ہیں۔ یہاں انصاف بھی بکتا ہے تقدیم کی ماں...... دوسری بات یہ ہے کہ تھانے کچہری جاؤ گی تو جو بات تم لوگوں سے چھپانا چاہتی ہو وہ الم نشرح ہو جائے گی۔"

"تھانے کچہری جانے کی بات کون کر رہا ہے۔"

"تو پھر......؟"

"اسے ذلیل کرنے کی بات کر رہی ہوں، رہ رہ کر ہوک سی اٹھتی ہے میرے سینے میں۔"

"اللہ ذلیل کرے گا اسے۔"

"رہی بات...... بات کھلنے کی...... تو ایسی باتیں چھپتی کب ہیں تقدیم کے ابا...... میں نے جو یہ چاہا تھا کہ وہ ایک بار تسنیم کو ہمارے گھر سے عزت سے رخصت کر کے اپنے گھر لے جائے...... اسی لیے کہ بات چھپی نہیں رہے گی، لوگوں کو ہنسنے کا موقع نہ ملے اور اب بھی بات چھپے گی تو نہیں۔"

"دعا کرو کہ بات کھلنے سے پہلے ہماری باقی بچیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں۔" ابا نے کہا۔

"ارے تقدیم کے ابا بچیاں اپنے اپنے گھر کی ہو بھی جائیں تو بات کھلنے پر ان کے شوہر، ان کی سسرالیں انہیں کچوکے دیے بغیر تھوڑی رہیں گے۔" اماں نے کہا۔ "یہ تو اللہ ہی ہے جو بندوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے بندے تو طعنے دے دے کر ہی مار دیتے ہیں انسان کو۔"

"انسان کو اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔" ابا آج پوری طرح اماں کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش میں تھے۔ مگر اماں کے دل کو تو گویا بے طرح لگی تھی۔

"آج نہیں تو کل جب کسی بھلے مانس کے ساتھ ہم اس بدنصیب کو بھی آباد کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ بات اسے بھی بتانی ہی پڑے گی۔" اماں کے لہجے سے حد درجہ تفکر جھلک رہا تھا۔ "ساری دنیا سے یہ بات راز رکھی جا سکتی ہے مگر اس سے نہیں جس سے ہم تسنیم کا نصیبہ جوڑنے کی کوشش کریں گے...... اسے بتانا ہوگا اور لازماً بتانا ہوگا ورنہ...... دھوکا۔"

"جب وقت آئے گا دیکھ لیں گے...... اللہ سے اچھی امید رکھو۔" ابا نے اماں کو تسلی دی۔ "دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں...... اعلیٰ ظرف لوگ دوسروں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں...... کیا پتا تسنیم کے لیے کوئی اتنا اچھا آدمی مل جائے جو سب کچھ پتا چل جانے کے بعد بھی زبان پر کبھی ذکر نہ لائے اس ساری بات کا۔"

اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تسنیم کیسی ہی ناخلف اور کتنی ہی خطاوار سہی ان کی اولاد تھی۔ اس کی بربادی کا صدمہ انہیں نیم جان کیے دیتا تھا۔ کسی اپنے پرائے سے دل کا دکھ کہہ سن بھی نہ سکتی تھیں۔ گھر میں شوہر سے کس

www.paksociety.com

حد تک دل کی بات کہتیں بیٹا دور تھا۔ رہیں بیٹیاں تو وہ بے چاریاں تو اس واقعے کے بعد سے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنی ہراساں دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ اس طرح جیسے چوکڑیاں بھرتے ہرنوں کے غول میں کسی ایک کے شکاری کے نشانے سے گھائل ہو جانے کے بعد باقی سب ڈرے سہمے اِدھر اُدھر چھپتے چھپاتے پھر رہے ہوں۔ بس ایک تقدیم تھی جو ہمت کر کے اماں کا دکھ بٹانے ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ اماں نے اسی سے کہا۔

''یونیورسٹی کیسے جاسکتی ہے وہ...... طلاق کے بعد عدت میں آجاتی ہے عورت۔''

تقدیم نے بے ساختہ چونک کر اماں کی جانب دیکھا۔ گھر بیٹھی اماں کتنی دور کی بات کرتی تھیں۔ گھر میں کسی اور کا تو شاید دھیان نہیں گیا ہوگا اس طرف...... بس یہ تھی وہ دور اندیشی جو اماں کے شعور و ادراک اور زندگی کے گہرے تجربے کے سامنے ان کی اولاد کو بونا بنا دیتی تھی۔

تسنیم سے اماں نے خود تو نہ کہا کہ بات دل دکھانے والی تھی۔ ان کے ایما پر تقدیم نے اسے یہ پیغام دیا تو وہ چند ثانیے پتھرائی نگاہوں سے اس کا منہ تکتی رہی پھر پلک جھپکتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ کیسا عجیب دکھ تھا کہ اپنا درد کسی سے بٹانے کے لیے وہ اپنے نہایت خونی رشتے سے بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی جو سہنا تھا اسے اپنے اندر سہنا تھا اور خدا جانے کتنی دیر اور کتنی دور تک۔

☆☆☆

حجاب کو امی کی سپورٹ کیا ملی وہ تو جی اٹھی۔ الطاف سے چھٹکارے کے لیے لڑنے کا حوصلہ دو چند ہو گیا۔ وکیل سے رابطہ اور حجاب کی طرف سے الطاف کے خلاف عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کرنے سے قبل امی نے ایک مرتبہ الطاف سے بات کر لینا ضروری سمجھا۔

''میں ہار گئی بیٹا...... حجاب نہیں سنتی۔'' انہوں نے الطاف سے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم بھی اٹکے نہ بیٹھے رہو۔''

''آپ کا مطلب ہے طلاق دے دوں؟''

''ظاہر ہے...... حالانکہ اس میں ہمیں اپنے عزیزوں، رشتے داروں کے سامنے بہت شرمندگی اٹھانی پڑے گی لیکن مجبوری...... عورت اور مرد کا رشتہ محبت سے چلتا ہے زور زبردستی سے نہیں۔''

''آنٹی جی یہ تو آپ بھول جائیں کہ میں اسے آسانی سے فارغ کر دوں گا۔''

''آسانی سے یا مشکل سے...... جب وہ یہ رشتہ برقرار ہی نہیں رکھنا چاہتی تو تمہیں بہرحال فارغ تو کرنا پڑے گا اسے۔'' امی کو اپنا لب و لہجہ بدلنا پڑا۔

''فارغ!'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''اتنا ذلیل کر دوں گا اسے کہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں رہے گا...... خود ہاتھ باندھے میرے پاس آئے گی وہ۔''

''ضد باندھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' امی نے پھر نرمی اختیار کی۔

''یہ بات تو آپ کو اپنی بیٹی کو سمجھانی چاہیے تھی۔''

''تمہیں کیا پتا کتنا سمجھایا۔''

''اوکے...... اوکے...... اب آپ تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں۔'' الطاف کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

دعوے داری کے لیے الطاف سے پہلے کچہری جانا لازم ٹھہرا۔ وقت ضائع کیے بغیر امی حجاب کو ساتھ لے کر کورٹ گئیں۔ ایک خاتون وکیل سے ملیں۔ معاملات ادائیگی طے کیے۔ دعویٰ تیار کرایا اور حجاب کی طرف سے دن میں الطاف کے نام خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔

www.paksociety.com

الطاف جو خود مدعی بننے کے پر تول رہا تھا عدالت سے اپنے نام پروانہ طلبی پر بھونچکا رہ گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنی مستعدی دکھائیں گے آخر اتنے دن سے بھی تو معاملہ کبھی گفت و شنید، کبھی خاموشی پر چل رہا تھا۔ فریق مخالف کی جانب سے اس تعجیل کی توقع نہیں تھی اسے۔ عدالت سے پروانہ طلبی ملتے ہی اس نے امی کو فون کیا۔

''یہ کیا کیا آپ لوگوں نے آنٹی؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''کیا بیٹا؟'' امی نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''آپ لوگ کورٹ چلے گئے اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔''

''اچھی بات تو نہیں تھی بیٹا جو ذکر کرتی...... نہ حجاب مانتی ہے نہ تم پیچھے ہٹنے کو تیار، کوئی راستہ تو نکالنا تھا۔''

''دیکھتا ہوں کیسے نکلتا ہے راستہ۔''

''خلع عورت کا حق ہے۔''

''دیکھوں گا کیسے لیتی ہے وہ اپنا حق...... چہرہ بگاڑ دوں گا اس کا...... جس خوب صورتی پر ناز ہے وہی نہیں رہے گی...... منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی وہ کسی کو۔''

امی خوفزدہ ہو گئیں۔ ضد اور انتقام پر آئے مرد کا کیا اعتبار...... کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تاہم انہوں نے الطاف پر اپنے خوف کا اظہار کیے بغیر بڑی بے جگری سے کہا۔ ''دھمکیاں مت دو الطاف۔''

''اسے دھمکی نہ سمجھیں۔ میں وہ کروں گا جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''کیا! کیا کر لو گے۔'' امی کو بھی تاؤ آ گیا۔

''یہ تو آپ کو وقت بتائے گا۔''

حجاب اسکول سے گھر واپس لوٹی تو امی نے اسے الطاف کی فون کال کے بارے میں بتایا اور بہت محتاط رہنے کی تلقین کی۔

''آپ فکر نہ کریں امی...... انشاء اللہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا وہ۔''

''احتیاط اچھی بات ہے...... مرد ذات کا کوئی اعتبار نہیں۔''

''ایسی بات نہیں امی...... سارے مرد نا قابلِ اعتبار نہیں ہوتے...... آخر میرے بابا بھی تو تھے۔''

''ارے ان کی کیا بات کرتی ہو...... وہ تو فرشتہ صفت مرد تھے۔ ہر عورت کا احترام کرتے...... بی بی جان سے ان کا دل نہیں ملتا تھا مگر مجال ہے کبھی ان کی کوئی برائی کی ہو۔ تمہارے باپ کے تو پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے الطاف۔''

''آپ کو اچھی طرح معلوم تھا امی کہ ہم تینوں بہنیں اپنے باپ کو آئیڈیلائز کرتی ہیں پھر کیوں آپ نے ایسے شخص سے میرا رشتہ جوڑ دیا۔''

''بیٹا! میں کون ہوتی ہوں رشتہ جوڑنے والی...... رشتے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ ہم زمین پر رہنے والے تو بس ایک وسیلہ ہوتے ہیں رشتہ جوڑنے کے...... ویسے مجھے الطاف کی دھمکیوں سے بھی زیادہ بہجت کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اسے پتا چلا کہ ہم لوگ کورٹ میں چلے گئے ہیں تو وہ ناراض ہو گا۔''

''پتا تو ضرور چلے گا انہیں۔''

''ہاں کوئی چھپنے والی بات تو ہے نہیں۔''

☆☆☆

www.paksociety.com

بہجت بھائی کو الطاف ہی کے ذریعے پتا چلا۔ وہ غصے میں لال پیلے ہوئے امی کے پاس پہنچے۔ ''یہ کیا کر رہی ہے حجاب؟'' انہوں نے امی سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''آپ کو اچھی طرح معلوم ہے...... الطاف نے آپ سے بات کرنے کے بعد ہی مجھے فون کیا...... کیوں خاندان کی عزت سے کھیل رہی ہے وہ۔''

''خاندان کی عزت سے کھیلنے کی کیا بات۔'' امی کو بیٹے کی بات اچھی نہ لگی۔ ''الطاف کا کہنا ہے کسی قیمت پر طلاق نہیں دے گا...... تو پھر وہ بے چاری کیا کرتی۔''

''اس سے پہلے ہمارے خاندان کی کوئی عورت گئی ہے کورٹ؟''

''ہوسکتا ہے گئی ہو۔''

امی کے جواب پر بہجت بھائی نے بلبلا کر انہیں دیکھا اور اپنی انگلی ان کی طرف اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''آپ شہ دے رہی ہیں اسے۔''

''ماں ہوں اس کی...... ظاہر ہے اسی کا ساتھ دوں گی۔''

''چاہے وہ خاندان کے منہ پر کالک مل دے۔''

''کس خاندان کی بات کرتے ہو بیٹا۔ جس کی عورتیں پہاڑوں کے دامن میں مویشی چراتے چراتے خود بھی ممیانے لگتی ہیں یا ان مردوں کی جو تعلیم سے نابلد اور تہذیب سے نا آگاہ ہیں۔ عورت کو کمتر سمجھتے ہیں۔ غیرت کے نام پر اسے جانور کی طرح ذبح کردیتے ہیں۔ میرا خاندان تو بس تم میرے چاروں بچے ہو۔''

''میں اپنی بات ہی کر رہا ہوں۔''

''تو پھر تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کیونکہ تم ماشاءاللہ ایک پڑھے لکھے آدمی ہو، مرد کے ساتھ عورت کے حقوق سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو...... میں نے تمہیں اور تمہاری بہنوں کو تعلیم اسی لیے دلوائی کہ میں تمہیں گاؤں میں بسے تمہارے بابا کے خاندان والوں کی سی زندگی نہیں گزارنے دینا چاہتی تھی۔ جہاں ایک کمسن بچے کا اس کی ماں برابر بیوہ بھابی سے نکاح پڑھا دیا جاتا ہے اور وہ بے چارہ ساری زندگی شرمساری کے ساتھ اس رشتے کو برقرار رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔'' امی نے توقف کے بعد مزید کہا۔ ''حجاب کو اس کی مرضی کے برخلاف ایک شخص سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے پر مجبور کرکے میں اس تاریخ کو دوبارہ نہیں دہرانا چاہتی۔''

''آپ لوگوں نے خوامخواہ کا ایشو کھڑا کر رکھا ہے۔ مرد کی دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں...... وہ ہر شرط ماننے کو تیار ہے۔ دبئی میں اپنا ولا حجاب کے نام کرنے کو کہتا ہے۔ پہلی بیوی سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہتا ہے طلاق دے دوں گا اسے۔''

''بیٹا حجاب کو کچھ نہیں چاہیے...... کوئی لالچ اسے نہیں للچا سکتا۔''

''پچھتائے گی۔''

''اب جو بھی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' بہجت بھائی تنتنا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''تو پھر آپ دیں اپنی بیٹی کا ساتھ...... مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا آپ کا۔''

''اچھے بیٹے ہو۔'' امی نے انہیں شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ''ماں کو قطع تعلقی کی دھمکی دے رہے ہو...... ماں سے تعلق توڑتے بہت اچھے لگو گے۔''





''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں...... حجاب نے خوامخواہ کی ضد باندھ لی ہے۔ مرد تو پہلی بیوی کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے بھی دوسری شادی کرسکتا ہے...... وہ تو پہلی کو رکھنا ہی نہیں چاہتا۔'' بہجت بھائی خفیف ہوگئے۔

''بیٹا بحث اس سے نہیں...... مسئلہ یہ ہے کہ حجاب اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہے اور خُلع اس کا حق ہے۔''

بہجت بھائی کے چہرے کے خطوط تن گئے۔ ''میں چلتا ہوں۔'' انہوں نے ہیجانی کیفیت میں کچھ اس انداز سے کہا جیسے دوبارہ کبھی اس گھر میں نہ آنے کا کہہ رہے ہوں۔

☆☆☆

الطاف کی بہنوں اور بہنوئیوں نے اسے سمجھایا۔ ''چھوڑو...... دفع کرو...... خُلع مانگ رہی ہے تو دے دو...... مہر دینے سے بچو گے۔'' ایک بہن نے کہا۔

''اور کیا......'' دوسری بہن نے تائید کی۔ ''جو لڑکی تمہارے گھر آنے سے پہلے اپنے رنگ دکھا رہی ہے اگر آ بھی گئی تمہارے گھر تو بعد میں نہ جانے کیا تماشے دکھائے گی۔''

''اپنے گھر والوں کے قابو میں نہیں آئی وہ۔'' پہلی بہن کے شوہر نے کہا۔ ''حالانکہ بھائی بے چارہ کتنا بھلا مانس ہے۔''

''جاب کرنے والی لڑکیاں عام طور پر ایسی ہی مُنہ زور ہوتی ہیں۔'' دوسرے بہنوئی نے بھی رائے زنی کی۔

الطاف چپ چاپ سنتا رہا۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی!'' چھوٹی بہن نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپکا۔

''سن رہا ہوں۔'' الطاف نے خاموشی توڑی۔

''سن رہے ہو تو عمل بھی کرو۔''

''ہاں......'' چھوٹے بہنوئی نے تائید کی۔ ''ہم تمہارے ہمدرد ہیں الطاف بھائی، تمہیں پریشانی میں نہیں دیکھنا چاہتے...... اگر زور زبردستی سے یا اپنے گھر والوں کے مجبور کرنے پر وہ رخصت ہوکر تمہارے گھر آ بھی جاتی تو اس نے بسنا نہیں تھا تمہارے گھر میں۔''

''مجھے تو دال میں کچھ کالا دکھائی دیتا ہے۔'' دوسرے بہنوئی نے معنی خیز لہجے میں خیال آرائی کی۔

الطاف نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا؟'' دوسرے نے ہم زلف کو دیکھا۔

''لگتا ہے اس کا یا تو کسی اور سے چکر چل گیا ہے یا پھر پہلے سے ہی چکر تھا یہاں مال دولت دیکھ کر وہ پھسل گئی مگر اب اُسی طرف جانا چاہتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' ہم زلف نے ہم زلف کی تائید کی۔

الطاف کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ بہنوئی کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

''خلع دے کر جان چھڑاؤ اپنی...... ایک پاؤں تمہارا یہاں ہوتا ہے تو دوسرا دبئی میں...... ایسا نہ ہو دبئی میں تمہارا بزنس متاثر ہو۔''

''میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' الطاف نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''محبت ہوگئی ہے اس سے۔'' بہن اسے خواہرانہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ضد آگئی ہے مجھے بھی۔'' الطاف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''عورت اور اتنی مُنہ زور۔''



www.paksociety.com

☆☆☆

عائزہ اور اس کے گھر والے خوش تھے کہ مونس کو اپنے گھر والوں کی طرف سے کسی قابلِ ذکر مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ عائزہ سے اس کی فون پر روزانہ ہی بات چیت رہتی تھی بلکہ اکثر تو دن میں کئی کئی بار، عائزہ خوش تھی کہ وہ کراچی سے بحفاظت منگلا پہنچ گیا تھا۔

"اسلام آباد کب آؤ گے مونس؟" عائزہ نے منگلا سے مونس کی پہلی فون کال وصول ہونے پر بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"ابھی تو پہنچا ہوں...... نوکری شروع کرنی ہے یار۔"

"نوکری مت کہو مونس...... وطن کے دفاع سے وابستہ لوگ تو ایک مشن پر ہوتے ہیں۔"

"آئی فیل امپورٹنٹ۔"

"وہ تو تم ہو...... آئی ایم سو ہیپی مونس کہ تمہارے گھر والوں نے بقول تمہارے ریزسٹ نہیں کیا۔"

مونس کو اماں کی خفگی یاد آئی۔ منگلا آنے سے قبل کراچی میں آخری رات جب اس نے اپنی پاسنگ آؤٹ کی ٹریٹ کے بہانے تمام گھر والوں کو اکٹھے بٹھایا اور اس طویل نشست کے اختتام پر جب ابا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ آئندہ زندگی میں ان بھائی بہنوں میں سے کوئی بھی اماں اور ابا کو کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا تو اماں نے کتنے کرب سے اس سے گلہ کیا تھا کہ شکایت کا موقع تو وہ دے چکا تھا۔ تسنیم کے گمبھیر مسئلے نے پورے گھر کو اپنے شکنجے میں نہ جکڑ رکھا ہوتا تو کیا عجب کہ اماں نے اس شدت کے ساتھ مخالفت کی ہوتی کہ اسے عائزہ اور اپنے گھر والوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑ جاتا۔ بہت سخت آزمائش میں پڑ جاتا وہ۔

☆☆☆

تسنیم کا امید سے ہو جانا مرے پر سو دُرّے کے مصداق تھا۔ ابا نے ہمیشہ کی طرح ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

"لوگ تو نکاح اور طلاق کا بھی اعتبار نہیں کریں گے تقدیم کی ماں...... تہمت لگاتے کتنی دیر لگتی ہے یہاں لوگوں کو۔" ابا بولے۔

"بیٹھے بٹھائے نئی مصیبت!" اماں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ کچھ دیر موت کا سناٹا چھا گیا پھر اماں کی تھکی تھکی سی آواز نے اس سناٹے کا سینہ چیرا۔ "دو ہی راستے ہیں۔"

ابا چونک کر سوالیہ نگاہوں سے اماں کی جانب دیکھنے لگے۔

"یا تو اس قصے کو کسی طرح ختم کرا دیا جائے......"

"تمہارا مطلب ہے......؟" ابا نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں...... میرا وہی مطلب ہے۔"

"مگر گناہ تقدیم کی ماں۔" ابا نظریں جھکا کر بولے۔

"مجبوری...... اپنی عزت بچانے کو انسان نہ جانے کیا کچھ کر جاتا ہے۔"

"دوسرا راستہ؟" ابا کی آواز...... جیسے اندھیرے میں راستہ ڈھونڈنے کی کوشش تھی۔

"ان کم بختوں سے رابطہ کر کے کہا جائے کہ ہماری لڑکی کو تو ان کے بیٹے نے بے دردی سے برباد کر کے رکھ دیا۔ اب اپنے بیٹے کی اولاد کو تو ذلت سے بچائیں...... ایسے تو لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"





"ایک کے بعد دوسری آزمائش۔" ابا خود کلامی کے عالم میں بڑبڑائے۔

"اللہ کی مصلحتیں وہی جانے تقدیم کے ابا...... مونس بے چارہ تو بہن کو یونیورسٹی جانے اور دوبارہ اپنی تعلیم شروع کرنے کو کہہ گیا تھا مگر اسے بٹھانا تھا عدت میں...... اب یہ نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ کیا پتا کس لیے...... اب تو عدت بھی لمبی ہو گئی...... تسنیم کی فراغت تک۔"

"دوسرا راستہ بہتر ہے تقدیم کی ماں۔" ابا کا استغراق ٹوٹا۔ "ہم کیوں کسی انسانی زندگی کا قتل کر کے گناہ اپنے سر لیں...... آخر اللہ کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔" زندگی میں پہلی بار ابا کو اماں سے بات کرنے میں حجاب محسوس ہو رہا تھا۔

"ہم کس کس کو اور کس کس طرح یقین دلائیں گے...... کل کو اپنے پرایوں کے منہ بند رکھنے کے لیے ان بدبختوں کا منہ دیکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ اب لڑکے سے نہیں اس کے بڑوں سے بات کرنی ہے...... اولاد تو ان کے بیٹے ہی کی ہو گی۔ اسے جائز مقام دینے کو بے شک ایک دن ہی کو سہی تسنیم کو اپنی بہو بنا کر لے جائیں۔"

"میں تو سوچ رہا تھا عزت بچا لی مولا کریم نے۔" ابا انتہائی کرب سے بولے۔ "مگر پھر ناؤ بھنور میں پھنس گئی۔"

"پہلی فرصت میں چلیں ان کے پاس...... میں بھی ساتھ جاؤں گی آپ کے۔" اماں نے کہا۔

"تسنیم سے ایڈریس لو...... بلکہ میں تو کہتا ہوں جس دوست کے گھر میں اس نے اسے رکھا تھا اس سے بھی ملا جائے...... کوئی گواہ بھی تو ہو ہمارے ساتھ۔"

تسنیم سے اماں نے براہِ راست بات کی۔ مدثر کے گھر کا نمبر وغیرہ تو اسے معلوم نہ تھا البتہ اس علاقے میں جا کر وہ نشاندہی کر سکتی تھی۔ نادر کے فلیٹ کا محل وقوع بھی اس نے کچھ اس طرح بیان کیا۔ مین گیٹ سے داخل ہو کر سیدھے ہاتھ سے دوسری بلڈنگ میں تھرڈ فلور پر ڈارک براؤن دروازے والا فلیٹ...... باہر ایس نادر علی کی تختی لگی ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے اسے گلستان جوہر میں واقع اس رہائشی اسکیم کا نام معلوم تھا جہاں نادر رہائش پذیر تھا۔

معاملہ تعجیل کا متقاضی تھا۔ ابا نے پہلے نادر کے گھر اکیلے ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ گلستان جوہر کی بھول بھلیوں میں نادر کا فلیٹ ڈھونڈنے میں انہیں قدرے دشواری ہوئی لیکن بالآخر پہنچ ہی گئے۔ نادر اور اس کی بیوی شروع میں کچھ گھبرائے لیکن ابا کی عمر، دھیمے لہجے اور دل گرفتگی نے انہیں ابا کو احترام سے اپنے گھر میں بٹھانے پر مجبور کر دیا۔ طلاق کے قصے سے دونوں میاں بیوی لاعلم تھے اور دونوں کو اس خبر سے شدید رنج ہوا۔

"نادر اسی لیے لڑکیوں کو بہت سوچ سمجھ کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" ثریا نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسی کیا بات ہوئی جو مدثر نے اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔" نادر نے ابا کو تشکیک سے دیکھا۔

"یہی بات ہم سمجھنے سے قاصر ہیں...... ہم تو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اپنے والدین کو لے کر آئے گا اور ان سے بات چیت کے بعد ہم لڑکی کو ایک سادہ سی تقریب گھر پر منعقد کر کے ان کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔" ابا بولے۔

"آپ نے جا کر پوچھا بھی نہیں؟" نادر نے کہا۔

"نہیں......" ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیٹا چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔ طلاق نامہ اس کی موجودگی میں ہی وصول ہوا۔ بھائی تھا...... جوان خون...... اس کے مشتعل ہونے کے خوف سے ہم نے اس معاملے کو ممکنہ حد تک صبر و برداشت سے لینے کی کوشش کی۔"



www.paksociety.com

''بہت اچھا کیا۔'' ثریا نے کہا۔ ''بھائیوں کی غیرت جوش میں آ جائے تو اللہ نہ کرے سر اُتر جاتے ہیں۔''

ابا نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گویا ہوئے۔ ''اسے ہماری کمزوری سمجھیں یا مجبوری ہم تو شاید بھی چپ ہی رہتے، بیٹی کی نادانی کو اپنی اور اس کی بدقسمتی سمجھ کر صبر کر لیتے اگر ایک نیا مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہوا ہوتا۔''

''وہ کیا؟'' نادر نے چونک کر پوچھا۔

''شرم محسوس ہوتی ہے بات کرتے ہوئے۔'' ابا سر جھکا کر بولے۔ ''مگر بات کیے بنا چارا بھی نہیں۔ ... دن قبل تسنیم کی طبیعت خراب ہوئی تو اسے بڑی بہن اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے گئی پتا چلا...... وہ پریگ... ہے۔''

''اوہو!'' ثریا کے لہجے میں حد درجہ ملال تھا۔ ''یہ تو مسئلہ ہو گیا۔''

ابا انتہائی ملول دکھائی دینے لگے۔ ''یہ بات ایسی نہیں کہ لوگوں سے چُھپی رہ سکے لہٰذا ضروری ہو گیا ہے ... بچی کے نکاح اور طلاق کے معاملات آگے پیچھے کچھ وقفے سے مگر جلد از جلد کھول دیے جائیں۔ ورنہ بدنامی ... طوق گلے آ پڑے گا۔'' ابا کی آواز درد انگیز رقّت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ثریا نے ابا کو ترحم سے دیکھا۔

''مدثر سے بات ہوئی اس سلسلے میں؟'' نادر نے پوچھا۔

ابا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن بتانا ضروری ہے اور کوئی ایسا راستہ نکالنا بھی جو تسنیم کو اور ہمیں بدنامی ... رسوائی سے بچا سکے...... میں مدثر کے بجائے اس کے والدین سے بات کرنا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں...... کیا عجب کہ وہ بے چارے اس قصے سے پرے سے ہی لاعلم ہوں۔ اپنے صاحبزادے کی حرکتوں کا علم ہی نہ ہوا نہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' نادر نے تائید کی۔

''ضرور ملیں آپ......'' ثریا نے زور دے کر کہا۔ ''بلکہ اگر ہماری ضرورت ہو تو ہم بھی چلنے کو تیار ہیں۔''

''خدا آپ کو جزائے خیر دے بیٹی...... دین اور دنیا میں آسانیاں پیدا فرمائے۔ نادر صاحب ساتھ ہوں گے تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ کوئی گواہ تو ہو گا ہمارے ساتھ۔'' ابا بولے۔

''ارے انکل یہ نادر صاحب تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جائیں گے میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ مدثر کا گریبان پکڑنے کے لیے...... سچ پوچھیں تو مجھے وہ لڑکا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔'' ثریا کے تیور جارحانہ تھے۔ ''اس وقت تو میرا خون کھول رہا ہے۔''

''میں حیران ہوں۔'' ابا نے بے ساختہ کہا۔ ''بُرا مت منایئے گا نادر صاحب...... آپ تو مجھے نہایت شریف اور میچور ڈ آدمی لگے ہیں۔ اس قسم کے لڑکے سے آپ کی دوستی اور اسے اپنے گھر میں جگہ دینا میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

نادر کے چہرے سے خفت جھلکنے لگی۔ ''بس انکل محلے داری کی دوستی ہے جو عمر، خاندان، عادت، مزاج ... فرق سے بے نیاز ہوتی ہے، محلے میں آدمی اپنے سے چھوٹے سے بھی دوستی پال لیتا ہے۔ عادت اور مزاج ... فرق کی بھی پروا نہیں کرتا۔''

ثریا نے نادر کو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور بولی۔ ''ویسے میرا دل بہت خوش ہوا انکل کی اس بات سے۔'' پھر اس نے ابا کی جانب نگاہ کی۔ ''یقین کریں انکل، مدثر سے ان کی دوستی نہ کبھی میری سمجھ میں آئی نہ میرے دل کو بھائی...... میں نے تو آپ کی بیٹی کو بھی جب وہ اسے ساتھ لے کر ہمارے ہاں آیا تو بہت ڈانٹا تھا۔ ... سمجھایا تھا اسے کہ اس نے گھر چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی۔''





''بس بیٹی!'' ابا نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''کچھ اس کی نادانی تھی کچھ ہماری قسمت خراب تھی جو ایسا ہو گیا۔ کبھی گھر تشریف لائیں اور میری دوسری بیٹیوں سے ملیں آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ قسمت میں ہوا تو ضرور ملوں گی...... فی الحال تو مدثر کے ہاں چلنے کا بتائیں، کب جانا ہے؟''

''میں تو کہتا ہوں آپ کی پہلی فرصت میں۔'' ابا نے بے تابی سے کہا۔

''اس کام کے لیے تو دن ہو یا رات فرصت ہی فرصت۔'' ثریا کے لہجے میں گرمجوشی تھی۔

''ان لوگوں کا فون نمبر ہو گا آپ کے پاس؟'' ابا نے نادر سے پوچھا۔

''مدثر کے والد کا؟''

''جی ہاں۔''

''جی...... جی...... بالکل ہے۔''

''اگر عنایت فرمائیں تو میں ان سے وقت طے کر لوں گا۔''

''نہ نہ انکل...... کچھ کہے سنے بغیر چھاپا ماریں گے تاکہ وہ منحوس مدثر اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔'' ثریا نے کہا۔

''بغیر اطلاع کیے جانے پر وہ بُرا نہ منائیں۔''

''برا مناتے ہیں تو منائیں...... ہم لوگ صبح سویرے پہنچیں تو اچھا رہے گا تاکہ سب گھر پر مل جائیں...... رات کو سب کے ملنے کا اعتبار اس لیے نہیں کہ مدثر کے ابا کا ہوٹل ہے۔ رات کو دیر سے ہی آتے ہوں گے۔''

''بہت مناسب......'' ابا کو نادر اور ثریا سے مل کر تقویت کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

ابا، اماں، تقدیم، نادر اور ثریا پانچ افراد کی صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اچانک آمد مدثر کے والدین کا ماتھا ٹھنکا دینے کے لیے کافی تھی۔ نادر اور ثریا سے تو ان کی پرانی شناسائی تھی۔ نادر کے ذریعے ابا، اماں اور تقدیم کے تعارف نے انہیں چونکا دیا۔

''آنا تو چاہیے تھا ہمیں پہلے لیکن بعض مصلحتیں آڑے رہیں۔'' ابا نے انتہائی تحمّل سے کہا۔

بات شروع ہوئی تو کُھلا کہ مدثر کا تسنیم سے کورٹ میرج کرنا ماں اور باپ دونوں کے علم میں تھا۔ ڈیڈی گرگِ باراں دیدہ تھے تاڑ گئے کہ لڑکی والے بہ لحاظ اسٹیٹس ان سے کہیں کمتر تھے۔ ان کے دباؤ میں آنے کے بجائے انہیں دباؤ میں لیا جا سکتا تھا۔

''آپ کی بیٹی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تھی جناب کوئی ناسمجھ نہیں تھی۔ کورٹ میرج میں اس کی اپنی مرضی بھی شامل رہی ہو گی۔'' مدثر کے ڈیڈی نے کہا۔

ممی بہانے سے اٹھ کر اندر گئیں اور انہوں نے مدثر کو جو یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہا تھا صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ''تم ایسا کرو چُپ چاپ نکل جاؤ۔ آج گاڑی مت لے جانا تم، گاڑی اسٹارٹ کرو گے تو ان کے کان کھڑے ہو سکتے ہیں۔''

''آئے کیوں ہیں؟''

''تم اور تمہارے ڈیڈی یہ سمجھ رہے تھے کہ بیٹی کو طلاق ہونے پر وہ لوگ خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ لوگ ہماری طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ سوچ سمجھ کر ایکشن لیتے ہیں۔''

''کیا ایکشن لیں گے!'' مدثر نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

''کچھ نہ کچھ تو لیں گے ہی...... یوں صبح سویرے ان کا آ دھمکنا بے معنی نہیں...... لیکن تمہارا دوست نادر اور

www.paksociety.com

اس کی بیوی بھی ساتھ ہیں...... ان سے ان لوگوں کا کیا تعلق ہے؟" ممی کشمکش میں نظر آئیں۔

"وہ انہی لوگوں کے گھر میں رہی تھی۔" مدثر نے اعتراف کیا۔

"اچھا!" ممی چونکیں۔ "اب تم نکلو فافٹ۔"

"ناشتا؟"

"یونیورسٹی جا کر کر لینا...... میرے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں اور تمہیں ناشتے کی پڑی ہے۔ اپنے پیچھے یہ کہیں پولیس ہی نہ لائے ہوں۔"

مدثر نے ممی کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ دھر دیے۔ "کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے ممی کو تسلی دی۔

"لوگ تو بس ایسے ہی سے لگتے ہیں...... آئے بھی شاید ٹیکسی میں ہیں کیونکہ گاڑی واڑی تو کوئی مجھے دکھائی نہیں دے رہی...... ڈیڈی تمہارے سنبھال تو لیں گے پھر بھی...... احتیاط بہتر ہے...... جاؤ۔"

"جا رہا ہوں...... جا رہا ہوں۔"

"پچھلے گیٹ سے جانا۔"

"اوکے......"

مدثر کو گھر سے نکالنے کے بعد ممی دوبارہ لاؤنج میں پہنچیں تو انہوں نے ڈیڈی کو ناگواری سے کہتے سنا۔

"آج کل لڑکیوں کا ایک ایک وقت میں کئی کئی لڑکوں سے تعلق رکھنا فیشن بن گیا ہے۔ کیا پتا کس کا بچہ ہے؟"

ممی نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ اماں ابا کے سر جھک گئے۔

"الزام لگا رہے ہیں کہ ان کی بیٹی مدثر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" ڈیڈی نے ممی کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔ ممی کا منہ کھلا رہ گیا۔

"کیسی بات کر رہے ہیں جناب!" ابا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ "یہ الزام نہیں اطلاع ہے۔"

"سراسر الزام...... اور اگر اطلاع بھی ہے تو مجھے کیوں دے رہے ہیں آپ؟" ڈیڈی بولے۔

"صاحبزادے سے پوچھیے۔"

"کیا پوچھوں...... وہ تو احمق ہے پرلے درجے کا...... لڑکیوں کی کوئی کمی تھی اس کے لیے...... معمولی گھرانوں کی لڑکیاں ایسے لڑکوں کو تر نوالہ سمجھ کر پھانستی ہیں۔"

"آپ توہین کر رہے ہیں ہماری۔" ابا نے احتجاج کیا۔

"ہاں انکل۔" ثریا چپ نہ رہ سکی۔ "آپ واقعی زیادتی کر رہے ہیں...... آپ کے بیٹے نے ان کی بیٹی سے کورٹ میرج کے بعد اسے ہمارے گھر میں رکھا...... اس کے پاس آتا جاتا رہا...... دودھ پیتا بچہ تو نہیں تھا مدثر جو پھنس گیا ہو...... پھانسا تو اُس نے تھا ان کی بیٹی کو...... تین چار دن خوب رنگ رلیاں منائیں اس نے۔"

ممی نے ثریا کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلو بدلا۔ ثریا سے ان کا زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ وہ اسے پسند بھی نہیں کرتی تھیں مگر آج تو ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے گھر سے نکال باہر کریں...... بڑی حمایتی بن کر آئی تھی اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کی جس کا خیال بھی ممی کو اب کوفت دیتا تھا۔

"بی بی! کیا ثبوت ہے کہ بچہ مدثر ہی کا ہے۔" ڈیڈی نے ثریا سے کہا۔

"خدا کا خوف کریں انکل۔" ثریا نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"ثریا تمیز سے بات کرو...... بڑے ہیں۔" ممی نے تیوری چڑھا کر کہا پھر نادر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "لگتا ہے تمہاری بیگم تو آج بغض للّٰہی میں آئی ہیں۔"





"نہیں آنٹی...... گواہی دینے آئی ہوں......" ثریا زبان کی کڑوی مگر دل کی کھری تھی۔ سچی بات کہنے کی جرأت رکھتی تھی۔ مدثر کے والدین کا لحاظ تھا اس کے دل میں مگر تسنیم کے گھر والوں کے ساتھ ان کا توہین آمیز رویّہ دیکھ کر اس کے دل سے یہ لحاظ جاتا رہا تھا۔

"دیکھو بی بی...... ہم بلیک میل ہونے والے نہیں ہیں......" ڈیڈی نے ثریا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر روئے سخن ابا کی جانب کیا۔ "مانتا ہوں کہ میرے بیٹے نے ایک غلطی کی۔"

"ایک نہیں دو۔" ثریا نے لقمہ دیا۔

ڈیڈی نے اسے یوں نظر انداز کیا جیسے اس کی بات کو اہمیت نہ دینا چاہتے ہوں اور ابا سے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندر کی بلا طویلے کے سر منڈھنے کی کوشش کی جائے۔ اپنی بیٹی سے پوچھیں کس کا بچہ ہے؟"

ابا کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ ہو گیا۔ "آپ مسلسل ہماری توہین کر رہے ہیں۔"

"کیونکہ آپ مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جی نہیں۔"

"دیکھیں بھائی صاحب۔" اب تک خاموش بیٹھی اماں گویا ہوئیں۔ "ہم آپ سے کچھ نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ آپ کے بیٹے سے ہماری بیٹی کا رشتہ اور پھر علیحدگی لوگوں پر کھل جائے تاکہ...... بچے کو اس کی پہچان مل سکے...... لوگ اُلٹی سیدھی باتیں نہ بنائیں۔"

"وہ تو بنائیں گے......" ڈیڈی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "وہ تو بنائیں گے۔" انہوں نے رعونت سے اپنے الفاظ دُہرائے پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "اپنی بیٹی کے گناہ کا بوجھ آپ لوگ میرے بیٹے کے سر کیوں ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" ابا کی آواز رنج و درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"یہی بات ہے۔" ابا کو کمزور پڑتا دیکھ کر ڈیڈی شیر ہوئے۔

"خدا کے واسطے بھائی صاحب!" ابا گڑگڑائے۔

"صرف ایک دن کے لیے لے آئیں آپ اسے اپنے گھر۔" اماں کی آواز میں رقت تھی۔

"میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں...... میرے گھر میں یہ ڈراما نہیں چل سکتا۔" ڈیڈی نے اماں کو تحقیر سے دیکھا۔

ایک مرد کی نگاہیں اور وہ بھی اس قدر پُر تحقیر! اماں کو لگا ڈیڈی کی نگاہیں ان کے وجود کو میخوں کی طرح تختہ کر ڈالیں گی۔ دل پھٹ جائے گا' اتنی تذلیل...... ایسی بے بسی...... ایسی آزمائش!

"میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا جناب!" ابا نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈیڈی کو خوشامدانہ نظروں سے دیکھا اور اپنا چہرہ جڑے ہوئے ہاتھوں پر اوندھا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگے۔

اماں سے ابا کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ زندگی ابا اور خود اماں کے لیے بھی پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی تھی۔ دونوں شریکِ سفر تھے، لمبا سفر طے کیا تھا۔ اس سفر میں کبھی خوشی کبھی غم کبھی دھوپ کبھی چھاؤں کا سلسلہ رہا تھا۔ ایسی کٹھن منزل پہلے کبھی نہیں آئی تھی زندگی کے سفر میں۔ ابا کو اپنے ہی جیسے ایک انسان کے سامنے ہاتھ جوڑے اور پیشانی ٹیکے روتا...... دیکھ کر اماں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ جب سارا سفر اکٹھے گزرا تھا ہر خوشی ہر غم ساجھی رہا تھا تو ان آنسوؤں میں ابا کا ساتھ دینے میں پیچھے کیوں رہ جاتیں وہ روئیں اور ایسے بلک بلک کر روئیں کہ تسنیم ہوتی تو



www.paksociety.com

جان پاتی کہ اس کی ایک نادانی...... ایک بھول نے اماں اور ابا کو کس دردِ بیکراں سے دوچار کر دیا تھا۔ تقدیم بے تاب ہو کر اٹھی اور اس نے اماں کے معذور وجود کو یوں اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا جیسے انہیں آلامِ زندگی سے محفوظ و مامون رکھنے کی سعی کر رہی ہو۔

''بس اماں...... بس......'' وہ دیوانہ وار اماں کے سر کو چومنے اور انہیں چمکارنے لگی۔

اماں کے آنسو تھمے تو تقدیم نے جارحانہ تیوروں سے ڈیڈی کی جانب دیکھا اور تلخ لہجے میں بولی۔ ''ایک بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں...... میری بہن کو تو آپ کے بیٹے نے اپنی زندگی سے نکال پھینکا...... بچے کے ساتھ وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔'' اس نے توقف کیا اور اپنی نگاہیں بدستور ڈیڈی پر مرکوز رکھتے ہوئے پہلے ابا کی طرف انگلی اٹھائی پھر اماں کا سر چوم کر بولی۔ ''ان کے آنسوؤں کی قسم...... اپنی بہن کے بچے کے نسب کی تصدیق اور اسے اس کی جائز شناخت دلوانے کے لیے مجھے اگر اپنی پوری زندگی بھی داؤ پر لگانی پڑی تو دریغ نہیں کروں گی۔'' اس نے پھر توقف کیا اور اب ڈیڈی کو استہزائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے ڈی این اے ٹیسٹ کا ضرور سنا ہوگا...... میڈیکل سائنس کی ایک اہم پیش رفت...... اس ٹیسٹ کے ذریعے کسی فرد کی فیملی روٹ تک پہنچنا ممکن ہے۔ اگر اس ٹیسٹ کے ذریعے خودکش دھماکوں اور فضائی حادثات میں پارہ پارہ ہو جانے والے انسانی جسموں کی شناخت ممکن ہے تو میری بہن کے بچے کو اس کی شناخت کیسے نہیں ملے گی۔ ضرورت پڑی تو اس کا باپ سے تعلق کنفرم کرانے کے لیے ہم ہر حد تک جائیں گے۔ اعلیٰ ترین عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔''

ڈیڈی کا چہرہ پتھرا سا گیا۔ ''ہمیں کسی ٹیسٹ کی ضرورت نہیں۔''

''مگر ہمیں ہے...... ہوگی۔'' تقدیم بھپر کر بولی۔

اماں اور ابا کے چہرے پر جوت سی جاگی۔ ثریا نے حیران ہو کر تقدیم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دی۔ ڈیڈی کا طرارہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ممی آنکھیں پھاڑے تقدیم کو دیکھ رہی تھیں۔

''ہمیں جہاں تک جانا پڑا جائیں گے۔'' تقدیم نے کہا۔

''جاؤ...... شوق سے جاؤ......'' شدید خوف کے عالم میں بھی انسان کبھی کبھی شیر کی طرح دہاڑ کر اپنا خوف اسی طرح رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے ڈیڈی نے کیا تھا۔

ثریا اپنی آنکھوں کی نمی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی اگلی پوروں میں جذب کرتے ہوئے دھیرے سے یوں مسکرائی جیسے شدید بارش میں اچانک دھوپ نکل آئے۔ ''اور انکل، مدثر کے تسنیم سے ازدواجی تعلق کی گواہی میں دوں گی عدالت میں۔''

ممی نے اسے چونک کر اور ڈیڈی نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

''اتنا بزدل ہے مدثر کہ کورٹ میرج کا کاغذ تک تو اپنے پاس رکھ نہیں سکا نادر کو رکھنے کے لیے دیا۔''

''کیا کرتا بے چارہ!'' ممی نے مدثر کا دفاع کیا۔

''بے چارہ تو نہ کہیں آنٹی......'' ثریا بولی۔ ''بے چارے لڑکیوں کی زندگیاں برباد تھوڑی کرتے ہیں۔''

''ارے تو لڑکیاں کون سی بھلا معصوم ہوتی ہیں...... گھر سے کالج، یونیورسٹی جانے کو نکلتی ہیں اور پہنچ جاتی ہیں شادی کرنے کورٹ...... اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی روگ لگا دیتی ہیں۔'' ممی نے ناگواری سے کہا۔

''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔'' ثریا نے تائید کی پھر ڈیڈی کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''انکل جو ہوا اس پر مٹی ڈالیں... آگے چلیں۔''

''آگے کیسے چلیں۔'' ڈیڈی بھبک اٹھے۔ ''کیا عزت صرف لڑکی اور اس کے گھر والوں کی ہوتی ہے۔''

www.paksociety.com

لڑکے والوں کے کوئی مسائل نہیں ہوتے...... ان کا کوئی مراجیتا نہیں ہوتا...... انہیں کسی کو منہ نہیں دکھانا ہوتا۔"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔" ثریا کچھ خفیف سی دکھائی دینے لگی۔

"تو پھر سر پر تلوار سونت کر مت کھڑی رہو...... چھری تلے دم تو لو......" ممی بولیں۔

"ٹھیک ہے آنٹی ٹھیک ہے۔"

"مدثر آجائے......" ڈیڈی نے انتہائی مختصر مگر امید افزا اعلامیہ جاری کیا۔

ثریا نے تقدیم کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اب اٹھ جانا چاہیے باقی ضرورت پڑی تو پھر سہی۔

☆☆☆

مدثر کو ڈیڈی نے فون کر کے یونیورسٹی سے گھر بلایا اور ممی کی موجودگی میں اسے سامنے بٹھا کر تمام صورت حال بتائی۔ مدثر کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہوگی۔

"جیب میں تمہارے چار پیسے ذاتی نہیں اور تم اتنی بڑی بدنامی سر لے بیٹھے...... ان کا کیا ہے معمولی لوگ ہیں...... ایسے لوگوں کو تو نہ پریس کلب کے سامنے ٹینٹ لگا لینے میں کوئی عار ہوتا ہے نہ اسمبلی بلڈنگ کے باہر دھرنا دینے میں...... تمہارا کچھ بگڑے گا نہ تمہاری ماں کا...... رسوائی تو میری ہوگی۔"

"وہ لوگ ایسے نہیں ہیں ڈیڈی......" مدثر جو دل ہی دل میں ایک انوکھی سرخوشی محسوس کر رہا تھا بولا۔

"جانتا ہوں کیسے ہیں...... ارے پتا نہیں کس کا گند ہے جو وہ لوگ تمہارے سر پر رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بچے کے نسب کے بارے میں اس کی ماں سے زیادہ معتبر گواہی اور کس کی ہوسکتی ہے اور تسنیم کے لیے خود مدثر قسم کھا سکتا تھا کہ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو ایک وقت میں کئی کئی سے افیئر چلاتی ہیں۔

"نہیں ڈیڈی ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے پورے شدومد سے ڈیڈی کی بات کی مخالفت کی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"جیسے آپ کہہ سکتے ہیں میرے بارے میں۔"

ڈیڈی لاجواب ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔

"اس سے میرا رشتہ ضرور ٹوٹ گیا ہے ڈیڈی لیکن اس پر میرا یقین اپنی جگہ ہے...... اور میری آپ سے التجا ہے کہ آج کے بعد آپ اس کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"بہت ذلیل کیا ہے تم دونوں بھائیوں نے مجھے...... تیسرا پتا نہیں کیا کرے گا۔" ڈیڈی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"سوری ڈیڈی۔"

"سوری کا بچہ۔"

اس نے کان دبایا...... دل مچل رہا تھا...... عجیب عجیب حرکتیں کرنے کو...... گھوڑا بن کر گھٹنوں کے بل سارے گھر میں گھومتے پھرنے کو...... قلابازیاں کھانے کو...... چھت پر جا کر دونوں بازو پھیلا کر زوردار چکر پھیریاں کھانے اور ہاتھ بڑھا کر آسمان پر اڑتے بادلوں کو چھو لینے کو...... بازار جا کر ڈھیروں رنگ برنگے غبارے، کھلونے، ننھے منے بے بی سوٹ، پرام اور بے بی کاٹ خرید کر لانے کو...... اور تسنیم سے بات کرنے کو...... مگر وہ اب اس کی زندگی میں کہاں تھی۔



www.paksociety.com



"ڈیڈی اب ایک بار لانا بھی ضروری ہے اسے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

ڈیڈی نے پھر گھورا۔ "طلاق کے بعد پھر نکاح پڑھوائے گا اس سے۔"

وہ شرمندہ ہو گیا پھر بولا۔ "بس یہ ایک خواہش پوری کر دیں میری...... میں نے بھی تو آپ کی بات مانی ہے۔"

"لوگ کیا کہیں گے؟" ممی فکرمندی سے بولیں۔

"لوگوں کو تفصیل بتانے کی ضرورت کیا ہے۔" مدثر کے لہجے میں بے خوفی تھی۔

"سب سے پہلے تو بہو گھر میں بیٹھی ہے...... بیٹیوں سے پردہ داری ممکن ہوسکتی ہے مگر بہو سے ناممکن...... کبھی بیٹا اسے بتا دیتا ہے، کبھی وہ لک چھپ کر خود کن سوئیاں لے لیتی ہے۔ شکر ہے کہ صبح جب وہ لوگ آئے تو منعم اور وہ گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے اس سے چھپانا ممکن نہیں۔"

"چلیں اس کی تو مجبوری ہے، خاندان میں کسی اور کو نہ بتائیں۔"

"نہ بتاتی اگر بچے کا شوشہ نہ اٹھ کھڑا ہوتا...... اور اب جب تم بھی یہ کہہ رہے ہو کہ وہ تمہارا ہے تو خاندان والوں کو شامل کرو نہ کرو بتانا ضروری ہے۔"

"تمہارا سمسٹر کب ختم ہو رہا ہے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔ مدثر چونکا کہ ڈیڈی کو اچانک اس کا سمسٹر کیوں یاد آگیا تھا۔

"اگلے ماہ......" اس نے بتایا۔

"میں کنسلٹنٹ سے بات کرتا ہوں۔ ویزا اپلی کیشن کی تیاری کے لیے۔" ڈیڈی نے کہا۔

اس نے چونک کر ڈیڈی کو دیکھا۔

"جانا تو ہے نا بھئی...... یا پروگرام بدل لیا۔"

"نہیں ڈیڈی......" اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا مہنگا سودا کر بیٹھا تھا ڈیڈی سے۔

مجبوراً اور مصلحتاً منعم اور اس کی بیوی نورین کو بھی اعتماد میں لینا پڑا۔ "نورین! گھر کی بات گھر ہی میں رہے۔" ممی کے ایما پر ڈیڈی نے اس سے خود بات کی کہ ڈیڈی کا کہا ممی کے خیال میں زیادہ اثر رکھتا تھا۔ "جس طرح ہم نے تمہیں اس گھر میں عزت دی ہے تمہارا بھی یہ فرض ہے کہ اس گھر کی عزت کا خیال رکھو۔" ڈیڈی نے اس سے کہا۔

"جی ڈیڈی!"

"بس ایک رات کے لیے آئے گی وہ یہاں...... خاندان والوں سے ہم یہ بہانہ کر دیں گے کہ مدثر باہر جا رہا ہے۔ ہم نے اسے سادگی سے نکاح کے بندھن میں باندھ دیا ہے اور ایک رات کو لڑکی کو اپنے گھر لے آئے تاکہ دونوں میں ایک تعلق قائم ہو جائے اور مدثر باہر سے اپنے ساتھ کوئی گوری میم لانے کی غلطی نہ کرے...... تم سمجھ رہی ہو نا!"

"جی ڈیڈی!"

بعد میں نورین نے ممی سے دبی زبان سے پوچھا۔ "ولیمہ؟"

"ولیمہ کیسے کیا جا سکتا ہے...... مدثر تو اسے ڈیورس کر چکا ہے۔ یہ سب تو لڑکی والوں کی عزت بنی رکھنے کی خاطر کیا جا رہا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں ممی؟"

"ہاں پوچھو۔"

"مدثر بھائی نے اسے ڈیوورس کیوں دی؟"

"ڈیڈی کے خوف سے۔" ممی نے اسے یہ بتانے سے گریز کیا کہ مدثر نے طلاق ڈیڈی کے ایما پر دی تھی۔

نورین نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ منعم نے اسے بھگالے جانے کے بعد پوری طرح اس کا ساتھ دیا تھا۔ پولیس اسٹیشن میں گزری چار راتوں کی ہولناکی اور پولیس والوں کی ہوسناکی کا خیال آنے پر وہ اب بھی سہم جاتی تھی۔ اپنے آپ سے نظریں چُرانے لگتی تھی...... وہ چار راتیں اس کی زندگی کی سیاہ ترین راتیں تھیں۔ قسمت اچھی تھی اس کی جو منعم کے گھر والوں نے بھی اسے اپنالیا تھا ورنہ اس کا انجام بھی نہ جانے کیا ہوتا۔ اب تو وہ اپنے میکے والوں سے بھی ملنے جلنے لگی تھی۔

ڈیڈی کی ہدایت کے برعکس نورین نے پہلی فرصت میں اپنی ماں کو بتایا۔ "شکر کرنورین جو تو اس گھر میں بس گئی۔ میرا تو دل کٹ رہا ہے یہ سوچ کر کہ اس لڑکی پر اور اس کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی اور آئندہ بھی پتا نہیں کیا گزرے گی۔" ماں نے کہا۔

"زندگی ہے ماما...... لوگوں کو پتا نہیں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے۔"

"خدا لڑکیوں کو بھی عقل دے۔"

نورین کو یوں لگا جیسے یہ بات اس کی ماں نے اسی کو سنانے کے لیے کہی تھی۔ منعم کے ساتھ فرار ہونے کے لیے اپنی بیوہ ماں کا گھر چھوڑ کر اس نے بھی تو اچھا نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

سیف علی خان ایک نوجوان وکیل تھا۔ ہینڈسم، اسمارٹ اور پیشہ ورانہ معاملات میں لائق اور مستعد! سٹی کورٹ میں نوجوان وکلا کی بھرمار تھی جن میں سے ایک دو نہیں اَن گنت پیشہ ورانہ لیاقت وصلاحیت میں سیف علی کے ہم پلہ یا پھر اس سے بھی بڑھ کر تھے مگر سیف علی پر قسمت بطورِ خاص مہربان تھی۔ مؤکل اس کے پاس کھنچے چلے آتے۔ سٹی کورٹ میں اس کا چیمبر مقدمات کی فائلوں کے انبار سے پٹا رہتا۔ سیف علی خان کے ہم پیشہ اور ہم عصر اس کی پریکٹس کو بے حد رشک سے دیکھتے۔ مذاقاً کہا جاتا کہ سیف علی ایسی خوشبو لگا کر آتا ہے جو موکلوں کو اس کی طرف کھینچتی ہے۔ شام کے وقت وہ ایم اے جناح روڈ پر ایک جدید کمرشل کمپلیکس کی تیسری منزل پر واقع اپنے دفتر میں بیٹھ کر مقدمات کی پیروی کی تیاری کرتا۔ دو منشی اس کی معاونت کرتے اور ایک نوجوان لڑکا دفتر کی صفائی ستھرائی، فائلوں کی اُٹھائی دھرائی اور حسبِ طلب سیف علی اور اس کے منشیوں کو چائے، پانی وغیرہ کی فراہمی کے فرائض سرانجام دیتا۔ دفتر میں موکلان کا آنا جانا لگا رہتا۔ انہیں بٹھانا اور ان کا تعارف سیف علی کو پہنچانے کے بعد خود انہیں بھی بنفسِ نفیس سیف علی کے کمرے تک پہنچانا اسی لڑکے کی ذمے داری تھی۔ سیف علی اپنے مؤکلان سے انتہائی توجہ اور احترام سے پیش آتا۔ انہیں چائے ٹھنڈا پوچھنے اور اکثر پیش بھی کروا دینے سے گریز نہ کرتا۔ سیف علی کی پبلک ریلیشنگ کمال کی تھی۔ چاہے ہم پیشہ دوست ہوں یا عدالتوں میں کرسیِ انصاف پر بیٹھے جج اُسے تعلقات بنانے نباہنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ہنر آتا تھا۔ اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ جو مقدمہ ہاتھ میں لے جیتتا ہے حالانکہ یہ سو فی صد سچ نہ تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس کے مقدمات جیتنے کی شرح ہارنے کی نسبت زیادہ تھی تاہم مؤکلان جیت کی امید کے ساتھ اسے اپنے مقدمات میں وکیل ٹھہراتے۔ حجاب کی طرف سے دائر خلع کے مقدمے میں الطاف نے بھی اپنے دفاع کے لیے سیف علی خان کی خدمات اسی یقین کے تحت حاصل کی تھیں۔

الطاف کے ساتھ اپنی پہلی نشست میں ہی سیف علی خان نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ خلع کے مقدمے میں



www.paksociety.com



عورت چونکہ مرد کی جانب سے مادّی فوائد کی طلبگار نہیں ہوتی بلکہ فوائد سے دستبرداری اختیار کر رہی ہوتی ہے لہٰذا خلع کے مقدمے میں عورت کو عموماً مزاحمت کا سامنا نہیں ہوتا۔

"کیس کو لمبا تو کھینچا جاسکتا ہے وکیل صاحب۔" الطاف نے کہا۔

"آپ کی منکوحہ نے طلاق کا مقدمہ کیا ہوتا تو میں کھینچتا برسا برس...... خلع کے مقدمے کو ایک حد تک...... آپ کو اس کیس کا فیصلہ دوسری پارٹی کے حق میں جاتا دیکھنے کے لیے خود کو تیار رکھنا ہوگا۔"

"اوکے۔" الطاف کے لہجے میں قبل از وقت ہی شکست خوردگی کا احساس جھلکنے لگا تھا۔

"بہرحال میری کوشش ہوگی کہ جتنا کھینچا جاسکتا ہے کھینچا جائے۔" سیف علی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فیس کی فکر نہ کیجیے گا...... جو آپ نے کہی ہے، ابھی پیش کیے دیتا ہوں۔" الطاف نے سیف علی کی میز پر اپنے بلیک بیری کے نیچے دبے والٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"فیس میں پیشگی ہی لیا کرتا ہوں سر۔" سیف علی نے کہا۔

مقدمے کی پہلی سماعت پر حجاب بڑی سی چادر اوڑھے آنکھوں کے سوا اپنا باقی چہرہ چادر سے چھپائے امی کے ہمراہ کورٹ گئی تو الطاف بھی اپنے وکیل کے ہمراہ موجود تھا۔ سماعت شروع ہونے سے قبل وہ امی اور حجاب کی طرف آیا تو حجاب امی کے پاس سے ہٹ کر برگد کے ایک بوڑھے درخت کے چوڑے سے تنے کی آڑ میں ہوگئی۔

"آنٹی اب بھی وقت ہے، حجاب سے کہیں مان جائے، ضد چھوڑ دے میں اس کی ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

امی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ تلملا کر بوڑھے برگد کی آڑ میں کھڑی حجاب کی طرف بڑھا۔ امی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"اب بھی وقت ہے سوچ لو۔" اس نے حجاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"سوچنا مجھے نہیں آپ کو ہے۔" حجاب نے بے خوفی سے کہا۔

"تمہاری ضد تمہیں برباد کر دے گی۔"

"آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں۔"

الطاف نے زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارا۔ حجاب امی کی جانب بڑھ گئی۔

عدالت میں مقدمے کی پہلی سماعت کے دوران الطاف، پکار پڑنے سے اختتامِ سماعت تک اپنے چہرے پر غیر معمولی تناؤ کی کیفیت لیے موجود رہا۔ عدالت نے اگلی پیشی پر الطاف اور اس کے وکیل کو جوابِ مقدمہ جمع کرانے کا پابند کیا۔ اگلی سماعت کی تاریخ دے دی گئی۔

کورٹ سے نکلنے کے بعد حجاب امی کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف پیدل جا رہی تھی کہ الطاف نے اپنی چمکتی دمکتی کار ان کے نزدیک لا روکی اور حجاب سے جو ہنوز اپنا چہرہ چادر سے چھپائے ہوئے تھی بولا۔ "اپنا نہیں تو بے چاری آنٹی ہی کا خیال کرو...... کورٹوں میں دھکے کھاتے پھرنے کی عمر نہیں ہے ان کی۔" اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر امی سے کہا۔ "بیٹھیں آنٹی...... میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"شکریہ...... ہم چلے جائیں گے۔" حجاب نے اسے گھورتے ہوئے امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آنٹی پر بھی رحم نہیں آتا تمہیں۔" الطاف بولا۔

"ماں میری ہیں...... خوامخواہ ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں۔"

"میری بھی ماں ہیں۔"

"ماؤں کو دھوکا نہیں دیا جاتا...... جھوٹ نہیں بولا جاتا اُن سے۔" وہ امی کا ہاتھ پکڑے آگے چل دی۔

الطاف کی کار رینگتے ہوئے دوبارہ ان کے اس قدر نزدیک آرکی کہ وہ ایک ساتھ ٹھٹکنے پر مجبور ہو گئیں۔

"عورت کا اتنا نخرہ!" اس نے اسٹیئرنگ وہیل پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے دُرشتی سے کہا۔ "مرد ایک حد تک برداشت کرتا ہے۔"

حجاب نے اسے گھورا۔

"بیٹا اب تو معاملہ عدالت میں ہے...... فیصلے کا انتظار کرو۔" امی نے تحمّل سے کہا۔

"فیصلہ عدالت نہیں، میں کروں گا۔" وہ رعونت سے بولا۔

"اگر یہ بات عدالت کے کمرے میں کہی گئی ہوتی تو توہینِ عدالت کے زمرے میں آتی۔" حجاب نے کہا۔

"توہین تو میری کی گئی ہے۔"

"جاؤ بیٹا...... پلیز ہمارا راستہ چھوڑ دو......" امی نے ہاتھ جوڑ کر نگر بیزاری سے کہا۔

"اتنی آسانی سے نہیں۔" اس نے امی کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔

"آئیں امی۔" حجاب نے امی کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لیا اور فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔

"انجام اچھا نہیں ہوگا میڈم۔" الطاف نے گاڑی سے باہر سر نکالتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ راہ گیر چونک کر دیکھنے لگے۔

"توبہ توبہ! میں تو اسے ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" امی اپنا چہرہ چادر سے چھپاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

الطاف انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ گاڑی کی رفتار اس کے غیظ و غضب کی مظہر تھی۔ حجاب کو افسوس ہوا کہ اس کی وجہ سے امی بھی اس عمر میں عدالت کے چکر میں پڑ گئی تھیں۔ امی اس کے کہے بنا یوں اس کی کیفیت بھانپ گئیں جیسے انہیں الہام ہوا ہو۔

"بیٹا کسی شاعر نے کہا ہے کہ اس طرح تو ہوتا ہے...... اس طرح کے کاموں میں۔" پڑھی لکھی ماں ہو تو اولاد کو یہی فائدہ ہوتا ہے کہ بہت ساری باتیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ماں اولاد کا دل ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

☆☆☆

ہفتے میں ایک دو مرتبہ شام کو بن ٹھن کر، خوشبو میں بس کر گھر سے باہر جانا عباد کا معمول بن گیا تھا۔ امی خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہتیں اور آپ ہی آپ سوچتیں کتنا اچھا ہوتا اگر عباد اپنے ہی گھر جیسے کسی گھر کی لڑکی سے شادی کر کے خود بھی چین سے زندگی بسر کرتا اور انہیں بھی انتظار کی صلیب پر نہ لٹکاتا۔ ہر ماں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی عباد کی دلہن آئے اور گھر اس کے بچوں کی چہکار سے چہکے۔ صدیقی صاحب کی بیٹی تقدیم کا انہیں اکثر خیال آتا۔ اچھے لوگ تھے، اپنے جیسا گھرانا اور خوش شکل، خوش اطوار اور خوش کلام لڑکی!

اس روز بھی جب وہ بن ٹھن کر تیز خوشبو سے اپنے وجود کو مہکا کر گھر سے جانے لگا تو امی نے کہا۔ "بیٹا کب ختم ہوں گے تمہارے یہ پھیرے۔"

وہ ہنس دیا مگر اس کی ہنسی خفت آمیز تھی۔ "ارے امی پھیرے ابھی شروع کہاں ہوئے ہیں۔" اس نے لفظ پھیرے کا استعمال ذو معنی کیا تھا۔





امی سمجھ گئیں۔ "اللہ نہ کرے جو میں ہندوانی پھیروں کی بات کروں۔ میں تو تمہارے آئے دن کے بر دکھوے کی بات کر رہی ہوں۔"

"تلاش جاری ہے امی۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے تو ایک ایک دن کھلتا ہے۔ زندگی کا کیا اعتبار...... خدا جانے کب بلاوا آجائے اور میں تمہارا سہرا دیکھنے کی حسرت اپنے دل میں لیے گزر جاؤں۔" عباد نے اپنا ہاتھ امی کے منہ پر رکھ دیا۔ ان کی آواز یک لخت گھٹ کر رہ گئی۔

"ایسی باتیں نہ کیا کریں۔" عباد نے کہا۔

"جانا تو ہر بشر کو ہے بیٹا اور...... جو پہلے آئے اسے جانا بھی پہلے ہوتا ہے۔"

"ابھی نہیں...... ابھی نہیں امی...... آپ نے زندگی میں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کے بدلے میں آپ کو ڈھیر سارا آرام دینا چاہتا ہوں۔"

"کسی امیر گھر کی بیٹی کی دولت کے بل بوتے پر۔"

"زندگی کے کھیل میں اپنی بازی جیت کر امی جی۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"ڈر! کس بات کا ڈر؟"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری یہ تلاش تمہیں بھٹکا دے...... زندگی میں ایک بار انسان اپنے راستے سے بھٹک جائے نا بیٹا تو درست سمت میں جانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"سنا ہے پرانے زمانے میں بلکہ اب بھی بے سمت مسافر قطبی تارے کی مدد سے اپنی سمت درست کر لیا کرتے ہیں...... میں اگر بھٹک بھی گیا تو کوئی قطبی تارا تو ہوگا مجھے بھی راستہ دکھانے کو۔"

"خدا نہ کرے جو تم بھٹکو۔" امی نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"دم تو کر دیں۔" عباد نے لاڈ سے کہا۔ امی کی عادت تھی وہ گھر سے نکلتا تو معوذتین اور آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کر دیتیں۔ عباد کے کہنے پر امی نے دوپٹے کا پلو سر پر ڈھانپ لیا اور دم کرنے کو قرآنی آیات زیرِ لب پڑھنے لگیں۔

☆☆☆

آدمی خوش ہو تو ساری دنیا کو اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مسرت شیئر کرنے کے لیے مدثر ثریا کی طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر نادر کے گھر جا پہنچا۔

"اخاہ! آج صبح سورج کدھر سے نکلا تھا بھئی۔" ثریا نے اسے دیکھ کر طنزیہ کہا۔ مدثر خفیف ہو گیا۔

"مبارک باد دو اپنے دوست کو نادر۔" ثریا نے شوہر سے کہا۔ "ابا جان بننے والے ہیں۔"

"شکریہ بھابی۔" مدثر نے خفت سے کہا۔

ثریا آنکھیں نکال کر اسے یک ٹک گھورنے لگی۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا ہوا بھابی؟" اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کی۔

"مرد عورت کو سہارا دیتا ہے یا دھکا...... تم نے تو اس بے چاری کو بے سہارا کر دیا...... قصور کیا تھا اس کا...... یہی نا کہ وہ اچھا بُرا سوچے بغیر آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ چلی آئی تھی۔ مرد کوئی ایسے کیا کرتے ہیں...... آخر کس بات پر طلاق دے دی تم نے اس بے چاری کو۔" ثریا نے سرزنش کی۔



www.paksociety.com

وہ چپ رہا۔
''ہاں یار مدثر تمہاری بھابی ٹھیک تو کہہ رہی ہیں...... تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا...... بات کیا ہوئی جو تم نے اتنا خوفناک اسٹیپ لے لیا۔''
''پتا نہیں...... پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' مدثر اسے اصل بات بتانے کی ہمت نہ کر پایا۔
''بچہ بے چارہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی باپ کی محبت سے محروم ہو گیا...... جانتے ہو نا بیٹا سات برس تک اور بیٹی بارہ برس کی عمر تک ماں کے پاس رہتی ہے۔ اتنی عمر کے بعد تو بچے اپنے ہاتھ منہ کے ہو جاتے ہیں۔ بچیاں باپ کو ناشتا کھانا دینے کے لائق ہو جاتی ہیں۔ اپنی کیا یاد چھوڑی تم نے اپنے بچے کے لیے...... ظالم سمجھے گا تمہیں کہ اس کی ماں کو بلاوجہ طلاق دے دی...... پاگل تو نہیں ہو گئے تھے...... جو تم نے ایسا کیا...... اور آج صبح جو عزت تمہارے ابا جان نے ان لوگوں کو دی اللہ کی پناہ! شریف لوگ ہیں ورنہ پرچہ کٹواتے تمہارے نام اور کرواتے تمہیں اندر...... کیا تم بھی اپنے ابا کی طرح تسنیم پر تہمت دھرو گے...... اپنے ایمان سے کہنا بچہ کسی اور کا ہے جیسا کہ تمہارے ابا کہہ رہے تھے یا تمہارا؟''
''میرا۔'' اس نے وثوق سے کہا۔
''ہش شاباش! کچھ تو مردانگی دکھائی تم نے...... بیٹھو چائے پلاتی ہوں۔''
''بھابی میں ایک کام سے آیا ہوں آپ کے پاس۔''
''ہاں ہاں...... بولو۔''
''تسنیم کے گھر والوں سے کہیں کہ بتا دیں کب بھیجنا چاہتے ہیں وہ اسے ہمارے گھر۔''
''اے بھیا! کوئی اس طرح...... تمہارے اماں ابا جائیں تاریخ، وقت طے کرنے کے لیے......'' ابا تمہارے راضی ہو گئے۔''
''کیسے نہ ہوتے...... مگر پروگرام طے کرنے وہ نہیں جائیں گے۔''
''کیوں؟''
''اپنی مرضی کے مالک ہیں...... ممی تو شاید چلی بھی جاتیں مگر جب ڈیڈی نہیں جا رہے تو ممی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
''تو کیا تسنیم کو اپنے گھر لانے کے لیے بھی نہیں جائیں گے؟''
''اس ایک دن کے لیے بھی بڑی مشکل سے مانے ہیں۔''
ثریا نے مدثر کو چبھتی نگاہوں سے دیکھا۔ ''جب تمہیں پتا تھا کہ تمہارے ابا کس طبیعت کے ہیں تو تم نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا کہ ایک لڑکی کو لے کر اس سے شادی کرنے کورٹ جا پہنچے...... اور اگر کر ہی لی تھی تو نبھانا تھا نا بھیا...... تم سے اچھا تو تمہارا بھائی منعم ہے...... کہنے کو تم سے چھوٹا مگر عقل میں بڑا...... مرد کو زیب نہیں دیتا کہ عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اسے بھٹکنے کو چھوڑ دے۔''
''پچھتا رہا ہوں بھابی۔''
''ابھی کیا...... ساری زندگی پچھتاؤ گے۔''
مدثر نے سر جھکا لیا، کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''ان لوگوں سے پروگرام طے کر کے بتائیں گی نا بھابی۔''
ثریا نے نادر کو دیکھا۔ ''ایسی باتیں کوئی فون وون پر تھوڑی پوچھی جاتی ہیں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کی جاتی ہے۔ ہم دونوں ان کے گھر چلے جائیں گے وہیں بیٹھ کر بات کر لیں گے...... کیوں؟''





''ٹھیک ہے۔'' نادر نے مدثر کو دیکھا اور کہا۔ ''ویسے انکل آنٹی جاتے تو اچھا تھا۔''
''یار تمہیں تو ڈیڈی کا پتا ہے نا...... بس شو آف میں رہتے ہیں۔''
''ایک نہیں دو زندگیاں برباد کر دیں تم نے...... تسنیم کی بھی اور اپنے آنے والے بچے کی بھی۔'' ثریا نے مدثر کو پھر بے نقط سنانی شروع کیں — کو پھر بے بھنے لگائیں۔
مدثر کا سر دوبارہ جھک گیا۔ وہ فطرتاً برا نہیں تھا۔ آسائشوں کی فراوانی، دوستوں کی غلط صحبت، خطاؤں سے والدین کی نظر اندازی اور کھلے ہاتھوں ماں باپ کی طرف سے ملنے والے جیب خرچ کے جا بے جا بے دریغ استعمال نے اس کی شخصیت میں کجی پیدا کر دی تھی۔ اپنے کیے پر نادم تھا اور جب سے تسنیم کے پریگننٹ ہونے کی خبر سنی تھی دل کو مسلسل پچھتاوے سے دوچار پا رہا تھا۔ کاش! وقت کا پہیہ الٹا بھی گھمایا جا سکتا تو وہ وقت کو پیچھے لے جاتا مگر افسوس کہ ایسا ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

حجاب بستر پر لیٹی ٹکٹکی باندھے چھت گیر پنکھے کی تیز دائروی حرکت میں اپنی نظریں الجھائے گہری سوچوں میں غلطاں تھی...... کچھ عرصہ قبل زندگی کے نقوش کیا تھے اور اچانک کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے نین نقش اتنے بدل جائیں گے۔ عدالت میں اگلی پیشی کا دن نزدیک آ رہا تھا۔ صبح ہی اس کی اپنی وکیل سے فون پر بات چیت ہوئی تھی۔ فون وکیل ہی نے کیا تھا۔ الطاف نے اسے اپروچ کیا تھا کہ اگر وہ کسی بھی طرح حجاب کو اپنا دعویٰ واپس لینے پر آمادہ کر سکے تو وہ اسے اس کی خدمت کا منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھا۔
''تو پھر آپ نے کیا کہا وکیل صاحبہ؟'' حجاب نے پوچھا تھا۔
''میں نے ان سے کہا میرا کام اپنی مؤکلہ کا کیس لڑنا ہے...... اسے کسی نفسیاتی دباؤ میں لے کر دعویٰ واپس لینے پر آمادہ کرنا ہماری پیشہ ورانہ اخلاقیات کے خلاف ہوگا۔'' وکیل نے کہا پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''ویسے حجاب صاحبہ...... میرا خیال ہے آپ صحیح کر رہی ہیں...... عدالت میں سماعت کے دوران میرا اس شخص سے سامنا ہوا تھا تو میں صحیح اندازہ نہیں کر سکی تھی لیکن جب اس نے میرے چیمبر میں آ کر روبرو بیٹھ کر مجھ سے بات کی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ آپ کے لائق نہیں تھا بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ آپ اس کے لائق نہیں تھیں۔''
''آپ نے کیسے اندازہ کیا؟''
''بس...... ساری زندگی لوگوں سے ملتے، بات کرتے اور چہروں کو پرکھتے گزری ہے...... میرے ساتھی کہا کرتے ہیں تمہاری فیس ریڈنگ کی صلاحیت خدا کی دین ہے...... میرے اندر کوئی اسپارک سا ہے جو مجھے سامنے بیٹھے آدمی کے بارے میں بتا دیتا ہے کہ وہ اندر سے اُجلا ہے یا میلا...... اس شخص سے مل کر میرے دل نے کہا یہ اندر سے اتنا اُجلا نہیں جتنا باہر سے نظر آ رہا ہے...... دولت کی ریل پیل سے زندگی میں آسانیاں ضرور آ جاتی ہیں مگر خوشی اور مسرت، اطمینان اور سکون دولت سے نہیں خریدے جا سکتے...... اس کے لیے مرد اور عورت کی کیمسٹری ملنا ضروری ہے جبکہ وہ اور آپ قطعاً مختلف ہیں...... آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔''
''اپنوں کو ناراض کر کے وکیل صاحبہ'' اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''امی بھی بس پتا نہیں کس طرح میری حمایت میں کھڑی ہو گئیں...... بڑی بہن، بہنوئی، بھائی سبھی تو ناراض ہیں۔''
''صحیح فیصلے کی قیمت تو دینا پڑتی ہے میڈم۔''
''تھینکس گاڈ...... میری وکیل نے تو میرے فیصلے کو بغیر کسی تکرار کے درست سمجھا۔''



WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

''سوفی صد درست ہے آپ کا فیصلہ۔''

''میرے لیے دعا بھی کیجیے گا۔''

''شیور...... اچھا میڈم ...... میرا جی چاہا آپ کو تازہ ترین بتا دوں۔''

''بہت مہربانی...... خدا آپ کو جزا دے۔''

اس وقت بستر پر لیٹے اسے اپنی وکیل کی گفتگو پھر یاد آنے لگی تھی۔ دفعتاً سائیڈ ٹیبل پر دھرا اس کا موبائل مرتعش ہوا اور ڈسپلے اسکرین روشن ہوگئی۔ رِنگ ٹون اس نے بند کر رکھی تھی۔ وہ کہنی کے بل اٹھ بیٹھی اور ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا لیا...... ڈسپلے پر وہی نمبر تھا جس نے شام سے اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ عاجز ہو کر اس نے رِنگ ٹون ہی بند کر دی تھی۔ موبائل اس نے واپس رکھ دیا۔ مگر ہر تھوڑی دیر بعد رہ رہ کر ڈسپلے اسکرین روشن ہوتی رہی اور موبائل سیٹ تھرکتا رہا۔ تنگ آکر اس نے کال ریسیو کر ہی لی۔

''میڈم! فون کیوں نہیں اٹھاتی ہو۔''

''کیونکہ تم نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے شام سے۔'' وہ بھڑک کر بولی۔

''محبت میں تو ایسا ہی ہوتا ہے...... آئی لو یو۔''

''شرم کرو۔''

''آپ نے سنا نہیں جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔''

''جانتے ہو میری عمر کیا ہے۔''

''ارے میڈم محبت میں عمر نہیں دیکھی جاتی۔''

''لاحول ولا قوۃ۔''

''شیطان نہیں ہوں جو بھاگ جاؤں گا...... ویسے ایک بات بتائیں شیطان کے پاس کون سا سیٹ ہے؟''

اس نے دانت پیسے ''پتا چل جائے تو بتا دینا مجھے بھی۔'' اس نے نمبر بلاک کرنے کے لیے مقررہ ہندسے دبائے اور موبائل رکھ دیا۔ بند اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی اسکول سے آنے کے بعد بھی کوئی ضروری کال آجاتی تھی۔ رانگ کالز بھی کبھی کبھار آجاتی تھیں مگر یوں ہاتھ دھو کر اس سے پہلے کسی رانگ کالز نے عاجز نہیں کیا تھا اسے۔

☆☆☆

ثریا اور نادر نے اماں اور ابا سے بات کرنے کے بعد وہیں سے ڈیڈی کو فون کیا تھا۔ ''سر! ہم لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں...... بھابی تسنیم کے گھر...... انکل اور آنٹی سے بات ہوئی ہے، وہ کہتے ہیں جو دن تاریخ آپ دے دیں......کوئی مسئلہ نہیں۔'' ابا نے ہاتھ بڑھا کر نادر سے فون مانگا۔ نادر نے فون انہیں تھما دیا۔

''السلام علیکم جناب!''

''وعلیکم السلام!'' انتہائی سرد مہری سے جواب دیا گیا۔

''نادر میاں اور ثریا بیٹی آئے ہوئے ہیں آپ کا پیغام لے کر...... آپ اور بھابی صاحبہ بھی تشریف لاتے تو خوشی ہوتی۔''

''آپ کو کیا پتا ہمیں ایک مرتبہ آنے میں بھی کتنی شرمندگی محسوس ہوگی...... عزت دار لوگ ہیں ہم نا کہ نہیں۔''

ابا شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ نا کہ کہہ کر مدثر کے باپ نے انہی پر چوٹ کی تھی مگر صورت حال ایسی تھی کہ





تحمل سے کام لینا ضروری تھا۔ ''جناب! آپ جو تاریخ دے دیں سر آنکھوں پر۔''

''میرے پاس غیر ضروری باتوں کے لیے وقت نہیں ہے...... آپ نادر کو بتا دیں مجھے میسج مل جائے گا۔''

''جی بہتر۔'' ابا نے موبائل فون نادر کو لوٹا دیا۔

''جی انکل...... سٹرڈے رکھ لیں؟'' نادر نے فون دوبارہ کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''یار ویک اینڈ ہمارا رش ٹائم ہوتا ہے۔''

''تو پھر جمعہ؟''

''نمٹاؤ...... نمٹاؤ......'' بیزاری سے کہا گیا۔ لاؤڈ اسپیکر آن تھا۔ ڈیڈی کی آواز ابا، اماں، ثریا اور تقدیم نے بھی بخوبی سنی۔

''مبارک ہو انکل جمعہ فائنل ہوگیا۔'' نادر نے فون کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

ابا جنہیں اپنا دل بوجھل اور آنکھوں کے کنارے نم محسوس ہو رہے تھے گھائل لہجے میں بولے۔ ''ہوتا تسنیم کا باپ کوئی سرمایہ دار، کوئی جاگیردار، کوئی سیاست دان، کوئی بڑا بااثر افسر تو...... وہ دس دفعہ خود آتے اور کہتے آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔''

''اللہ نہ کرے جو اِن کی عزت آپ کی عزت ہو۔'' ثریا نے ترت کہا۔ ''اللہ مجھے معاف کرے...... غیبت ہوتی ہے مگر میں بتاؤں آپ کو مدثر کے باپ کی اصلیت...... بنا نکاح کیے ایک عورت رکھی ہوئی ہے علیحدہ کوٹھی میں......''

''بیٹی پھر بھی وہ عزت دار ہم بے عزت...... پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔'' ابا نے زندگی بھر کی تلخی کو زبان دی۔

ابا کی بے بضاعتی پر تقدیم کا دل رنجیدہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگر مدثر دولہا بن کر تسنیم کو بیاہنے کے لیے اس کے چار رشتے داروں کے سامنے جانے کے خیال سے خائف تھا تو تسنیم کی جان پر بھی بنی ہوئی تھی۔ اپنی کوکھ میں نمو پاتی نئی زندگی کو اس کی شناخت دینے کی خاطر اس کے باپ کی مطلقہ ہونے کے باوجود لوگوں کی نظر میں اس کی منکوحہ بن کر اس گھر کی دہلیز چڑھنا جس کی مستقل مکین بنا کبھی اس کا خواب ہوا کرتا تھا بے حد جاں سوز تصور تھا۔ طلاق سے پہلے کی بات اور تھی اس وقت یہ ناٹک رچایا گیا ہوتا تو نبھ جانے کا خیال اسے مطمئن رکھتا مگر طلاق کے بعد نئی صورتِ احوال میں وہ اس ناٹک کا مرکزی کردار ہونے کے خیال سے انتہائی اذیت میں تھی۔ ایک دو نہیں سیکڑوں خیالات و خدشات کوڑیالے سانپوں کی طرح پھن اٹھائے ڈسنے کو چلے آتے...... اک پلِ صراط سے گزرنے اور راہ میں مدثر کا سامنا ہونے کا خیال اسے لرزاں و ترساں کیے ہوئے تھا۔

صد شکر کہ زیادہ تر قریبی رشتے دار فیصل آباد یا پھر لاہور میں رہتے تھے۔ کراچی میں ایک خالہ تھیں جن کے شوہر دو سال قبل ہارٹ اٹیک سے چل بسے تھے اور ایک ابا کے تایا زاد بھائی جن سے کبھی کبھار ہی میل ملاقات ہوتی۔ ان دو گھرانوں کو اور آس پڑوس والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ تسنیم کے لیے اچھا رشتہ مل گیا تھا۔ لڑکا باہر جا رہا تھا وہ لوگ چاہتے تھے سادگی سے فوری شادی کر دی جائے اور ایک دن کو رخصتی بھی تاکہ دولہا دلہن میں انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے...... ولیمہ بعد میں ہونا تھا...... لڑکے کی واپسی پر جب اسے تسنیم کو اپنے ساتھ بیرون ملک لے جانے کے لیے وطن آنا تھا...... سننے والے تسنیم کی قسمت پر رشک کناں تھے...... سارا کریڈٹ تسنیم کی خوب صورتی



www.paksociety.com

کو دیا جا رہا تھا۔ لڑکی خوب صورت ہو تو قدر دانوں کی نظر میں آتے ہی چٹکیوں میں اُٹھ جاتی ہے اور قدر دان بھی کیسے...... رخصتی سے ایک دن پہلے جامع مسجد میں اتنی سادگی سے نکاح کہ لڑکی کے ولی، نکاح خواں، وکیل اور گواہان کے سوا کسی رشتے دار کو بھی نکاح میں شرکت کی زحمت نہیں دینی تھی۔ رخصتی کے موقع پر دونوں رشتے دار گھرانوں اور آس پڑوس کے آٹھ دس گھروں سے فی گھر ایک مہمان مدعو کیا جا رہا تھا۔ لڑکے والے اتنے بے لوث تھے کہ انہوں نے بقول اماں، سختی سے کہہ دیا تھا جہیز میں ایک سوئی نہیں چاہیے۔ لڑکی میکے کے پرانے اور سادہ کپڑوں میں رخصت ہوگی۔ نہ کوئی زیور نہ ہار سنگھار...... جو کرنا ہوگا سسرال جا کر کرے گی خدا رکھے کس چیز کی کمی تھی اس کے سسرال میں! نئے لباس، زیور اور ہار سنگھار سے اجتناب کا اصل سبب تو تسنیم کا طلاق کے بعد عدت میں ہونا تھا۔ دورانِ عدت ان سب چیزوں کی ممانعت کا لحاظ تو رکھنا تھا نا۔

تسنیم اپنی آنکھوں میں اداسی سموئے، لبوں پر خامشی کی مہر لگائے، تصویرِ بے سائباں و بے اماں بنی کبھی یہاں کبھی وہاں بیٹھ رہتی۔ وہ کمرا جس کے لیے بہنوں سے اس کے معرکے ہوا کرتے تھے کاٹ کھانے کو لگتا...... مدثر نے جیتے جی مار دیا تھا اسے...... خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ زندگی سے کنارہ ہی کر لیتی...... نوجوانی ہی میں کتنا بڑا گھاؤ لگا دیا تھا بے درد زندگی نے اس کے دل پر...... ساری زندگی بھی اس گھاؤ کی زخم بندی میں بتا دیتی تو ٹیسیں دل سے نہ جاتیں۔

اماں تسنیم کی طرف دیکھتیں تو ان کا کلیجا منہ کو آتا...... ابا دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کرتے نظریں چُراتے...... بہنیں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنی اس کی چاک دامانی دیکھے جاتیں...... کیا تھی وہ اور کیا بنا دیا تھا اسے اس کی ایک بھول نے...... مٹ گئی تھی گویا...... اگر لغزش نہ کھاتی تو آج باقی چار بہنوں کی طرح عزت اور امان سے ماں باپ کی چھایا تلے بیٹھی ہوتی...... اس شرمندگی، سوگواری اور بے یقینی کا سامنا کیوں ہوتا...... اگر اس گھر سے اس کی رخصتی گھر کی عزت بندھی رکھنے کو محض دنیا دکھاوے کی خاطر ایک رسم ہونے کے بجائے سچ مچ کی رخصتی ہوتی تو اس گھر میں کیا سماں ہوتا...... چاروں بہنیں خوشیاں منا رہی ہوتیں...... ہنستیں، مسکراتیں، ناچتیں، گاتیں اور تسنیم سے چھیڑ چھاڑ کرتیں مگر اس ناتک زدہ صورتِ حال نے انہیں دم بخود کر رکھا تھا۔ تقدیم کا رنج و کرب باقی تین بہنوں سے سوا تھا۔ شاید اس لیے کہ نہ تو وہ تمہید کی طرح گھر بیٹھی سیدھی سادی، خانہ داری اور ہر کس و ناکس کی خدمت گزار لڑکی تھی نہ ہی تعظیم اور تقدیس کی طرح الھڑ اور ناتجربہ کار...... گھر کے حالات اور زندگی کے لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں نے اُسے وقت سے پہلے ہی شعور و ادراک اور احساسِ ذمے داری کی ان منزلوں پر پہنچا دیا تھا جہاں بعض لوگ برسا برس کا سفر طے کر کے بھی نہیں پہنچ پاتے...... ابا کے ساتھ مدثر کے باپ کی رعونت اور اہانت آمیز رویّے نے اس کے قلب و روح میں جوار بھاٹا پھونک دیا تھا۔ کیا حق تھا اس شخص کا ابا کی اتنی توہین کرنے کا اور اولاد کی اولاد کو تو لوگ دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر سینے سے لگا لیا کرتے ہیں...... وہ کیسا خود غرض تھا کہ اسے اس کا نسب تک دینے کو تیار نہیں تھا...... تقدیم کو خوف تھا کہ تسنیم کے ساتھ نہ جانے کیا رویّہ اختیار کیا جائے اس گھر میں...... سوچوں اور فکروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ہمہ وقت اک سیلِ رواں کے مانند اس کے قلب و روح میں متحرک تھا۔ مدثر کے باپ کی رعونت کے مقابلے میں ابا کی بے بسی اور اس کی ماں کے طمطراق کے مقابل اماں کی لاچاری اس کے دل کو مسلسل کسک سے دوچار کیے ہوئے تھی۔ اس کا جی چاہتا ابا کی بے بسی اور اماں کی لاچاری کو کسی بھی طرح دھماکے دار ڈائنامائٹ میں تبدیل کر ڈالے...... کاش ایسی کوئی راہ ہوتی۔

(باقی آئندہ)

# یہی سچ ہے مگر

نظارت نصر

حسین آنکھوں کو میک اپ کے ذریعے اور نمایاں کرنے میں مصروف اس کے گورے مخروطی ہاتھ لمحے بھر کو رکے۔ اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک ادائے بے نیازی سے بولی۔

''او کم آن رخشی! تم کن ملاز ٹائپ باتوں میں الجھی رہتی ہو۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم اپنی دقیانوسی باتوں کو پکڑے ہر وقت نصیحت بی بی بنی رہتی ہو۔''



www.paksociety.com

اس کے رنگے ہوئے کٹاؤ دار لبوں سے نکلتے یہ لفظ بہت آرام سے برداشت کرنے کے قابل ہرگز نہیں تھے مگر میں اسے کچھ اور کہہ کر آ بیل مجھے مار والی کہاوت پر عمل کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی لیکن ابھی شاید رشکِ ماہ کا اُبال پوری طرح سے نکلا نہیں تھا۔

''یو نو...... اب تک کسی بھی لڑکے نے تمہاری طرف ہاتھ کیوں نہیں بڑھایا؟'' اس نے نہایت مہارت سے دوبارہ برش چلاتے ہوئے کہا۔ میں ہونق بنی اس کی شکل دیکھے گئی۔ جسے وہ مختلف زاویوں سے آئینے میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ گل افشانی کر رہی تھی۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر بولی۔

''تم ایک اچھی شکل وصورت کی مالک ہو، بال تمہارے بہت سلکی ہیں مگر تمہاری دقیانوسیت کی وجہ سے کسی اچھے کٹ کے بجائے گھٹنوں کو چھوتے ہیں اور ان کا سارا چارم ختم ہو جاتا ہے۔ شکل و صورت کو بھی تم نے کسی بھی طریقے سے کبھی اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قسم سے اگر تم چند دن میری شاگردی اختیاری کر لو تو ایک لائن ہو لڑکوں کی تمہارے پیچھے۔'' اس نے ایک ادا سے اپنے لیئرز میں کٹے بالوں کو جھٹکتے ہوئے میری ہستی کے گویا بخیے اُدھیڑے۔ میں دل ہی دل میں اس کی سوچ پر لاحول ولاقوۃ پڑھتی خاموش ہو رہی۔

''چلو آؤ یہاں بیٹھو، دیکھنا میں ابھی تمہیں کیسا نیا لُک دیتی ہوں، تم خود بھی پہچان نہیں سکو گی۔'' میری خاموشی کو وہ جانے کیا سمجھی کہ بڑے فیاضانہ انداز میں بولی۔ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول کی طرف اس نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

''اوہو بھئی، ایک تو تم سست بہت ہو، اب جلدی سے آ بھی چکو پھر فنکشن میں دیر سے پہنچیں گے تو پھپھو ناراض ہوں گی۔'' اور میں تو غش کھاتے کھاتے بچی۔ اپنے گھر کی سگھڑ، سیانی، پھرتیلی اور شریف بیٹی کی یہ دُرگت شاید کوئی اور نہیں بنا سکتا تھا۔ شاید میری متحمل مزاجی، تنک مزاجی میں بدلنے والی تھی کہ ممی نے کمرے میں جھانکا۔

''ارے رخشندہ! بیٹا یہاں کیوں بیٹھی ہو، دیر ہو رہی ہے، جلدی سے آ جاؤ...... اور ہاں گفٹ یاد سے لے لینا۔'' دراصل ممی جانتی تھیں کہ میں اور رشکِ ماہ ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ میں مشرق تھی تو وہ مغرب۔ ایک تو ہمارا آمنا سامنا ہی ایک دوسرے سے کم ہوتا تھا اور اگر ہو بھی جاتا تو سلام دعا کے بعد کبھی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔

ہونا تو آج بھی یہی تھا۔ سلام دعا کے بعد میں باہر چلی جاتی مگر رشکِ ماہ کا قابلِ اعتراض لباس دیکھ کر میرے اندر کی رخشی زندہ ہو گئی اور مصلحت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے اسے محتاط لفظوں میں ہی سہی اس کے لباس کے نامکمل ہونے کا احساس دلا دیا۔ پھر اسی کے جواب میں مجھے وہ کچھ سننے کو ملا جو ابھی میں بیان کر چکی ہوں۔

''اوکے ممی! میں آ رہی ہوں۔'' ممی کی پکار پر میں فوراً سے پیشتر کھڑی ہو گئی۔

رشکِ ماہ کے منہ کے زاویے بگڑ گئے مگر یہ وقت انہیں دیکھنے کا نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے اس کے کمرے کا دروازہ پار کیا اور ممی کے پیچھے ہی لاؤنج میں آ گئی۔ ممی میرے چہرے سے ہی جان گئیں کہ وہاں کے حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے لیکن انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تنبیہہ کی اور میں نے اپنے لفظ ہونٹوں میں ہی دبا لیے۔

''ارے رخشی بیٹا! تم تیار نہیں ہوئیں، اتنا بڑا فنکشن ہے اور تم اسی گھریلو حلیے میں وہاں جاؤ گی؟ آپا برا مانیں گی شہر کی کریم اس فنکشن میں آئی ہو گی۔''، تسنیم آنٹی نے کہا۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا کہ اس بات کا جواب اب ممی کے ذمے تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''ارے تسنیم! تم جانتی تو ہو کہ میں بچیوں کے زیادہ فیشن کرنے کے خلاف ہوں۔ میں نے ہی اسے سادگی سے تیار ہونے کو کہا تھا۔ تم رشکِ ماہ کو دیکھو اگر وہ تیار ہو گئی ہو تو چلیں۔''، تسنیم آنٹی نے کمال مہارت سے اپنے تاثرات چھپا لیے اور اٹھ کر رشکِ ماہ کو لینے چلی گئیں۔

''بیٹا! کوئی بھی ایسی بات مت کرنا جس سے خاندان میں باتیں بنیں۔ باقی بات گھر جا کر کریں گے۔'' میں نے ممی کی طرف دیکھا تو وہ آہستگی سے بولیں۔ میں نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔

میرے والد صاحب ایک فوجی انسٹرکٹر تھے اور ڈیپوٹیشن پر سعودی عربیہ میں ہوتے تھے۔ گھر میں ہم دونوں ماں بیٹی ہی ہوتے تھے۔ میرے پاپا کے ایک بڑے بھائی تھے میرے تایا جان، ان کا دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہوا بزنس تھا، رشکِ ماہ اور حیدر ان کے دو ہی بچے تھے۔ جیسے جیسے گھر میں دولت بڑھتی جا رہی تھی ان کے گھر میں وہی طور طریقے رائج ہوتے جا رہے تھے جو امراء نے اپنا رکھے تھے۔

تسنیم آنٹی شروع میں ایک سیدھی سادی خاتون تھیں جنہوں نے صرف میٹرک کر رکھا تھا مگر دولت کی ریل پیل نے انہیں نہ صرف گٹ پٹ کر کے انگلش بولنا سکھا دی تھی بلکہ وہ اب ہاف سلیوز اینڈ بیک لیس منی بلاؤز والی، مہین ساڑی باندھے، اونچا سا جوڑا بنائے خود کو اس دولت کا اہل بھی ثابت کر رہی تھیں۔

واپسی پر رشکِ ماہ پانچ انچ کی نوکیلی ہیل پر



خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ستمبر 2012ء...... عید سعید کی یادوں کے سنگ
قرضِ مسافت
طوائف کے ہزاروں روپ...... کبھی دھوپ میں چھاؤں اور کبھی سرد موسم میں انتقام کی آگ۔
آخری صفحات پر عائشہ فاطمہ کا سنسنی خیز شاہکار
چچ نامہ
ایک برہمن راجا کی سندھ کی زمین پر بادشاہت کا منفرد انداز...... راجا داہر کا تاریخی کردار......
ڈاکٹر ساجد امجد کی کاوش
کشکول
انوار صدیقی کے قلم سے معاشرے کے منفی کرداروں اور ہمزاد کے درمیان ایک انوکھی جنگ کا احوال
مسافر
زندگی کی رعنائیوں...... دل کی تنہائیوں اور جگ کی رسوائیوں کا مجموعہ......
ناصر ملک کے قلم کی روانی
جدائی
ہر دلعزیز قلم کار طاہر جاوید مغل کی محبتوں کا ایک منفرد انداز
اس کے علاوہ مرزا امجد بیگ کی جرح محفل شعر و سخن آپ کے خط
مزید
کاشف زبیر، مریم کے خان، زاہد نقوی، نظارت نصر، سلیم انور، تنویر ریاض کی سحر انگیز تحاریر



www.paksociety.com

لچکتی ہوئی ان کے ساتھ تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر استغفار پڑھ ڈالی۔ وہ باریک کپڑے کی بٹر فلائی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ اس کے کھلے بازوؤں نے پوری کر دی تھی۔

"میں اور رشی اپنی گاڑی میں آتے ہیں، آپ لوگ ایک گاڑی میں جائیں گی یا الگ الگ۔" ممی نے بنا کسی تاثر کے فوراً کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ، نو چچی! آپ کی پرانی بیلینو تو وہاں ہماری ناک کٹوا دے گی۔ آپ لوگ ہماری بی ایم ڈبلیو میں آجائیں۔ واپسی پر یہاں سے اپنی گاڑی لے لیجیے گا۔" رشک ماہ نے تکبر سے کہا۔ اس کھلی بے عزتی پر جہاں میرا چہرہ سرخ ہوا تھا وہیں ممی بھی خاموش ہو گئیں۔ تسنیم آنٹی نے فوراً بات کو سنبھالا۔

"اصل میں وہاں رش ہوگا، تو پارکنگ میں جگہ نہیں ملے گی اور پھر ایک گاڑی میں ہوں گے تو گپ شپ بھی رہے گی اور سفر اچھا کٹے گا۔"

"نہیں، ہم اپنی گاڑی میں ہی جائیں گے۔ واپسی پر وہیں سے گھر جانا ہے تو گاڑی کی ضرورت ہوگی۔" ممی نے گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اور آہستہ سے بولیں۔ میری عزتِ نفس بحال ہو گئی۔

"رشی ڈارلنگ! جلدی سے گاڑی نکلواؤ ہم آتے ہیں۔" رشک ماہ کو منہ کھولتے دیکھ کر تسنیم آنٹی نے کہا۔ وہ ماں کا اشارہ سمجھ گئی اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ ممی نے پرس میں سے چابی نکال کر میری سمت بڑھا دی۔ مجھے اپنی ممی پر ٹوٹ کر پیار آیا... عام طور پر مجھے ڈرائیو کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس وقت میری ڈاؤن ہوتی پرسنالٹی کو بوسٹ اپ کرنا مقصود تھا۔

"تھینک یو سو مچ ممی۔" میں نے سرشار لہجے میں کہا۔

"یو ویلکم ہنی، اب جلدی سے چلو۔" وہ مسکرائیں۔

میں نے فخر سے تنی گردن کے ساتھ اپنی بی ایم ڈبلیو کا دروازہ کھولا تو ساکت کھڑی رشکِ ماہ کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم بھی مہنگی گاڑی لے سکتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ملنا جلنا بہت عرصے سے موقوف تھا۔ پہلے تو ہم ماں بیٹی سعودیہ میں رہے۔ پھر حال ہی میں واپس آئے تھے کیونکہ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تھی۔ تب بھی ہم نے رہائش لاہور میں رکھی تھی جبکہ باقی سب لوگ اسلام آباد یا پنڈی میں رہائش پذیر تھے۔ اس سے پہلے ہماری صرف دو تین مرتبہ اسی طرح فنکشن کے موقع پر ہی ملاقات ہوئی تھی تب ہم ابھی سیٹل نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے رشکِ ماہ کو غریب محسوس ہوئے تھے۔ اب صورتِ حال دوسری تھی۔ رشک ماہ نے ایک لمحے سے بھی کم وقت میں خود پر قابو پایا اور مسکرا کر بولی۔

"امیزنگ......! تم لوگوں نے بتایا ہی نہیں کہ تم نے گاڑی بدل لی ہے۔" مجھے ایک کرارا سا جواب سوجھا تو تھا مگر ممی کی نصیحت کے پیشِ نظر میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

پھپھو، تایا جان سے بھی بڑی تھیں اور ایک بیورو کریٹ کی بیوی تھیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے کی منگنی کی رسم تھی اس لیے دل کھول کر خرچ کیا گیا تھا۔ شہر کا سب سے مہنگا ہال بک کرایا گیا تھا۔ پھپھو نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس گیدرنگ میں ہم ماں بیٹی کے علاوہ کوئی عورت دوپٹا اوڑھے ہوئے نہیں تھی۔ سب نے ایک جیسے جسم کو نمایاں کرتے لباس پہن رکھے تھے۔ ہمارا لباس ان سب سے الگ تھا، سو رویہ بھی الگ ہی اپنایا گیا۔ پھپھو نے ہمیں ایک طرف بٹھا دیا اور پھر تقریباً بھول ہی گئیں۔ لڑکیاں ایک سے ایک طرح دار تھیں مگر ان





میں سے کسی نے بھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کئی ایک کو میں نے تضحیک آمیز اشارے کرتے دیکھا۔ وہ لڑکوں کو میری طرف متوجہ کر کے جانے کیا کہتیں اور پھر اُن کے ہاتھوں پہ ہاتھ مار کر ہنسنے لگتیں۔

کسی بڑے فنکشن میں یہ میری پہلی شرکت تھی۔ میں پاکستان اور یہاں کے لوگوں سے بہت اچھی طرح واقف نہیں تھی کیونکہ پانچ سال کی عمر سے میں سعودیہ میں رہائش پذیر تھی لیکن یہ واقفیت جو مجھے ابھی مل رہی تھی بہت تکلیف دہ تھی۔ اگر اخلاقی اور مذہبی لحاظ کو نظر انداز کر... دیتی تب بھی جو کچھ اس فنکشن میں ہو رہا تھا میری برداشت سے باہر تھا۔ پھپھو کی دونوں بیٹیوں نے ہم سے سلام دعا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور اسٹیج پر لڑکوں کے ساتھ عجیب اچھل کود میں مصروف تھیں۔

رشکِ ماہ تتلی بنی یہاں سے وہاں اڑتی پھر رہی تھی اور میں نے تھوڑی دیر میں ہی نوٹس کر لیا کہ وہ بہت سے لڑکوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ پھپھو کی بیٹیاں بھی اسے ساتھ لیے لیے پھر رہی تھیں۔ میں کافی دلبرداشتہ ہو گئی۔ میری تربیت میری ممی نے خالص مشرقی اور مذہبی انداز میں کی تھی۔ مجھے فیشن کرنے کی مکمل آزادی تھی مگر مقررہ حدود کے اندر اور یہ حدود آج کل کے معاشرے میں دقیانوسیت بن گئی تھیں۔

"ممی آج کے بعد کسی بھی ایسے فنکشن میں آنا ہو تو اکیلے آئیے گا۔ میں ایسے رویے برداشت نہیں کر سکتی۔" میں نے ممی سے کہا۔

"ڈونٹ وری بیٹا! میرا خیال ہے کہ آئندہ ہمیں انوائٹ ہی نہیں کیا جائے گا۔ میں بھی خود کو اس گیدرنگ میں مس فٹ محسوس کر رہی ہوں۔" ممی نے بھی نظر انداز کیا جانا محسوس کیا تھا سو بولیں۔ باقی کا سارا وقت ہم دونوں نے فنکشن میں موجود لوگوں کے رویے اور چہرے پڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے بے اختیار سوچا۔

وہ جو کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ فنکشن میں جانے والی سادہ سی ہیروئن کو یا تو ہیرو پسند کر کے تعریفیں کرتا ہے یا پھر اس کی ماں یا دادی تو یہاں تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہ مت سوچیے کہ میں ایسا چاہ رہی تھی بلکہ میں یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ دور بھی گزر چکا تھا جب ایک بڑے اجتماع میں سے ایک دو ہی سہی سادگی اور مشرقیت کو پسند کرنے والے نکل آتے تھے۔ اب تو مشرقیت پر ہنسنے والے ہی ہر طرف دکھائی دے رہے تھے۔

صبح کے قریب فنکشن ختم ہوا تو پھپھو کو ہماری یاد آئی۔ ممی نے بنا کچھ جتائے ان سے اجازت طلب کی اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ اسی وقت نیند سے گلابی ہوتی آنکھوں کے ساتھ رشی ہمارے سامنے آگئی اور ضد کر کے ہمیں پھر اپنے گھر لے آئی۔ میں اس کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن جب اس نے اپنے کمرے میں بٹھا کر مجھے ان سات آٹھ لڑکوں کی وارفتگی کی داستانیں سنانا شروع کیں تو مجھے پتا چلا کہ وہ مجھ پر اپنی اہمیت جتانا چاہ رہی تھی۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔

"رشی! آخر تم اتنے سارے لڑکوں سے تعلقات بنا کر کیا کرو گی جبکہ تمہیں شادی تو کسی ایک سے ہی کرنی ہے۔" جب اس کی باتیں حد سے آگے بڑھیں تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"بدھو! اس سے میری ویلیو بڑھتی ہے، ایک تو مفت میں اتنی ساری چاہتوں کا مزہ ملتا ہے؛ دوسرے ان میں سے جو بھی مجھے حاصل کرے گا وہ ہمیشہ ایک فخر میں مبتلا رہے گا کہ اس نے مجھے اتنے لڑکوں سے جیتا ہے اور ہمیشہ میری قدر کرتا رہے



www.paksociety.com

گا۔''

نیند سے بند ہوتی میری آنکھیں اس کی بات سُن کر پوری وا ہوگئیں۔ یہ کس گورکھ دھندے میں الجھی ہوئی تھی وہ اور ستم ظریفی یہ کہ اسے اپنے عمل کی سنگینی کا ادراک بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے تئیں ایک بہتر مرد تلاش کر رہی تھی لیکن میں نے اسے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ سمجھانے کا نتیجہ میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

☆☆☆

چند دن قبل ہی میرا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور میں نے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ میری اس کامیابی نے جہاں ممی پاپا کو مسرور کیا تھا وہیں خاندان میں میری ذات اچانک ہی اہمیت کی حامل بن گئی تھی۔ پھپو اور تایا جی نے خصوصی فون کیے تھے اور ٹریٹ کا مطالبہ کیا تھا۔

پاپا بھی آگئے تو ممی نے ایک فنکشن رکھ لیا۔ قریبی عزیزوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ اس فنکشن میں رشکِ ماہ خصوصی طور پر آئی۔ ویسے بھی اب اس کی میرے ساتھ اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے اس فرینڈ کی ہر بات ہی مجھ سے شیئر کرتی تھی جسے اس نے جیون ساتھی کے طور پر منتخب کرلیا تھا اور عنقریب ان کی منگنی ہونے والی تھی۔ فنکشن میں وہ اسے ساتھ لائی تھی۔ وہ اپنی روش برقرار رکھے ہوئے تھی۔ میں نے ایک دوبار اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ اب تو صرف افراز پر توجہ دے مگر وہ اس فنکشن میں بھی کچھ لڑکوں کے ساتھ دوستیاں گانٹھ رہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہو رہی تھی کہ افراز کو برا لگ سکتا ہے۔ میں نے موقع پا کر یہ بات رشی سے کہہ بھی دی۔ وہ حسبِ عادت قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''اوکم آن یار! افراز کو پتا ہے کہ میں بہت سوشل ہوں۔ اسے بھلا کیوں اعتراض ہوگا اور ویسے بھی ایلیٹ کلاس میں یہ اسٹیٹس سمبل ہے۔ ڈونٹ یو وری یار۔'' اور مجھے خاموش ہو جا...

اس فنکشن میں، میں نے ایک چیز اور نوٹ کی کہ اس مرتبہ لڑکے مجھ سے بھی فری ہونے کی کو... کر رہے تھے جن میں سرِ فہرست حیدر اور پھپو... بیٹے تھے لیکن میری طرف سے مثبت جواب نہ... خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ شاید میری دقیانوسیت میرے والدین کی دولت اور میری شاندار کار... سبقت لے گئی تھی۔

☆☆☆

''رشی! میں مر جاؤں گی، میں......''

فون پر روتے ہوئے رشکِ ماہ... میرے حواس مختل کر دیے۔ وہ تو ہر وقت ہنستی ہنسا... رہتی تھی۔ پھر اس طرح بلک بلک کر رونا...... ا... ایک ڈیڑھ ماہ قبل ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔

''کچھ تو کہو رشی، ہوا کیا ہے؟ کیوں اپ سیٹ ہو تم؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''میں نے افراز کا گھر چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''واٹ!'' میں حلق کے بل چلائی لیکن اس نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا۔ خبر ایسی تھی کہ مجھے چین نہیں مل رہا تھا۔ میں نے فوراً افراز سے رابطہ کیا۔

''رشی فون اٹینڈ نہیں کر رہی خیریت تو ہے؟'' میں نے بات بناتے ہوئے پوچھا تو وہ پھٹ پڑا۔

''رشی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی۔''

''شادی کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔'' وہ زہرخند میں بولا۔





''آپ ہی بتادیں کیا حرج ہے۔'' میں نے جرح کی۔

''دیکھیں میں نے کہا تھا کہ مجھے اس کا اپنے کزنز کے ساتھ رات گئے گھومنا پسند نہیں، اس نے اس بات کا بتنگڑ بنا لیا اور اپنے گھر چلی گئی۔'' مجھے چند لمحے تو کچھ سوجھا ہی نہیں پھر میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں افراز صاحب! جب آپ نے اسے پسند کیا تھا وہ تب بھی ایسی تھی اور جہاں تک میری معلومات ہیں آپ اس بات پر خاصا فخر محسوس کرتے تھے کہ وہ لڑکی آپ کے حصے میں آئی ہے جس کے درجنوں طلب گار تھے اور آپ برملا اس بات کا اپنی محفلوں میں تذکرہ بھی کرتے تھے۔ اب اس نے کون سی نئی بات کر دی جس پر آپ کو اعتراض ہوگیا۔'' دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں منتظر رہی۔ چند لمحوں بعد افراز کی تھکی ہوئی آواز ابھری۔

''دیکھیں رخشندہ صاحبہ! میں پریکٹیکل اپروچ کا بندہ ہوں۔ جس چیز کا ادراک ہو جائے اسے تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ میں مانتا ہوں آپ نے ابھی جو کچھ کہا سب درست ہے لیکن میں ایڈمٹ کرتا ہوں کہ ہم چاہے کتنے بھی ایڈوانس ہو جائیں اندر سے وہی مشرقی مرد ہی رہیں گے جو اپنی بیوی کو کسی غیر سے ہنسی ٹھٹھول کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں فخر کرتا تھا کہ میری محبوبہ درجنوں لڑکوں کو چھوڑ کر میری بنی ہے اور وہ لڑکے مجھ پر رشک کرتے ہیں اور ہمیں دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں لیکن اب جبکہ وہ میری بیوی ہے تو جب وہ کسی غیر مرد سے اسپیشلی ان لڑکوں سے بات کرتی ہے جن سے ماضی میں اس کی دوستی رہ چکی ہے یا جو اس کے طلبگار رہے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے وہ مجھے چیٹ کر رہی ہے۔ آپ اسے میری تنگ نظری کہہ لیں میں اسے برداشت نہیں کر پا رہا۔ میں چاہتا ہوں وہ آپ کی طرح بن جائے۔'' وہ تھک کر چپ ہوگیا تھا۔ میں نے خاموشی سے اس کی طویل بات سنی اور آہستہ سے کہا۔

''اگر ہم ایڈوانس ہونے کے چکر میں اپنی روایات سے روگردانی نہ کریں تو ہماری زندگی بے شمار مسائل سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ آپ بھی تھوڑی نرمی سے کام لیں میں رشی سے بھی بات کرتی ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے گہری سانس لی۔

کتنا بھی بھاگ لے انسان لوٹتا واپس اپنی اصل کی طرف ہی ہے بس اب یہی تھا کہ ہمیشہ کی طرح قربانی عورت کو ہی دینا تھی۔ اب رشی کو اپنا گھر بچانے کے لیے کمپرومائز کرنا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ یہ کر گزرے گی کیونکہ میں اس کی محبت کی شدت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔

افراز نے چاہے اسے دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے حاصل کیا تھا مگر رشی نے اس سے سچی محبت کی تھی اور اس محبت کا تقاضا تھا کہ اب وہ انہی دقیانوسی باتوں کو اپنا لے جو اس کے شوہر کو پسند تھیں۔ اس کے شوہر نے اس کے عاشقوں کی لائن پر فخر کرنے کے بجائے اس پر پابندی لگادی تھی اور اب رشی کی محبت کو اس پابندی کو جھیلنا تھا۔ مجھے اپنی ممی کی کبھی کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔

''بیٹا! آج تمہیں لگتا ہے کہ تم زمانے سے پیچھے رہ گئی ہو لیکن دیکھنا ایک دن تمہیں لگے گا زمانہ تمہاری پیروی کر رہا ہے۔ تم بھیڑ چال کا حصہ مت بننا بلکہ ٹرینڈ سیٹر بننا۔ وہ رول ماڈل جس کی پیروی اور لوگ بھی کریں۔'' اور شاید ممی کی بات سچ ہوگئی تھی۔



www.paksociety.com

مکمل ناول

# مجھے ہے حکم اذاں

سکینہ فرخ

ارے چھوڑ چھاڑ کے اپنے سلیم کی گلی......
انارکلی ڈسکو چلی...........

میوزک فل والیوم میں بج رہا تھا اور ایک خوب صورت لڑکی اس گانے پر غضب کی پرفارمنس دے رہی تھی۔ محفل جوبن پر تھی، لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں اور خود اُن کے قدم بھی تھرکنے سے محفوظ نہیں تھے...... اس پذیرائی نے ڈانسر کے قدموں میں مزید بجلیاں بھردی



www.paksociety.com

تھیں۔

''کیا صفدر نے کسی اسٹیج ڈانسر کو بلوایا ہے؟ایک نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے برابر بیٹھے ...... شاہد سے سوال کیا۔

''ارے نہیں، یہ اسٹیج ڈانسر نہیں ہے، صفدر کی کزن ہے...... رباب۔'' شاہد نے ہنس کے جواب دیا۔ شاہد کے جواب پر میں نے ایک دوسری بھرپور نگاہ اس لڑکی پر ڈالی جس کا نام رباب بتایا گیا تھا۔ بڑے سے گلے والی بغیر آستینوں کی قمیص پر دوپٹے کا وجود ندارد تھا وہ اپنے آپ سے بے خبر ناچے چلی جارہی تھی۔

''اسے تو بالی وڈ میں ہونا چاہیے تھا، یہ یہاں کیا کررہی ہے۔'' شاہد نے اسے داد دیتے ہوئے کہا۔

''شاید اس کے اپنے دل کا ارمان بھی یہی ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''یہ مت بھولو کہ اس وقت تم لوگ صفدر کے گھر پہ موجود ہو اور آج اس کی مہندی کی تقریب ہے، آس پاس اس کے خاندان والے موجود ہیں کوئی سن لے گا تو کیا سوچے گا۔'' فرید جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا یقیناً دل ہی دل میں لاحول ولاقوۃ کا وِرد کررہا تھا ایک دم گھبرا کے سرگوشی والے انداز میں بولا۔

''تو ہم نے کیا کہا ہے بھئی، تعریف ہی تو کی ہے۔'' شاہد بے نیازی سے بولا۔

''ایسی تعریف شریفوں کے لیے برائی کے زمرے میں آتی ہے...'' فرید نے کچھ کہنا چاہا مگر شاہد نے درمیان ہی سے اس کی بات اچک لی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''او بھائی، آج کے دن تو معاف کردے...... خود بھی انجوائے کر اور... ہمیں بھی کرنے دے۔'' ان دونوں کو الجھتا چھوڑ کے میں نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے اردگرد دوڑائی۔

صفدر کے گھر کا وسیع وعریض لان بہترین سجاوٹ کا شاہکار نظر آرہا تھا۔ دولھا دلہن کے لیے خوب صورت اسٹیج بنایا گیا تھا جو فی الحال خالی تھا کیونکہ دولھا میاں اپنے کزنز کے ساتھ ناچنے میں مصروف تھے۔ ان گنت لڑکیوں میں یقیناً ایک اس کی ہونے والی دلہن بھی رہی ہوگی جو حسبِ توفیق اس رنگا رنگ محفل میں اپنا حصہ ڈال رہی تھی۔ دفعتاً صفدر کی نگاہ ہم پر پڑی اور وہ ہماری طرف چلا آیا۔

''ارے تم لوگ یہاں منہ چھپائے کیوں بیٹھے ہو، آؤ نا انجوائے کرو۔'' وہ شاہد کا ہاتھ پکڑ کے اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔ لیکن فرید نے شاہد کو کھینچ کے دوبارہ بٹھادیا۔

''نہیں یار تم لوگ انجوائے کرو...... ہم تو بس اب جانے لگے ہیں۔''

''کیا مطلب جانے لگے ہیں۔ اب رسم ہونے جارہی ہے پھر کھانے کی باری ہے، ابھی سے کیسے جاسکتے ہو تم لوگ۔'' وہ خفا ہو کے بولا۔

''ارے نہیں یار، فرید ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں اجازت دو، رات کافی ہوچکی ہے۔'' میں نے فرید کا ساتھ دیا۔

''ہرگز نہیں، تم لوگ ابھی بالکل نہیں جاسکتے...... بور ہوگئے ہو کیا؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں یار بور کیوں ہونے لگے...... اتنا زبردست ڈانس دیکھنے کے بعد کوئی پاگل ہی بور ہوگا، بہت غضب کی ڈانسر ہے تمہاری کزن۔'' شاہد ہنس کے بولا۔ فرید گڑبڑا کے صفدر کی شکل دیکھنے لگا۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ صفدر اپنی کزن کو ڈانسر کے لقب سے پکارے جانے پر برا منالے گا لیکن دوسری جانب صفدر پُرجوش ہو کے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ایسی ویسی...... زبردست ہے، واقعی زبردست۔ میں تو اس سے کہتا ہوں سب کچھ چھوڑ


www.paksociety.com

چھاڑ کر بالی وڈ چلی جاؤ بڑی بڑی بیسٹ کے چھکے چھڑوا دوگی۔ اوکے یار میں ذرا فریش ہو کے آجاؤں رسم کا وقت ہو گیا ہے۔ تم لوگ بھی ادھر ہی آجاؤ، جانا مت......" وہ ہمیں تنبیہہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

محفل اسی طرح جوبن پر تھی اب سارے دردِ ڈسکو پر ناچ ناچ کے پاگل ہو رہے تھے۔ اس بار تو چند ادھیڑ عمر خواتین و حضرات بھی اس کارِ خیر میں شامل ہو چکے تھے۔ جو خود کسی وجہ سے اس ہلڑ میں شامل نہیں ہو پائے تھے تالیاں پیٹ پیٹ کے اپنی بھڑاس نکال رہے تھے، مووی والا چابکدستی سے ایک ایک منظر کیمرے کی نگاہوں میں قید کر رہا تھا۔

"ویسے لائیو پرفارمنس کی بات ہی اور ہوتی ہے، کبھی کبھی نان پروفیشنلز بھی پروفیشنلز کو مات دے جاتے ہیں۔" شاہد نے پھڑکتے ہوئے جسموں کو بغور دیکھتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"یہ جو لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے پہ گرتے ہوئے، ناچ ناچ کے بے حال ہو رہے ہیں، ان کے ماں باپ بھی یقیناً اس محفل میں موجود ہوں گے۔" فرید لیکا یک چڑ کے بولا۔

"ہاں ظاہر ہے، یہ ایک فیملی فنکشن ہے، سب کے ماں باپ ادھر ہی موجود ہوں گے، کیوں کیا بات ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ لوگ اپنی بے لگام اولاد کو اس بے ہودگی سے روک نہیں سکتے ہے" وہ بدستور ناراض لہجے میں بولا۔

"بے ہودگی...... بے وقوف، تم کتنے دقیانوسی انسان ہو، بے چارے بچے تھوڑا ناچ گا کر اپنا دل خوش کر رہے ہیں اور تم اسے بے ہودگی کہہ رہے ہو تو اس میں تمہارے ذہن کا فتور ہے۔" شاہد نے فرید کو چھیڑا۔

"نہ تو یہ ذرا سا ناچ گانا ہے اور نہ ہی یہ بے چارے بچے ہیں اور مجھے جو لگا وہ میں نے کہا، حیرت تو مجھے ان کے ماں باپ پر ہے، بچوں سے زیادہ مجھے وہ لوگ بگڑے ہوئے نظر آرہے ہیں جو اپنے بچوں کو سمجھا نہیں سکتے۔" فرید کا غصہ اور بڑھ گیا۔

"ارے توبہ توبہ، کیسی باتیں کر رہے ہو، ماں باپ خوش ہو رہے ہیں اور تم جل رہے ہو ان کی خوشی دیکھ کر، اگر کسی نے سن لیا تو ناراض ہو جائے گا۔" شاہد نے جلتی پہ تھوڑا اور تیل پھینکا اور حسبِ توقع فرید بھڑک اٹھا۔

"سن لیا تو ناراض ہو جائے گا...... کمال ہے!" فرید نے اس کا جملہ دہراتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "نوجوان لڑکیاں آدھے کپڑوں میں ناچ رہی ہیں تو کوئی ناراض نہیں ہوا، نوجوان لڑکے بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں، کسی کو برا نہیں لگا، سارے لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں تو کوئی خفا نہیں ہوا۔ مووی والا ایک، ایک لڑکی کے ہر انداز کو کیمرے میں محفوظ کر رہا ہے، خود انجوائے کر رہا ہے بعد میں یاروں، دوستوں کو کروائے گا اور خدا جانے اس وڈیو سے کون کون سے مقاصد حاصل کرے گا... اس پر بھی کوئی ناراض نہیں ہے...... صرف میری بات سن لی تو ناراض ہو جائیں گے یہ لوگ...... تو ہو جائیں ناراض، میری طرف سے بھاڑ میں جائیں اور اب میں یہاں مزید بیٹھ نہیں سکتا... جا رہا ہوں میں۔" فرید بڑی بوڑھیوں کی طرح کوسنے دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اے بھائی بیٹھ جا...... دوستی کا معاملہ ہے، دوست ناراض ہو جائے گا اگر ہم اس طرح اٹھ کر چلے گئے تو۔" میں نے فرید کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے اکھڑ گیا۔

"آدھی رات ہو چکی ہے، ابھی رسم کا آغاز ہونے جا رہا ہے خدا جانے کون کون سی الم غلم رسمیں


www.paksociety.com

پوری کی جائیں گی، اس کے بعد کھانا...... نہ بابا مجھے تو معاف ہی کرو...... تم دونوں کی تو خیر ہے اپنا ذاتی بزنس ہے جلدی جاؤ دیر سے جاؤ یا سرے سے نہ جاؤ مگر میرا مسئلہ ہے، نوکری کرتا ہوں میں۔'' فرید نے ہمارے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے شاہد کی طرف دیکھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، ایسا کرو تم یہاں ٹھہرو...... میں اور فرید نکل جاتے ہیں' امید ہے صفدر کو اس ہنگامے میں ہمارا خیال نہیں آئے گا لیکن اگر آ گیا تو تم ہو گے ہماری طرف سے معذرت کرنے کو۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تم کو بیٹھنا ہے تو بیٹھو میں چلا جاؤں گا۔'' فرید جلدی سے بولا۔ وہ میرے ساتھ آیا تھا، اس کے پاس ذاتی سواری نہیں تھی، سوائے گھر تک پہنچانا بھی اخلاقی طور پر میری ذمے داری تھی۔

''میں تو خود جانا چاہتا ہوں تم خوامخواہ ٹینشن مت لو...... چلو کہیں صفدر کی نگاہ اِدھر نہ پڑ جائے......'' میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بچتے بچاتے گیٹ سے نکل آئے۔

رات کا سناٹا پھیل چکا تھا جو بے تحاشا شور کے ماحول سے باہر آنے کے بعد اور زیادہ محسوس ہو رہا تھا...... گاڑی میں نے فرید کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ اس کے تپے تپے انداز کو ہلکا کرنے کے لیے میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں مگر وہ ہاں، ہوں سے زیادہ جواب نہیں دے رہا تھا۔

''کم آن فرید...... اتنا ٹینس کیوں ہو رہے ہو...... بھول جاؤ جو کچھ دیکھا۔''

''نہیں یار میں کیا کروں...... مجھے بہت کوفت ہوتی ہے اگر میں کسی لڑکی یا عورت کو کسی بُرے حلیے یا بری حرکت میں ملوث دیکھتا ہوں۔ میرے نزدیک عورت ایک قابلِ احترام ہستی ہے جو ہم جیسے مردوں کو جنم دے کر اس دنیا میں لاتی ہے...... ہر مرد کی ماں ایک عورت ہی ہے ناں......'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

''مگر ہر عورت ہر مرد کی ماں نہیں ہوتی......'' میں ہنسا۔

''عورت تو ہوتی ہے ناں......'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہاری بات درست ہے مگر اس سلسلے میں، میں تم یا کوئی اور کیا کر سکتے ہیں اگر عورت خود ہی اپنا مقام پہچاننے سے انکار کر دے اور خود کو ارزاں کر کے دوسروں کی تفریح کا ذریعہ بنا لے۔'' میں نے کندھے اچکائے۔

''سارا الزام عورت کو مت دو...... اس میں کہیں نہ کہیں مرد کا ہاتھ ضرور ملوث ہے جس نے عورت کو ورغلایا اور اس کو گھر جیسی محفوظ پناہ گاہ سے باہر لا کھڑا کیا۔ پہلے یہ بُرا وقت مغرب کی عورت پر آیا، نام نہاد آزادی کے نام پر وہ اپنے لباس، گھر، شوہر اور بچوں سے محروم کر دی گئی۔ آج وہاں پر اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو فقط کمانے کی مشین بنی ہوئی ہیں جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے، کوئی گھر یا گھر والا نہیں ہے...... ڈپریسڈ اور پریشان...... خود کو بھیڑ میں اکیلا پاتی ہیں۔ اب یہ وبا ہمارے ہاں بھی پھیلنے لگی ہے، پہلے چادر مصیبت بنی پھر دوپٹا بوجھ بن گیا اور اب آستینوں سے بھی نجات حاصل کر لی گئی ہے۔ پہلے گھر اور گھر کی ذمے داری ناقابلِ برداشت ہوئی اب گھر بیٹھنا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔ اپنے لیے جینے کا تصور مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا یہی نام نہاد ترقی ہے......؟'' وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔

''چھوڑو یار، ذرا سی بات پر اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے...... کرنے دو لوگوں کو جو کرنا چاہتے ہیں، ہمارا کیا جاتا ہے، لڑکیاں میڈیا سے سخت متاثر ہو چکی ہیں اداکاراؤں اور ماڈلز کے لباس اور اسٹائل کو



www.paksociety.com

کاپی کرنے لگی ہیں، ہر ایک خود کو کسی نامور ہیروئن کی طرح سمجھتی ہے اور اس جیسا بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے۔'' میں نے فرید کو سمجھایا۔

''فلمی اداکاراؤں اور عام لڑکیوں میں فرق ہوتا ہے یار......'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ ہیروئنز ہوں یا ماڈلز ان کا تو پروفیشن ہی یہی ہے۔ وہ اچھا کر رہی ہیں یا برا...... یہ ایک الگ مسئلہ ہے مگر وہ اپنے حسین چہروں، خوب صورت جسموں اور رنگین اداؤں کے لاکھوں کما رہی ہیں مگر ایک عام لڑکی کو ان کے اسٹائل کی نقالی کے بعد کیا حاصل ہو رہا ہے۔ اپنی بے باک نمائش کے بعد وہ کیا کما رہی ہیں......؟ صرف گناہ...... جو لوگ انہیں دیکھ کر انجوائے کرتے ہیں وہی ان کے پیچھے ان کے خلاف باتیں بھی کرتے ہیں، ان کے ماں باپ اور پورا خاندان پھر ان کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا ہے......'' وہ افسوس سے بولا۔

''ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو، جو کچھ فیشن کے نام پر ''اِن'' ہو جائے لوگ اس کی اندھی تقلید میں جُت جاتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط......'' میں نے گاڑی سگنل پر روکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں مانتا ہوں دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے، کل تک جو چیزیں کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھیں آج وہ دسترس میں موجود ہیں، ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ جو چیز صبح میں اِن ہوتی ہے شام تک آؤٹ ہو چکی ہوتی ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دیا تو وہ کئی صدیاں پیچھے چلے جائیں گے۔''

''یہی قربِ قیامت کی نشانی ہے میرے بھائی' جب سال مہینے میں، مہینے ہفتے میں، ہفتے دن اور دن لمحوں میں تبدیل ہو جائے گا......'' سگنل کھل چکا تھا میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''پھر بھی لوگ عبرت نہیں پکڑتے، قیامت کو نزدیک پاتے ہیں مگر اس کی تیاری کا نہیں سوچتے...... بلکہ مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اپنی روایات بھولتے جا رہے ہیں۔'' وہ دکھ سے بولا۔

''اسی لیے تو انسان کو غافل کہا گیا ہے اگر غافل نہ ہوتا تو سامنے نظر آنے والی حقیقت سے منہ نہ موڑتا۔'' میں نے گاڑی اس کے گھر جانے والی سڑک پر موڑتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا گھر آ چکا تھا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے اتر گیا۔ میں نے گاڑی کا رخ دوبارہ ڈیفنس کی طرف کر لیا۔ دو منٹ بھی اور رکتا تو اس سے ''زحمت ہوئی، شرمندہ ہوں'' قسم کے دو چار جملے اور سننے پڑ جاتے۔ آج اس سے اتنے سنجیدہ موضوع پر ٹھیک ٹھاک قسم کی گفتگو ہو چکی تھی کہ میرا دل کسی قسم کا میوزک سننے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اس کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگا۔

میری، فرید، صفدر اور شاہد سے کالج کے زمانے سے دوستی تھی جو یونیورسٹی آنے کے بعد اور مضبوط ہو گئی پھر پریکٹیکل لائف میں قدم رکھنے کے بعد بھی ترو تازہ ہی رہی۔ میرے پاپا بہت ہی کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ اپنے تینوں بیٹوں کو اپنے بزنس میں ہی شامل کرنا چاہتے تھے، بڑے دو بھائی تو آرام سے ان کی بات مان چکے تھے اور بزنس میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن میں جو شروع ہی سے تخلیقی اور تخیلاتی ذہن کا مالک تھا کسی طور بزنس کے اَسرار و رموز سمجھنے پر آمادہ نہ ہوا اور شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول بیٹھا...... پاپا اس حرکت پہ بہت نالاں تھے' ان کا خیال تھا کہ یہ میرا چار دن کا

شوق ہے پھر میں لوٹ کر ان ہی کے بزنس کی طرف آؤں گا اور ایکسپورٹ امپورٹ کی دنیا میں ان کا نام روشن کروں گا مگر یہ چار دن کامیابی کے ساتھ چار سالوں پر محیط ہو چکے تھے اور آج میرا اور میری ایجنسی کا پورے ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی ایک نام تھا۔ انہیں بھی یقین آ گیا کہ میں واقعی سنجیدہ ہوں اور اب ان کے پاس مجھے میرے حال پر چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

پاپا سے زیادہ میری دوستی ماما کے ساتھ تھی۔ ماما ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دولت مند خاندان سے بھی تعلق رکھتی تھیں مگر انہوں نے اپنی زندگی اپنے کیریئر اور اپنی ذات کو محور بنانے کے بجائے اپنے گھر، شوہر اور بچوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ گھر میں ہر کام کے لیے نوکر موجود تھا مگر ماما ہر جگہ خود موجود رہتیں۔ پورا گھر ان کے سلیقے اور نظم و نسق کا شاہکار نظر آتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں پکنک، پارٹی، فیشن اور میک اپ کا دلدادہ نہیں پایا...... ان کے اندر ایک وقار ایک رکھ رکھاؤ تھا، شاید ان کی ذات کی خوبیاں اچھی ماؤں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی اس تربیت کا نتیجہ تھیں جو کسی کتاب میں ملتی ہیں اور نہ کسی ادارے میں سکھائی جاتی ہیں بلکہ ایک مقدس امانت کی طرح ماں اسے اپنی اولاد میں منتقل کرتی ہے۔ چھوٹا ہونے کے ناتے میں ان کا لاڈلا تھا۔ اس لیے ان سے بہت زیادہ قریب بھی، جتنا میں نے ان سے سیکھا تھا شاید بڑے بھائیوں کے حصے میں نہیں آیا تھا اور اب تو وہ دونوں اپنے اپنے بیوی بچوں میں مصروف تھے...... میں بدستور اس سعادت سے محروم تھا کیونکہ نہ تو مجھے کوئی اتنی بھائی کہ زندگی کا ساتھی بنا کے گھر لے آؤں اور عجیب اتفاق تھا کہ بڑے دونوں بھائیوں کی شادیاں جھٹ پٹ کر دینے والی ماما کو بھی میرے لیے کوئی اتنی پسند نہ آسکی جسے وہ اپنی چھوٹی بہو بنانے کا اعزاز بخشتیں...... سچی بات ہے میں بہت خوش تھا کہ ابھی تک اس جھنجٹ سے آزاد ہوں، ایک انجانا سا خوف، ایک اندیشہ تھا جو شاید میرے لاشعور میں موجود تھا۔ میرے خاندان کی لڑکیاں، جاننے والیاں، کولیگس ہوں یا میرے پروفیشن سے وابستہ خواتین، ان سب میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب کی سب الٹرا ماڈ تھیں...... خوب صورت، بجی سنوری، تعلیم یافتہ اور منہ پھٹ...... اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں شریکِ حیات کا جو تصور موجود تھا وہ بہت مختلف تھا۔ خواتین کی شخصی آزادی، اعلیٰ تعلیم اور خود کو منوانا، میں ان...... کے خلاف نہیں تھا لیکن ان سارے کاموں کو حدود میں رہتے ہوئے عزت و وقار کے ساتھ کرنے کا حامی تھا۔

عورت کو بھی اللہ تعالیٰ نے مردوں ہی کی طرح انسان بنایا ہے۔ عقل و دانش اور صلاحیتیں عطا کی ہیں تو پھر وہ کیوں نہ اس کا استعمال کرے لیکن مرد تو خود کو منوانے کے لیے اپنی مردانگی کا خون نہیں کرتا، نامکمل لباس، جسم کی نمائش اور حسن کے ہتھیاروں سے کام نہیں لیتا پھر عورت کیوں ان چیزوں کو ترقی کے ساتھ لازم و ملزوم کر دیتی ہے......؟ کیا وہ فقط اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی......؟ فیشن اور وہ بھی حد سے بڑھا ہوا فیشن جہاں اس کی اصل شخصیت کہیں چھپ جاتی ہے اس کی طاقت ہے یا کمزوری......؟ میرا خیال ہے کہ کمزوری...... میرے لاشعور کا خوف آج باہر آ گیا تھا...... مذاق مذاق میں شروع ہونے والی گپ شپ نے مجھ پر یہ آشکار کیا تھا کہ میں ایسی خواتین سے خوف زدہ تھا۔ میرے تصور میں جو نسوانیت کا پیکر موجود تھا اس کا فی زمانہ نظر آنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں جس فیلڈ میں تھا اس روشنی کی دنیا کے اندر تاریکی مجھ پہ اچھی طرح ظاہر ہو چکی تھی۔ میں کوئی زاہد خشک نہ تھا

www.paksociety.com





لیکن مجھے بدکردار یا آوارہ مزاج ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کچھ حدود تھیں جن کی پاسداری میں اپنے اوپر فرض سمجھتا تھا۔ کئی لڑکیوں سے میری واقفیت تھی کچھ میری ٹیم میں کام کرتی تھیں اور دو چار سے اچھی دوستی بھی تھی...... ان سب کے علاوہ ایک آدھ ایسی بھی تھیں جو مجھ پر مرنے کے لیے دل و جان سے تیار تھیں لیکن میری نگاہوں میں کچھ عزت بھی تھی۔ میں زندگی کے سارے معاملات میں دیانت کا قائل تھا تو بھلا اتنے اہم معاملے میں بددیانتی کیسے کر جاتا۔ صفدر اور شاہد میرے اس فلسفے کا بہت مذاق اڑاتے تھے کیونکہ ان کا نظریہ مجھ سے یکسر مختلف تھا۔ البتہ فرید مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ وہ تو خواتین سے ایسے بدکتا جیسے گھوڑا سانپ سے۔ بات چیت سلام دعا ایک طرف وہ بندۂ خدا ان کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے تک کا روادار نہ تھا۔

شاہد کا خیال تھا کہ چونکہ فرید کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے اس لیے اس کی سوچ اتنی دقیانوسی ہے لیکن اسے حیرت میرے اوپر ہوتی۔ ہائی سوسائٹی سے تعلق اور پھر ایسی دھماکا خیز فیلڈ کے باوجود میرا رویہ اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ ایک وہی نہیں میرے اکثر جاننے والے مجھے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے پرہیز کرتا دیکھ کر میرے بارے میں یا تو مشکوک ہو جاتے یا شرافت کا سرٹیفکیٹ تھما جاتے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کون میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے، میرے اپنے اصول تھے اور میں اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ امی ہر صورت میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر میری پسند پوچھتیں اور مجھے سمجھ میں نہ آتا کہ انہیں کیا جواب دوں...... مجھے اردگرد سیکڑوں چہروں میں ایسا کوئی چہرہ نظر ہی نہ آتا جسے دیکھ کر میرا دل زور سے بولے...... ہاں...... دوسری طرف امی تھیں شاید ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا کہ کوئی چہرہ ابھی تک انہیں بھی نہیں بھایا تھا سو معاملہ جہاں کا تہاں اٹکا ہوا تھا۔

گھر آ چکا تھا...... میں نے سوچوں کے بہاؤ کا رخ اپنی کل کی پلاننگ کی طرف موڑ دیا۔ کل مجھے بہت کام کرنے تھے۔ نئے کلائنٹس کے ساتھ میٹنگ تھی، کچھ نئے پروجیکٹ کے لیے لوکیشن فائنل کرنا تھی، وغیرہ وغیرہ۔ گاڑی گیرج میں پارک کرتے ہوئے میں اندر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

میرا معاملہ تو تذبذب کا شکار ہی رہا البتہ فرید اپنی شادی کے کارڈ سمیت وارد ہو گیا۔ اتفاقاً اس دن شاہد بھی مجھ سے ملنے آیا ہوا تھا...... صفدر تو شادی کے بعد بیوی ہی کا ہو کے رہ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ پچھلے دو ماہ سے امریکا گیا ہوا تھا جہاں اس کی بیوی کے اماں، ابا یعنی اس کے ماموں، ممانی مقیم تھے۔ شاہد بھی کبھار آ جاتا، فرید کا آنا کافی کم ہو گیا تھا۔ غمِ روزگار چیز ہی ایسی ہے جو دوستیاں نبھانے کا موقع نہیں دیتی۔

"بلے بھئی بلے، چھپے رستم نکلے تم تو۔" شاہد نے بے تکلفی سے فرید کے شانے پہ دھپ رسید کی۔ مجھے بھی اس خبر سے دلی مسرت ہوئی تھی سو اُسے گلے لگا کر مبارک باد دی۔

"لیکن یار یہ کیا... نہ مہندی کا بلاوا نہ شادی کا...... سیدھے سیدھے ولیمے کا کارڈ...... کیوں بھئی ہم غیر ہیں کیا؟" شاہد نے کارڈ دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگ تو میرے عزیز ترین دوست ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ مہندی، مایوں وغیرہ نہیں ہو رہا ہے۔ نکاح بھی مسجد میں ہوگا جہاں خاندان کے چند بزرگ میرے ہمراہ ہوں گے۔ صرف دعوتِ ولیمہ کی تقریب ہو گی وہ بھی

مسنون طریقے پر......'' وہ مسکرا کے بولا۔

''ارے واہ...... یہ کیسی بات؟ مہندی نہیں ہوگی تو شادی کا مزہ بھلا کیا آئے گا۔ سارا ہلا گلا رونق میلا مہندی میں ہی ہوتا ہے۔'' شاہد نے اعتراض کیا۔

''آج کل ہونے والی مہندیوں کا حشر دیکھ کر ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور ویسے بھی یہ کوئی لازمی تقریب نہیں جس کے بغیر نکاح ادھورا رہ جائے۔'' فرید نے اس کا اعتراض مسترد کردیا۔

''صفدر کی مہندی کی تقریب بھی یہ درمیان سے چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں صفدر کتنا ناراض ہوا تھا۔'' شاہد کو کچھ یاد آ گیا۔

''اسی مہندی کی تقریب ہی نے تو مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔'' فرید نے فوراً کہا۔

''کیوں، کیا تھا اس مہندی میں...... یا مہندی کی رسم میں کون سی خرابی نظر آئی تم کو۔ شادی کی خوشی میں تھوڑا سا گانا بجانا، ناچنا ہی تو ہوتا ہے، اس سے تمہیں کیا تکلیف پہنچتی ہے۔'' شاہد نے منہ بنایا۔

''مہندی کی رسم کا آغاز ابتداً تو ایسے ہی ہوا تھا شادی سے کچھ دن پہلے مایوں، مہندی کی رسمیں، تحفے تحائف دیے جاتے تھے، تھوڑا سا گانا، بجانا، کچھ ہلا گلا اور کھانا پینا، دلہن کو ابٹن مہندی لگائی جاتی تھی۔ سہاگنیں شگن کی رسمیں پوری کرتی تھیں۔ گو اس تقریب کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں تھی مگر لوگوں نے ٹی وی فلموں وغیرہ میں دیکھ کر کچھ علاقائی رسوم کے زیرِ اثر اس تقریب کو منعقد کرنا شروع کردیا تھا۔ بظاہر شادی کی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے مگر گزرتے وقت نے اس کو جس بری طرح بگاڑا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اس میں اب دکھاوا، نمود و نمائش اور بے راہ روی داخل ہوگئی ہے اور اس معصوم سی تقریب کا ستیاناس ہو کے رہ گیا ہے۔'' فرید کہہ رہا تھا اور مجھے اس کی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔

''بڑی معلومات ہیں تمہیں مہندی کے بارے میں لگتا تو نہیں شکل سے۔'' شاہد نے چوٹ کی۔

''میں آنکھیں کھلی رکھتا ہوں میرے بھائی...... جب میں چھوٹا بچہ تھا اور خاندان میں ایسا کوئی فنکشن ہوتا تھا تو امی کے ساتھ میں بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ سب کچھ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔'' وہ بولا۔

''بھائی کو بچپن ہی سے ''دلہن'' اچھی لگتی ہیں۔'' شاہد شرارت سے بولا۔ جس پر میں زور سے ہنسا اور فرید جھینپ گیا۔

''بکو مت...... اور ہاں مہمانوں کی طرح ٹائم پر مت آنا، کچھ پہلے آجانا بہت کام ہے۔'' وہ ہمیں آنے کی تاکید کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

دوست کی شادی تھی...... خواہ سادگی ہی سے ہو رہی ہو، رنگ تو جمانا تھا، اس کے جانے کے بعد میں اور شاہد اس کی شادی کی ہی پلاننگ کرتے رہے۔

☆☆☆

فرید کے ولیمے کی تقریب حسبِ توقع انتہائی سادہ تھی۔ عورتوں اور مردوں کے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ شاہد سخت کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ فرید کے تایا، خالو اور ماموں قسم کے بزرگوں سے مل کر، اپنے سر پر ہاتھ پھروا پھروا کے اس کا میٹر بالکل گھوم چکا تھا۔ دو دفعہ تو اس نے اٹھ کے جانے کا اردہ کیا مگر میں نے اسے کھینچ کھانچ کر بٹھا دیا۔

''یہ ولیمے کی تقریب ہے یا فرید کے قُل......'' وہ جل کے بولا۔

''بکو مت، آرام سے بیٹھے رہو۔'' میں نے اسے جھڑکا۔

''بڑا احسان کیا فرید نے مجھ پر جو مہندی اور شادی کی تقاریب اسی دھوم دھام سے کر کے مجھے اس میں مدعو نہیں کیا...... ورنہ اس قدر با پردہ میرے حساب سے ''مردہ'' تقاریب میں شرکت کرنے کے بعد شاید میرے اپنے حواس جاتے رہتے۔'' وہ زبردستی بیٹھ تو گیا تھا مگر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''کیا خرابی ہے اس تقریب میں، مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آ رہی ہے، لوگ آرام سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں، گپ شپ لگا رہے ہیں، فرید ہر ایک کے پاس جا کے کچھ دیر بیٹھ کر حقِ میزبانی ادا کر رہا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں، والد بھی حیات نہیں ہیں، تم یہ بھی تو سوچو کہ بحیثیت قریبی دوست ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے یا تمہاری طرح تھوبڑا سجا کے کونے میں بیٹھ جانا چاہیے۔'' مجھے سچ مچ غصہ آنے لگا۔

کھانا ٹائم پر ہوگیا۔ سب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ انتظامات بہت اچھے تھے۔ تقریب کے کامیابی کے ساتھ اور وقت پر مکمل ہوجانے پر فرید بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ہم نے بھی فرید سے اجازت چاہی... شاہد باہر نکلتے نکلتے بھی جملے بازی سے باز نہیں آیا۔

''امید ہے کہ فرید کا زندگی میں ایک ہی شادی کا ارادہ ہوگا...... وہ دوبارہ ہمیں کم از کم مجھے ایسی تکلیف پہنچانے کی ہرگز کوشش نہیں کرے گا۔'' جواباً میں اسے گھور کر رہ گیا۔

''شادی تو دیکھنا میری ہوگی...... مہندی کے فنکشن میں مشہور سنگر کو گانے کے لیے بلواؤں گا اور فائیو اسٹار میں ولیمہ دوں گا۔'' وہ فخر سے بولا۔

''تو اس سے کیا ہوگا......؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوگا......؟ ارے خوشی کو خوشی کی طرح منائیں گے یار...... روتے دھوتے نہیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ حقیقی خوشی باہر نہیں اندر ہوتی ہے...... اس سادہ اور پُروقار تقریب میں بھی فرید مجھے

www.paksociety.com






خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

بہت خوش نظر آیا...... جب اسے پرابلم نہیں ہے تو تم کیوں ایسا ردِعمل ظاہر کررہے ہو تمہیں جیسا اچھا لگے کرلینا دوسروں پر اعتراض سے کیا فائدہ......'' میں نے اسے سمجھایا آخر وہ بھی میرا دوست ہی تھا۔ مگر میرے ساتھ امی بھی آئی تھیں۔ وہ فرید کو بہت پسند کرتی تھیں، اس کے اخلاق اور شرافت سے بہت متاثر تھیں اور بطور خاص اس کے ولیمے میں شرکت کے لیے میرے ساتھ آئی تھیں۔

''کیسی لگی آپ کو فرید کی دعوتِ ولیمہ؟'' واپسی پر میں نے امی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھی...... فرید کی امی اور بہنوں سے تو پہلے ہی ملاقات ہوچکی ہے آج کچھ اور رشتے دار خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا...... بہت سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے اور شریف لوگ ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''مطلب یہ کہ آپ بور نہیں ہوئیں۔'' میں ہنسا۔

''بور...... ارے نہیں بھئی بوریت کیسی...... بہت دنوں کے بعد ایسی تقریب میں شرکت کا موقع ملا جہاں دکھاوے اور بناوٹ سے زیادہ خلوص اور اپنائیت کا احساس ہوا۔ سب نے میرا خاص خیال رکھا، تمہاری ماں ہونے کے ناتے بڑا خاص پروٹوکول ملا کہ بھئی دولھا میاں کے قریبی دوست کی اماں ہیں ہے۔ خاص طور پر مجھے اس فیملی کی لڑکیاں بہت اچھی لگیں۔ چہرے پر معصومیت اور حیا ہے۔ جو نہ جانے کیوں آج کل ناپید ہوتی جارہی ہے۔'' امی نے تفصیلی تبصرہ کیا۔ میں نے زیرِلب مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ امی آج کل شہر بھر کی لڑکیوں کو دوسری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں مگر اب تک گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا تھا۔

''دلہن بھی بہت اچھی ہے...... فرید کے چچا کی بیٹی ہے، چچا تو حیات نہیں البتہ چچی بہت نفیس خاتون ہیں۔'' امی نے مزید معلومات پہنچائیں۔

''چلیں آپ نے انجوائے کیا، بہت اچھی بات ہے ورنہ میں گھبرا... رہا تھا کہ اتنی دیر تک آپ بور ہی نہ ہوجائیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

امی زیادہ سوشل خاتون نہیں تھیں۔ وہ ضروری فنکشنز اور جگہوں پر تو ضرور جاتی تھیں مگر ہر وقت کا گھومنا پھرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ بابا کے انتہائی سوشل ہونے کے باوجود امی خالص گھریلو اور مشرقی سوچ رکھتی تھیں شاید یہ ان ہی کی تربیت کا اثر تھا جو چکا چوند کردینے والی روشنیوں میں رہنے کے باوجود اندر سے میں بھی ''دیسی'' ہی تھا۔ گھر آگیا تھا میرے ہارن پر چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیو وے پہ میں نے گاڑی روکی...... امی اترتے ہوئے بولیں۔

''ہارون اب فرید کی شادی بھی ہوگئی...... میرے دل کی خواہش اور شدید ہوگئی ہے کہ تمہاری شادی جلدی سے کردوں۔''

''تو کردیں...... میں نے کب منع کیا ہے۔'' میں ہنسا۔

''ایک تو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تمہیں...... نہ خود کوئی قدم اٹھاتے ہو اور نہ ہی میری پسند جو مجھے بھی مشکل ہی سے پسند آئی..... ہوتی ہے اس کو اوکے کرتے ہو...... کیا بنے گا تمہارا......؟'' وہ جز بز ہوکے بولیں۔ امی نے حال ہی میں اپنی ایک دریافت کے رد ہونے کا گلہ کیا۔

''فکر نہ کریں امی، بن جائے گا میرا بھی کچھ نہ کچھ لیکن جب تک میرا دل کسی نئے رشتے پر مطمئن نہیں ہوگا میں مجبوراً ہاں نہیں کروں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ خفا سی بولیں اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ میں شانے اچکا کے ان کے پیچھے چل دیا۔





☆☆☆

میرا کام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ویسے بھی یہ دور میڈیا کا دور ہے۔ ٹی وی پر ٹاک شوز، مارننگ شوز اور ڈراموں کی بہتات ہے اور ساتھ ساتھ چینلز کی بھرمار بھی اور ان سارے پروگرامز کی جان اشتہارات جو میں بناتا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ اس فیلڈ سے وابستہ بے شمار لوگ اور ایجنسیز تھیں لیکن میرا نام اس وقت ٹاپ پر جارہا تھا۔ کلائنٹ بھی نیا تھا اور پروڈکٹ بالکل نئی...... مگر وہ اپنی بھاری بھرکم انویسٹمنٹ کا بھرپور بدلہ بھی چاہ رہا تھا اسی لیے میرے پاس آیا۔ اسے پیسے کی مطلق پروا نہیں تھی بس یہی خواہش تھی کہ چہرہ بالکل نیا ہو اور لازماً خوب صورت بھی۔ کاسمیٹکس کے پورے رینج کی اشتہاری مہم تھی جو یقیناً مجھے اس طرح چلانی تھی کہ لوگ نہ صرف اس نام سے واقف ہوجائیں بلکہ اپنے گھروں میں لے آئیں۔ ہر اشتہار کے پیچھے یہی مقصد ہوتا ہے کہ پروڈکٹ راتوں رات ہٹ ہوجائے۔ لوگ اسی لیے تو ہمارے پاس آتے ہیں۔

اس نئے چہرے کی تلاش نے مجھے زچ کردیا۔ ان گنت نامور، تربیت یافتہ اور حسین ماڈلز موجود تھیں مگر مجھے ایک نیا چہرہ درکار تھا گو کہ فوٹو گرافی کی ٹیکنالوجی، جدید میک اپ اور کیمرا ٹرک نے مل کر آج کسی عام سے چہرے کو کچھ سے کچھ بنادینے کا راز دریافت کرلیا ہے مگر پھر بھی میں نئے نویلے کلائنٹ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پریوں جیسا حُسن تو خیر ہمیشہ سے ہی نایاب رہا ہے مگر آج کل تو ناپید ہی نظر آتا ہے۔ چہرے کی ضرورت سے زیادہ مرمت اور اس پر تھوپے جانے والے لوازمات کی تعداد میں تو اضافہ ہوا ہے لیکن قدرتی کشش اب نہ جانے کہاں کھوگئی ہے۔ کسی سیانے نے درست کہا تھا کہ ایک تو حُسن چہرے پر ہوتا

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت
ستمبر 2012ء کی جھلکیاں
روحِ مناظر
اس پیکرِ علم عرفان کا تذکرہ جو فقیرانہ روش پر گامزن تھا
خونخوار لڑکیاں
ایسی ظالم لڑکیاں تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتیں
شوبھو گیان
پاکستان کے ایک ولولہ انگیز لیڈر کی کتھا
سفیرِ موسیقی
بولی ووڈ کے نامور موسیقار کا عکسِ زندگی
سحر و ساحری
جادو ٹونے پر ایک معلومات بھرا مضمون
اس کے علاوہ
بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچے واقعات، دلچسپ حقائق، فلمی الف لیلہ اور معرکتہ الآرا قسط وار روداد ''سراب''
ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں
خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.paksociety.com

ہے جو اس کے نقوش کی خوب صورتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک چیز کشش ہوتی ہے جو اندرونی جذبات وخیالات کی وجہ سے چہرے پر آجاتی ہے اور لوگ ایسے چہروں کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ایسی ہی کشش کی تلاش تھی۔ اسکرین ٹیسٹ میں تو کئی لڑکیاں کامیاب ہو چکی تھیں مگر بات ابھی تک نہیں بنی تھی۔ وقت گزرا جا رہا تھا، میں جھنجلا سا گیا۔ جب میری جھنجلاہٹ حد سے سوا ہو گئی تو میں غصے سے تنتناتا ہوا اپنے آفس سے باہر نکلا میرا ارادہ تھا کہ تیس پینتیس لڑکیوں میں سے جن چار کو اب تک فائنل کیا تھا ان میں سے کسی ایک کے نام پر انگلی رکھ دوں گا گو میں مطمئن نہیں تھا مگر کیا ہو سکتا تھا، بھاڑ میں گیا کلائنٹ اور چولھے میں گئی اس کی پروڈکٹ...... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میرے آفس کے ساتھ ہی اسما کی ٹیبل تھی۔ میری پی اے اسما سفیر...... وہ مجھے آندھی طوفان کی طرح باہر نکلتا دیکھ کر گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دوسری طرف میں جہاں تھا وہیں ٹھٹک گیا۔ اسما کے سامنے والی کرسی پر وہ بیٹھی تھی۔ میک اپ سے پاک چہرہ، دلآویز نقوش اور سب سے بڑھ کر وہ بے پناہ کشش جو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ وہ واقعی بے حد حسین تھی یا مجھے لگ رہی تھی۔ میری توجہ کا ارتکاز اس نووارد لڑکی کے چہرے پر دیکھ کر اسما بولی۔

''سر یہ ماہم ہیں، انٹرویو کے لیے آئی ہیں۔'' میری خاموشی پہ اسما گڑبڑا کے چپ ہو گئی۔ وہ بے چاری اکثر و بیشتر مجھے غصے کی حالت میں دیکھ کر بوکھلا جایا کرتی تھی۔ دوسری جانب وہ لڑکی بھی قدرے خائف نظر آرہی تھی اور اضطراری طور پر اپنے سر پہ ٹکا ہوا اسکارف ہی برابر کیے جارہی تھی حالانکہ وہ بالکل اپنی جگہ پر موجود تھا۔

''ٹھیک ہے، میرے کمرے میں بھیج دیں۔'' میرا پارہ آنا فانا واپس نیچے آچکا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آگئی۔

''تشریف رکھیں۔'' میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

''شکریہ......'' وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

صورت کی طرح آواز بھی خوب صورت تھی۔ میں نے تو اسے پہلی ہی نگاہ میں اوکے کر دیا تھا۔ انٹرویو کیا کرنا تھا محض خانہ پُری...... میں نے انٹر کام پہ چائے کے لیے کہا...... حالانکہ انٹرویو پر آنے والوں کو چائے نہیں پلائی جاتی مگر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک کپ چائے کا پیوں اور بات چیت خوشگوار ماحول میں ہو سکے اور میرے پہلے امپریشن کا اثر زائل ہو جائے کیونکہ وہ مجھے قدرے سراسیمہ نظر آرہی تھی۔

''پڑھتی ہیں آپ......؟'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی......'' وہ قدرے حیران نظر آئی۔ ''میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔''

''اچھا...... زبردست۔'' یہ سن کر میں اس سے زیادہ حیران رہ گیا۔ شکل سے تو وہ اٹھارہ انیس سال سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھی۔ البتہ اس کے نگرز کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ پتلی ہے یا موٹی...... ڈھیلے ڈھالے کپڑوں پر بڑا سا چادر نما دوپٹا...... بال اسکارف میں مقید تھے، قد لمبا تھا، فائیو سیون تو ہوگا۔ میرے بھرپور جائزہ لینے پر اب وہ کچھ ناراض لگنے لگی تھی۔

''ویری گڈ...... آپ کی یہ ڈگری اس فیلڈ کو سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوگی۔'' مجھے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں زیادہ سمجھدار ہوتی ہیں۔ یہ میرا تجربہ تھا لیکن دیکھیں آپ کو تھوڑا تعاون کرنا ہوگا۔

www.paksociety.com

میرا مطلب ہے یہ اسکارف یہ چادر وغیرہ...... دراصل اس فیلڈ میں یہ تو ممکن نہیں ہے نا کہ بندہ...... میرا مطلب ہے بندی یہ سب استعمال کر سکے۔" میں نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات مکمل کی۔ ظاہر ہے کہ ایک پردے دار خاتون سے ایسی بات کرنا کافی مشکل ہو جاتا ہے مگر جب وہ خود چل کر اس کام کے لیے آ ہی گئی تھی تو اسے یہ سب سننے کے لیے تیار بھی ہونا چاہیے تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ جس نے چائے کا کپ ابھی ہونٹوں سے لگایا ہی تھا میری بات سن کر گویا سکتے میں آ گئی...... پھر غصے سے کپ پرچ میں پٹختے ہوئے بولی۔

"مطلب...... مطلب کا کیا مطلب بھئی...... آپ کا کیا خیال ہے آپ چادر یا برقع میں ماڈلنگ فرمائیں گی۔" نہ جانے کیوں میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ میں نے اپنے اب تک کے کیریئر میں زندگی کے کئی چہرے دیکھے تھے۔ خاص علاقوں کے علاوہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں بھی یہاں ماڈلنگ کے شوق میں چلی آتی تھیں۔ کچھ مجبور تھیں جنہیں پیسہ چاہیے ہوتا تھا تو کچھ شہرت کے لیے پاگل تھیں، کچھ کے لیے یہ ایڈونچر تھا اور کچھ کے لیے پبلسٹی...... کچھ تو یہاں آتی ہی "آگے جانے" کے لیے تھیں مگر کچھ کو غلط ہاتھوں میں پڑتا دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہوتا تھا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ساری دنیا کا ٹھیکا تو میں نے لیا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی میں کسی سماج سدھار تنظیم کا عہدے دار...... میں تو صرف اپنی حد تک جواب دہ تھا یہی کر سکتا تھا کہ شرافت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا کام کرتا رہوں اور وہ میں کر رہا تھا۔ یہ لڑکی ماہم گو اس وقت میرے مسئلے کا حل تھی مگر اس کی معصومیت دیکھتے ہوئے مجھے اسی قسم کا صدمہ ہوا تھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا...... پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں آپ؟ میں اور ماڈلنگ...... آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں یہاں ماڈلنگ کے لیے آئی ہوں۔" وہ مارے غصے کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماڈلنگ کرنے نہیں آئی ہیں تو کیا پکنک منانے کے لیے آئی ہیں آپ یہاں؟" اس کا تیز لہجہ مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوا۔ آج تک میں نے صنفِ مخالف کے ناز و انداز بھرے خوشامدی لہجے سنے تھے یا پھر ماتحت لڑکیوں کا مؤدب انداز دیکھا تھا۔ میرا لہجہ بھی تند و تیز ہو گیا۔

"معاف کیجیے گا...... میں نے اپنی یہاں آمد کا مقصد آتے ہی واضح کر دیا تھا اور مجھے امید ہے کہ فرید بھائی بھی آپ کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکے ہوں گے اس کے باوجود بھی آپ ایسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔" اس نے تپ کر کہا۔

میں ایک دم اپنے حواسوں میں آ گیا۔ ماڈل کی تلاش نے تو جیسے میری مت ماردی تھی۔ کل رات ہی تو فرید کا فون آیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے ریکویسٹ کی تھی۔ ماہم اس کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی، چچا کے انتقال کے بعد گھر کی ذمے داریوں کا بوجھ انہی دو بہنوں پر تھا، باقی بہنیں چھوٹی تھیں اور پڑھ رہی تھیں۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ فرید کا کہنا تھا کہ ماہم کو فیلڈ کی مناسبت سے کوئی معقول آفس ورک اس کے حوالے کر دوں جہاں وہ عزت سے اپنا روزگار کما سکے۔ اسے میری ایجنسی کے ماحول کا بھی پتا تھا جہاں صرف کام سے کام رکھا جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے مجھ پر بھروسا تھا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا تھا لیکن دفتر آ کے بالکل بھول گیا۔ مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"اوہ آئی ایم سوری...... ریئلی ویری سوری......" شرمندگی کا احساس شدید تھا، وہ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچ رہی ہوگی اور اگر اس





نے فرید سے اس بات کا تذکرہ کر دیا تو وہ کیا سوچے گا۔ جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا، میز پر رکھا ہوا پرس اور فائل اٹھا کے کمرے سے نکلنے لگی۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز ماہم رک جائیں...... دراصل مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ یہاں پر آج کل ماڈلز کی سلیکشن بھی چل رہی ہے، اس لیے میں سمجھا شاید...... سارا قصور اسما کا ہے، اسے مجھے بتانا چاہیے تھا۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"جی نہیں سارا قصور میرا ہے، عورت کے لیے گھر سے نکلنا ہی غلط ہوتا ہے۔ بالخصوص جب وہ یہ سوچ کے باہر نکلے کہ اسے وہاں محفوظ پناہ گاہ مل جائے گی۔" مجھے لگا اس کا لہجہ بھرا رہا ہے۔

"کہیں یہ رو تو نہیں رہی۔" میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ میں نے عورتوں کے بلند و بانگ قہقہے بھی سنے تھے اور دھیمی دھیمی معنی خیز ہنسی بھی مگر روتی ہوئی لڑکی سے نبٹنے کا یہ پہلا موقع تھا اور اس کام کا مجھے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ میرے گھورنے سے شاید اسے کچھ احساس ہوا ہو گا اس نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھا کے ایک دم میری طرف دیکھا۔ میرا شک صحیح تھا اس کی آنکھیں گیلی تھیں، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، مجھے اپنے اوپر شدید غصہ آنے لگا۔

"پلیز......" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شاید اسے بھی خود کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا وہ بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا جسے وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر وہ اپنی کیفیت سے باہر آ گئی۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

"افسوس تو مجھے ہے کیونکہ غلطی میری ہے۔" میں نے اعترافِ جرم کیا۔

"پھر بھی مجھے اس طرح ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" میرے دل پہ پڑا بوجھ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔

"لڑکیوں کا باہر نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جب قدم قدم پر لوگ ان کے لیے آزمائشیں کھڑی کر دیتے ہیں۔" وہ دکھ سے بولی۔

"میں جانتا ہوں، آپ درست کہہ رہی ہیں، خیر آپ بتائیں آپ کس قسم کی جاب چاہتی ہیں؟" میں کام کی بات کی طرف آ گیا۔

"کوئی بھی آفس ورک، جس میں عزت کے ساتھ پیسہ بھی ملے۔" وہ مایوس لہجے میں بولی۔ شاید وہ حالات سے مایوس ہو چکی تھی۔

"پیسہ تو اس فیلڈ میں بہت ہے، صرف ٹیلنٹ اور شدید محنت درکار ہے۔ پیسہ خود بخود آتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھ میں ٹیلنٹ ہے، میں محنت کر سکتی ہوں۔" اس بار وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آپ کل سے جوائن کر لیں، میں آپ کو پروڈکشن کی طرف رکھوں گا باقی کا کام آپ کو امتیاز صاحب سمجھا دیں گے آپ کل ان سے مل لیں۔"

"شکریہ......" وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔

"آپ نے پہلے بھی کہیں جاب کی ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی تجربہ وغیرہ۔" مجھے یک دم خیال آیا۔

"جی ہاں، میں نے اسکول میں ٹیچنگ کی ہے۔" اس نے شہر کے مشہور اسکول کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر وہ ملازمت کیوں چھوڑ دی آپ نے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اس کی شخصیت کے اعتبار سے موزوں ترین پیشہ تو یہی تھا۔

www.paksociety.com

"میں نے ٹیچنگ کے شعبہ کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ میرے حساب سے میرے لیے سب سے مناسب یہی کام تھا۔ محنت بہت تھی وہ میں نے کی لیکن دو تین مہینوں ہی میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس محنت کے بعد جو معاوضہ میرے ہاتھ آرہا ہے وہ میرے گھر کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے ناکافی ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ایک مشہور و معروف اسکول جہاں امراء کے بچے ہی داخلہ لے پاتے ہیں جہاں کی ماہانہ فیس ہزاروں میں لی جاتی ہے وہاں پر ٹیچرز کو دیا جانے والا معاوضہ سن کر میں حیران رہ گیا۔

"یہ تو زیادتی ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادتی تو ہے...... اسکول انتظامیہ ماسٹرز ڈگری ہولڈر سے نیچے کسی کو اپائنٹ نہیں کرتی، محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے، ورکنگ ٹائم بہت زیادہ ہیں، ایکسٹرا آورز کی الگ سے کوئی پیمنٹ نہیں ہوتی۔ چھٹیوں تک میں کام کے بہانے بلالیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے ٹیچرز بھی ساری توجہ ٹیوشن کی طرف مرکوز رکھتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے یا کوئی اچھی آفر دیکھتے ہیں تو نوکری چھوڑ کے چلے جاتے ہیں پھر مشکل پیش آتی ہے بچوں کو، ان کے والدین کو...... بار بار ٹیچر کا تبدیل ہونا بھی تو اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ، جب تک تعلیمی ادارے بالخصوص اچھے اسٹیبلشڈ تعلیمی ادارے اپنے ٹیچرز کو معاشی فکروں سے آزاد نہیں کردیتے، تعلیمی ماحول کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا، اس کے بعد بے شک کتنی محنت لیں اور کتنی سختی کریں وہ جائز ہوگی۔

خیر یہ الگ بحث تھی۔ میں نے اسے اس کا متوقع پیکج بتایا تو اس کی آنکھوں میں مجھے حیرت، خوشی اور اطمینان کی جو آمیزش نظر آئی اس نے میرے دل کو انجانی مسرت سے بھر دیا جو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے لگا میرے سینے پر دھرا بوجھ مکمل طور پر ہٹ گیا ہے اور میں اپنے دوست کے سامنے سرخرو ہوگیا۔ جس نے پہلی بار مجھ سے کوئی کام کہا تھا ورنہ وہ جتنا خوددار تھا وہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔

☆☆☆

فرید کا شکریہ سے لبریز فون اگلے ہی دن آگیا۔

"دوست بھی ہو اور شکریہ بھی کہہ رہے ہو۔" میں نے شکوہ کیا۔

"احسان کا بدلہ احسان ہے، انسان اگر یہ نہ کرسکے تو کم از کم دل سے مشکور تو ہو۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"او بھائی...... میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے کسی پر، بس حقدار کو اس کا حق دیا ہے۔ تمہاری کزن اس جاب کے لیے پرفیکٹ ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میں جانتا ہوں، وہ ذہین ہے، محنتی ہے اور تعلیم یافتہ بھی مگر ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی زندگی اس پر تنگ تھی۔" فرید دلگرفتہ سا بولا۔

"بے فکر رہو، اب اس کے مسائل ختم ہوجائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"تم میرے بہت پرانے دوست ہو ہارون...... مجھے تم پر خود سے زیادہ بھروسا ہے، اس کا خیال رکھنا۔" فرید کچھ جھجک کر بولا۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"اچھا تمہیں مجھ پر بھروسا ہے، یہ میرے لیے باعثِ مسرت ہے ویسے تو تم مجھے ہر وقت لعن طعن کرتے رہتے ہو، میری فیلڈ کے طعنے دیتے رہتے ہو۔" میں نے اسے چھیڑ کے ماحول کا بوجھل پن دور کرنا چاہا۔

"وہ سب تو میں اس لیے کرتا ہوں کہ





تمہیں احساس رہے کہ کوئی ہے جو تمہیں نگاہوں میں رکھے ہوئے ہے ورنہ تمہاری شرافت کا تو میں خود گواہ ہوں، مجھے کسی اور کی گواہی کی ضرورت نہیں۔" جواباً وہ بھی ہنسا۔

"بہت بہت شکریہ مجھ پر نگاہ رکھنے کا...... دوست ہو تو تم جیسا۔" میں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا۔

"حقیقت یہی ہے ہارون کہ میں اس فیلڈ کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہوں لیکن مقامِ افسوس ہے کہ پیسہ اب صرف اور صرف شوبز میں محصور ہوکے رہ گیا ہے۔ شوز ہوں، میوزک ہو، یا ڈرامے دھڑ دھڑ ترقی کررہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ چند سیکنڈ کے اشتہارات میں کام کرنے والے ماڈلز ہزاروں بلکہ لاکھوں کماجاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اداکار اور ماڈلز بہت محنت کرتے ہیں مگر ان کی محنت کا معاوضہ بھی بھرپور مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فیلڈ اب ہر ایک کا خواب بنتی جارہی ہے، لوگ جوق در جوق یہاں آرہے ہیں۔" وہ کہتے کہتے رکا۔

"بات تمہاری ٹھیک ہے...... ہر دور کا یہی دستور رہا ہے کہ ٹیلنٹ کا بہاؤ ہمیشہ اس طرف ہوتا ہے جہاں عزت بھی ملے اور دولت بھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"یہ بات اتنی خوش آئند نہیں ہے ہارون...... یہ خطرے کی گھنٹی ہے اگر یہی حال رہا تو ہمارے ملک کا نوجوان طبقہ ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان یا استاد بننے کے بجائے اسی کام کو ترجیح دے گا کہ کئی سال پڑھنے اور جان مارنے کے بعد نہ تو جاب سکیورٹی ہے اور نہ ہی ملنے والی جاب میں ڈھیروں ڈھیر پیسہ...... پھر کیا ہوگا۔" وہ تپ کر بولا۔

"ہمارے ملک میں غربت کے ہاتھوں پسنے کے بعد کاریگروں اور ہنرمندوں نے اپنے آبائی پیشے ترک کردیے۔ اب ان کی جگہ تیز رفتار مشینوں نے لے لی ہے۔ دیکھو مستقبل میں کیا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"سوری یار میں خوامخواہ جذباتی ہوجاتا ہوں۔ زیادہ بول جاتا ہوں۔" وہ شرمندہ ہوکے بولا۔

"تم جیسے چند جذباتی انسانوں کی وجہ سے تو یہ دنیا دنیا ہے یار...... ورنہ روبوٹس کا بازار بن جاتی جو نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں بس ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔" میں ہنسا۔

"تم بہت اچھے انسان ہو ہارون...... لیکن دنیا ہم جیسے جذباتی انسانوں کی وجہ سے قائم نہیں ہے جو صرف سوچتے اور کڑھتے رہتے ہیں...کر کچھ بھی نہیں سکتے۔ یہ تمہارے جیسے لوگوں کی وجہ سے قائم ہے جو اچھا عمل کرتے ہیں۔" وہ یک دم بولا۔

"میرے لیے یہ بریکنگ نیوز ہے۔ امید ہے باقی لوگ بھی جلد جان جائیں گے کہ میں ایک اچھا انسان ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے جلدی سے فون بند کردیا۔ اپنی تعریف سننا میرے لیے بڑا مشکل کام تھا اور تعریف بھی وہ جس پر مجھے خود بھی زیادہ یقین نہ ہو۔

☆☆☆

گرمیوں کی آمد سے پہلے ہی ہر سال لان کی اشتہاری مہم کا آغاز ہوجاتا ہے سو اشتہار لان کا تھا اور کلائنٹ ہر صورت میں زبردست پبلسٹی چاہتے تھے۔ کمپٹیشن ہی کچھ ایسا زبردست ہوچکا ہے کہ ہر ایک سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ لان کا اشتہار ہو اور اس میں ایک دیدہ زیب خاتون ماڈل نہ ہو بھلا یہ کیسے ممکن تھا مگر یہ ہوچکا تھا کہ یہ پروجیکٹ میں نے ماہم کے حوالے کیا تھا۔ اس نے اپنے پہلے پروجیکٹ پر جو محنت کی تھی وہ نظر آرہی تھی۔

موسم بہار کا آغاز ہوچکا تھا۔ ہر طرف خوش نما

www.paksociety.com

رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبزہ کھل کے اور سرسبز ہو چکا تھا اوپر سے نکھرا نکھرا آسمان جو سفید بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا مزید نیلا ہو چکا تھا۔ جتنے رنگ اس موسم میں چار سو بکھرے نظر آتے ہیں شاید ہی کسی اور موسم میں نظر آتے ہوں۔ یہ وہ موسم ہے جب دل خود بخود ترنگ میں آجائے۔ ماہم نے ان سارے رنگوں کو لان کے خوب صورت پرنٹس کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے اتنا زبردست ایڈ تیار کیا جس پر سب ہی دنگ رہ گئے گو کہ یہ ایک ٹیم ورک تھا' فوٹو گرافی، میوزک اور تھیم ساری چیزیں ایک دوسرے کو کمپلیٹ کرتی نظر آرہی تھیں مگر بنیادی خیال ماہم ہی کا تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں کھل کر...... نظر آرہی تھیں۔ اشتہار ایک ہی دن مختلف چینلز پر آن ائر گیا اور ہٹ ہو گیا۔ کلائنٹ بے حد خوش تھے۔ سیزن میں آنے والے دیگر اشتہارات کی کوالٹی ہم سے بہت کم تھی۔ اشتہار ... کے ہٹ ہو جانے کا مطلب پروڈکٹ کی کامیابی سو ہماری ایڈورٹائزنگ ایجنسی سب پر بازی لے گئی تھی۔

مجھے ماہم کی صلاحیتوں کا اندازہ اگلے چند ماہ میں مزید ہوا۔ اس کو جو بھی پروجیکٹ ملتا، وہ ہٹ ہو جاتا مگر اس کے بنائے ہوئے اشتہارات کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں خاتون ماڈل کا گزر تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ اچھوتے خیالات، فطرت کے دلکش نظاروں' ننھے منے معصوم بچوں، خوب صورت جملوں اور کمپیوٹر گرافکس کی مدد سے جو شاہکار تخلیق کرتی وہ بے مثال ہوتا۔ ایک کے بعد دوسرا دور تو آتا ہی ہے اور نئے دور میں پرانی چیزیں متروک ہو جاتی ہیں نئی چیزیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ شاید اس شعبے میں بھی اب ترقیاتی کے بعد نظریاتی انقلاب آنے والا تھا۔ میں نے دوسری ایجنسیز کو بھی ان ہی لائنوں پر کام کرتے دیکھ کے سوچا۔

''آپ تو ساری ماڈلز کی چھٹی کروا دیں گی بھئی...... مجھ سے کئی ماڈلز گلہ کر چکی ہیں کہ ان کو ملنے والا کام کم ہوتا جا رہا ہے۔'' میں نے ایک دن برسبیل تذکرہ اس سے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''سر ذاتی طور پر میں عورت کا اشتہار بننا پسند نہیں کرتی بالخصوص نمائشی انداز میں۔''

''دراصل لوگ خوب صورتی سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ ایک حسین اور طرح دار ماڈل پروڈکٹ کی فروخت میں چار چاند لگا دے گی۔'' میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''میں آپ سے متفق نہیں ہوں سر، لوگ خوب صورت پھولوں یا بچوں کو تو اور نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر ایک خوب صورت عورت کے لیے ان کی نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ اس کو بے حجابانہ... ہورڈنگز اور پمفلٹ کی زینت بنے دیکھ کر یا اپنے وجود کی نمائش کرتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر نمایاں دیکھ کر مجھے بہت شرم آتی ہے۔ جب اس کے بغیر بھی کام بہت اچھا چل سکتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ایک قابلِ احترام ہستی کو تماشا بنایا جائے۔'' وہ سر جھکا کے بولی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس بڑا سا وہی چادر نما دوپٹا اور سر پر اسکارف' میک اپ سے پاک چہرہ۔ میری نگاہیں جو دورانِ گفتگو اس کا بغور معائنہ کر رہی تھیں اس کی بات سن کر ایک دم جھک گئیں۔

جو باتیں وہ میرے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی وہ سب سچ تھیں۔ شاید اندر سے میں بھی اس کا ہم خیال تھا لیکن میرا ایمان فقط اس درجے تک پہنچ پایا تھا جہاں برائی کو فقط دل ہی دل میں برا سمجھ کے خاموشی میں عافیت سمجھی جاتی ہے عملاً کچھ کرنا مشکل لگتا ہے۔

''بہت سارے کام درست نہیں ہوتے مگر لوگ ان کو کر رہے ہوتے ہیں' کبھی رسم و رواج کے نام پر تو





کبھی یونہی بھیڑ چال کے انداز میں لوگوں کی دیکھا دیکھی۔''

''ماڈلنگ تو اب کافی پرانا پیشہ ہو چکا ہے، کاروباری لوگ اپنی چیزیں بیچنے کے لیے پبلسٹی کا سہارا لیتے ہیں یعنی ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمیں ان کا کاروبار چمکانے کے لیے چمکتی دمکتی ماڈلز کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی ٹرینڈ ہے۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''لیکن کبھی تو، کوئی تو ہو جو اس انداز کو بدل دے، کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ سالہا سال سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جو پیغمبر بھیجے وہ ان ہی لوگوں میں سے تھے اور اس مخصوص دور کی مناسبت سے ان پیغمبروں کو معجزے بھی عطا ہوئے، موسیٰؑ کا دور جادو اور سحر کا تھا۔ لوگ جادو گروں کے زیرِ اثر تھے سو اس کا توڑ کرنے کے لیے موسیٰ کے عصا زمین پر ڈالنے سے سانپ بن گیا۔ لوگ فوراً موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ نبی پاکﷺ کا دور فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کا تھا سو آپؐ پر قرآن نازل ہوا اور لوگوں کو چیلنج دے دیا گیا کہ بنا لاؤ اس جیسی کوئی دوسری سورت...... لوگ ناکام ہو گئے۔ ظاہر ہے اللہ کے کلام کے سامنے بھلا کسی بندے کے کلام کی کیا حیثیت۔ اب نبی آخر الزماںﷺ کے بعد تو نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی اچھائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنے کی کوشش کرنا تو امت پر فرض کر دیا گیا۔ یہ دور میڈیا کا ہے، انٹرنیٹ کا ہے، الیکٹرونکس کا ہے، برائی کو ختم کرنے کے لیے برائی کے نزدیک جانا پڑتا ہے اگر یہاں سے کچھ غلط ہو رہا ہے اور پھر سارے معاشرے میں پھیل رہا ہے تو پھر یہیں سے اس برائی کی جڑ کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے، اپنے حصے کا کام کرنا تو چاہیے نا......'' وہ ایک سانس میں لمبی بات کہہ گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نہ اس کے پاس الفاظ کی کمی تھی اور نہ ہی گہری سوچ کی۔

''تو آپ چاہتی ہیں کہ ہم لوگ ملک و قوم کو سدھارنے کا بیڑا اٹھا لیں۔'' میں آہستہ سے ہنسا۔

''ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں یہ وقت اچانک نازل نہیں ہوا بلکہ سلو پوائزن کی طرح بہت ساری خرابیاں آہستہ آہستہ ہماری زندگیوں میں داخل ہونے کے بعد اب اپنا رنگ جما رہی ہیں۔ لوگوں کی زندگیوں میں یوں داخل ہو چکی ہیں کہ برے بھلے کی تفریق مٹ گئی ہے مگر جب لوگ ان کے برے نتائج بھگتنا شروع کرتے ہیں انہیں تب اس بات کا احساس ہوتا ہے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، اب انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھلائی کی کوشش کا وقت ہے سر، کسی جادو کی چھڑی کا انتظار فضول ہے۔''

''تو آپ کیا کرنا چاہتی ہیں، میرا مطلب ہے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' میں حیران رہ گیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھلا کوئی نیکی کا کام کس طرح کر سکتی ہے۔

''لوگ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں سر...... یہ اہم ذمے داری ہم نبھا سکتے ہیں کہ اپنے ڈراموں، اشتہارات اور دیگر پروگرامز کے ذریعے لوگوں کو مذہب اور اپنی اخلاقی اقدار کی جانب واپس لائیں۔ کم از کم اپنے آنے والی نسل کا تو سوچیں۔'' وہ بہت پُرجوش نظر آرہی تھی۔

''ہم تو سب اچھا، اچھا دکھا دیں، مذہبی اور معاشرتی حدود و قیود کا بھی احساس کر لیں لیکن ان غیر ملکی چینلز کا کیا ہوگا' وہ تو ہمارے پابند نہیں ہیں۔ ہم تو اس دوڑ میں آئے ہی اس لیے ہیں کہ ہمارے بھی ''ناظرین'' ہوں ورنہ ہمیں کون دیکھے گا۔'' میرے لہجے میں نہ جانے کیوں طنز اتر آیا۔



www.paksociety.com

انہوں نے مگر......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''مگر کیا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''مگر یہ کہ سر یہ پروجیکٹ غلطی سے ماہم بی بی کو مل گیا ہے اور انہوں نے حسبِ روایت بغیر ماڈل کا ایڈ بنا دیا ہے۔'' وہ جز بز ہو کے بولے۔

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''ویسے کیا حرج ہے، ماہم نے اب تک جو کام کیا ہے ٹھیک ہی کیا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں۔'' میں نے ماہم کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ احتیاطاً ایک نارمل سا اشتہار میرا مطلب ہے لمبے بالوں والی ماڈل والا اشتہار بنوالینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کلائنٹ ناراض ہو جائے اور بے مزہ ہو کے ہماری ایجنسی چھوڑ کے کسی اور طرف نکل جائے۔'' امتیاز صاحب کے لہجے میں اندیشے لرز رہے تھے۔ وہ ایجنسی کے پرانے اور پُرخلوص ساتھی تھے۔ مجھ سے عمر اور تجربہ میں بہت آگے تھے۔ ہماری ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا سارا سیٹ اپ ہی ان کا بنایا ہوا تھا۔ ان کے مشورے میرے لیے بہت اہم تھے۔

''ٹھیک ہے، آپ ماہم کو میرے کمرے میں بھیجیں، میں ان سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ وہ خوشی خوشی فائلیں اٹھائے باہر نکل گئے۔

دو منٹ کے اندر ہی وہ میرے کمرے میں تھی۔ وہی سادہ سا چہرہ اور عام سے لباس میں ملبوس...... بالکل ویسی ہی جیسے پہلے دن تھی۔ یہ چکا چوند کر دینے والی فیلڈ اس میں کوئی تبدیلی نہیں لائی تھی۔ میں نے تمہید باندھنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

''آپ کی امی اب کیسی ہیں۔ فرید بتا رہا تھا کہ پچھلے دنوں وہ کچھ علیل رہیں؟''

''ان کو ہارٹ پرابلم ہے سر' وہ پچھلے دنوں ہاسپٹلائزڈ رہی ہیں، اب کافی بہتر ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اور باقی سب ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں۔'' میں نے مزید پوچھا۔

''جی سر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔'' وہ اب اِدھر اُدھر کی باتوں سے الجھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب سیدھی سیدھی بات کر ہی لی جائے، سو میں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور بات کا آغاز کیا۔

''ماہم، امتیاز صاحب بتا رہے تھے کہ شیمپو کا ایڈ تھا جو آپ کو ملا...... اس میں تھوڑی سی پرابلم ہے۔''

''جی!'' اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

''دراصل ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں ایک لمبے بالوں والی ماڈل دکھائیں، یہ کلائنٹ کی ڈیمانڈ ہے، آئی مین، لمبے بال تو خواتین ہی کے ہوتے ہیں ناں۔'' اس کے بغور میری جانب دیکھنے کی وجہ سے میں گڑبڑا گیا۔

''نہیں تو سر، لمبے بال تو مردوں کے بھی ہوتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر کے فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

''ہاں...... مگر ایڈ کے لیے خاتون ماڈل ہی مناسب رہے گی۔ خوب صورتی اور بناؤ سنگھار خواتین کے شعبے ہیں نا......'' میں نے اسے لائن پر آتا دیکھ کر جلدی سے بات مکمل کی۔

''خیر سر رہنے دیں، آج کل کے مردوں نے کون سی کسر چھوڑی ہے۔ فیشل وہ کرواتے ہیں، آئی بروز ان کی تراشیدہ ہونے لگی ہیں، مینی کیور، پیڈی کیور، جلد کی حفاظت کے لیے کریموں کا استعمال اور حسبِ توفیق میک اپ اور باقی رہ کیا گیا ہے ان کے کرنے کو۔ ایک وقت تھا کہ خواتین مردوں کی برابری



''لوگ مکھیوں کی طرح کیوں ہونے لگے ہیں جو ہمیشہ گندگی کا رخ کرتی ہیں۔'' وہ تتلیاں کیوں نہیں بن جاتے جو پھولوں اور خوشبو کا رخ کرتی ہیں''، اس کا سوال بہت سادہ مگر بہت گہرا تھا۔

''یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے، کون کس طرح جینا چاہتا ہے۔'' میرا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

''سوچیں ہی تو بدلنی ہیں سر، کچھ لوگ جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں، کچھ سے اتفاقاً ہو جاتی ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ غلط کر رہے ہیں یا صحیح...... انہیں تو بتانا ہوگا اور انہیں وہی بتا سکتا ہے جو خود جانتا ہے۔'' وہ نرم روی سے بولی۔ میں اسے فقط دیکھ کے رہ گیا۔ ایک لڑکی جس کے وسائل نہ ہونے کے برابر اور مسائل بے پناہ...... ایسی پُرعزم سوچ رکھتی ہے؟ وہ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور میری سوچ کو پھر ایک نیا سرا پکڑا گئی۔

☆☆☆

امی کو بالآخر میرے لیے ایک لڑکی پسند آ ہی گئی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے ٹیبل پر سب کی موجودگی میں یہ اعلان کر دیا۔ بابا نے مسکرانے پر اکتفا کیا...... گویا امی انہیں ساری معلومات پہلے ہی دے چکی تھیں۔ البتہ بھائیوں اور بھابیوں کے چہرے پر حیرانی تھی۔ پچھلے چند ماہ سے امی کی سرگرمیاں بظاہر بالکل ماند پڑی ہوئی تھیں۔

''یکا یک یہ لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی؟'' میں نے استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''بس اس بار بات بالکل فائنل سمجھو...... میرا ووٹ سو فیصد اس کے حق میں ہے، امید ہے باقی سب کو بالخصوص ہارون کو وہ پسند آئے گی۔'' امی کا انداز قطعی تھا اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''مگر امی وہ ہے کون؟'' فرحت بھابی جلدی سے بولیں۔

''تم سب کو لے کر جاؤں گی اس سے ملانے، ابھی بات چیت کا آغاز تو ہوا نہیں ہے صرف دیکھا ہی ہے اسے دو تین بار۔'' وہ اپنا پروگرام بتانے لگیں۔ میں کچھ کچھ پریشان ہو گیا، امی کی پُراسرار مسکراہٹ ابھی زیادہ تفصیل نہ بتانے کا اشارہ دے رہی تھی اس لیے کچھ پوچھنا بیکار ہی تھا۔

''کون ہو سکتی ہے وہ؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔ خاندان اور ملنے ملانے والوں میں جتنی لڑکیاں میرے ناپ کی تھیں وہ سب خیر سے شادی شدہ ہو چکیں۔ یقیناً کوئی نئی دریافت ہی ہو گی لیکن امی کی پسند ہے، بری تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جب میں نے سارا معاملہ انہیں ہی سونپا ہوا ہے تو مجھے پریشان تو نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے دل ہی دل میں خود کو سمجھایا لیکن اس سمجھا بجھی میں نہ جانے کیوں ایک چہرہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آنے لگا...... دل میں ایک عجیب سی خلش بھر گئی۔

☆☆☆

میں اپنے کام کے سلسلے میں ایک ہفتہ لاہور میں گزار کے واپس پہنچا تو سب کچھ حسبِ سابق ہی تھا۔ کام البتہ کافی بڑھ گیا تھا۔ بہت سارے نئے پروجیکٹس ہماری ایجنسی کو ملے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ ہم اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ امتیاز صاحب میرے آفس میں ان ہی پروجیکٹس کو ڈسکس کرنے پہنچے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

''سر یہ ایک شیمپو کا ایڈ بھی ہے۔ کلائنٹ پرانے ہیں مگر پروڈکٹ نئی ہے۔ اس مہینے کے آخر تک لانچ کرنے کا پروگرام ہے۔ پہلا پہلا اشتہار ہے اس لیے ان کی ڈیمانڈ ہے کہ زبردست ہونا چاہیے، مہنگی سے مہنگی ماڈل کو سائن کرنے کی اجازت دے دی ہے

www.paksociety.com

کا نعرہ لگایا کرتی تھیں اور آج ایک دور ہے جب مردوں نے خواتین کو سولہ سنگھار کی دوڑ میں بھرپور مقابلے کے بعد پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

اپنی صنف کے زنانہ کرتوتوں سے دل ہی دل میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔

"مگر ایک لڑکا تو شیمپو کے ایڈ میں......"

"ہر بے تکے کام کے لیے لڑکیاں ہی کیوں مناسب لگتی ہیں آپ کو۔" اس نے میری بات درمیان سے اچک لی۔

"ٹھیک ہے آپ کو اگر میل ماڈل ہی درکار ہے تو خدا کے لیے اسے ہی لے لیں مگر لمبے چمکدار، بال ضرور نظر آنے چاہئیں اشتہار میں۔" میں نے تنگ آ کے کہا۔

"معاف کیجیے گا سر...... شیمپو اب کوئی نئی دریافت تو رہی نہیں ہے کہ لوگ یہ جاننا چاہیں کہ شیمپو لگانے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اب سب ہی جانتے ہیں کہ یہ ایک بال دھونے کے لیے استعمال ہونے والی چیز ہے، نہ تو اس سے بال لمبے ہوتے ہیں نہ ہی کالے۔ یہ بھی سب کو پتا ہے اور آج کے ناظرین اتنے باخبر ہیں کہ انہیں پتا ہے کہ اشتہاروں میں نظر آنے والے انتہائی چمکدار اور خوب صورت ریشمی بال ماڈل کے حقیقی بال نہیں ہیں یا تو اس نے ایکسٹینشن لگائی ہوئی ہے یا پھر فوٹو گرافی کا کمال ہے، اس لیے یہ سارے ڈرامے فضول ہیں۔ ہمیں تو بس یہ کرنا ہے کہ ایک نئی پروڈکٹ کو مارکیٹ میں اس طرح لانچ کرنا ہے کہ لوگ اس سے باخبر ہو جائیں...... اب اس کی سیل کتنی ہوتی ہے یہ تو پروڈکٹ کی کوالٹی پر منحصر ہے، اچھی چیز لوگ لے ہی لیتے ہیں اور بری کو دوبارہ ہاتھ نہیں لگاتے...... اور آخری بات آپ یہ سارے اعتراضات ایڈ دیکھے بغیر ہی کر رہے ہیں۔ ایک بار دیکھ تو لیتے۔" وہ قدرے خفا ہو کے بولی۔

ایک تو پہلی دھواں دھار ملاقات کے بعد میں اس لڑکی سے قدرے خائف ہی رہا کرتا تھا اور مزید کوئی تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے دوست کا لحاظ بھی تھا۔

"بات یہ ہے ماہم کہ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں...... جو آپ سوچتی اور کرتی ہیں، میں بھی ویسا ہی سوچتا ہوں مگر کبھی کبھی کر نہیں پاتا، دراصل ہمیں... سروائیو کرنے کے لیے بہت سارے ناپسندیدہ کاموں کو بھی کرنا پڑتا ہے، کلائنٹس کی خوشی دیکھنی پڑتی ہے اگر ہم نہیں کریں گے تو وہ کسی اور سے کروالیں گے نقصان پھر ہمارا ہی ہوگا۔" میں نے اسے پروفیشنلی طور پہ سمجھانا چاہا۔

"سر اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو آج میں آپ کے ساتھ کچھ شیئر کرنا چاہتی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اسے یہاں کام کرتے ہوئے سال سے اوپر ہونے کو آیا تھا لیکن ہمارے درمیان کبھی کوئی پرسنل بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ پرسنل کیا کام کے علاوہ سرے سے کوئی بات چیت ہوئی ہی نہیں تھی۔ سوائے خیر خیریت اور حال چال کے میں نے اس سے کبھی کچھ جاننا چاہا اور نہ ہی اس نے کچھ بتایا۔ اب وہ مجھ سے کیا شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ فرید بھائی نے آپ کو میرے متعلق کیا اور کتنا بتایا ہوگا لیکن آپ کے بارے میں انہوں نے مجھے ایک، ایک تفصیل بتائی تھی۔ میرے نزدیک انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم اخلاقی اقدار ہوتی ہیں، اسٹیٹس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو شخص اپنی ویلیوز نہ پہچانتا ہو وہ جس مقام پر بھی پہنچ جائے اندر سے خالی ہی رہتا ہے۔



ہمارا مذہب ہمیں بے جا آزادی نہیں دیتا، ہر چیز کی ایک حد متعین کردی گئی ہے اور حد کے اندر رہتے ہوئے ہر نعمت سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی دے دی گئی، حد سے گزرنے کو گناہ ٹھہرا دیا گیا۔ آپ ہمیشہ ایک حد میں رہتے ہیں۔ مجھے آپ کی یہ کوالٹی سب سے زیادہ پسند آئی اور میں اپنے مسائل کے ہاتھوں مجبور ہو کے ایک ایسی فیلڈ کی طرف نکل آئی جہاں عام حالات میں، میں کبھی ہمت نہ کرتی۔ لوگ اس فیلڈ کی چکا چوند سے بھلے کتنے ہی متاثر ہوں مگر ان کے تحفظات اپنی جگہ رہتے ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ اسے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

"جب میں نے آپ کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کی میں اندر سے سخت خوفزدہ تھی، ایک طرف میری اقدار تھیں اور دوسری طرف منہ پھاڑے کھڑی ضروریات...... والد کے انتقال کے بعد والدہ کی جان لیوا بیماری کے اخراجات، چھوٹی بہنوں کی تعلیم اور گھر کے خرچے سب کے سب میری بڑی بہن اور مجھ پر آ پڑے تھے پھر بہن کی شادی فرید بھائی سے ہوگئی اور میں اکیلی رہ گئی۔ اب جو کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا کہ میری بہن اور فرید بھائی کے اپنے مسائل اس قدر زیادہ تھے کہ وہ چاہنے کے باوجود ہمارے لیے کچھ نہیں کر پا رہے تھے اور نہ خود میں ایسا چاہتی تھی۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ اپنی مشکل کا بار انسان کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ سو یہ میری ذمے داری تھی اور مجھے ہی پوری کرنی تھی۔ فرید بھائی کی یقین دہانی کے باوجود میں شروع میں کچھ ڈری رہی، آپ کی تعریف سن کر، یہاں کے اچھے ماحول کا اطمینان کر کے یہاں آ تو گئی تھی مگر میں سنی سنائی سے زیادہ ذاتی تجربے پر یقین رکھتی تھی۔ اپنا دامن بچا کے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے بعد میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور اس اعتماد کی وجہ صرف اور صرف آپ کی ذات تھی۔ مجھے رفتہ رفتہ آپ میں بتائی گئی خوبیوں پر یقین آتا گیا بلکہ مزید قریب سے آپ کو سمجھنے کا موقع بھی ملا۔"

اس نے پہلی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ پر انکشاف کیا۔ دیکھنے میں تو وہ واقعی ڈری سہمی سب سے کترائی ہوئی نظر آتی تھی مگر میرا اتنا بھرپور جائزہ لے چکی تھی۔ میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔

"جو لوگ باغوں میں پھر رہے ہوتے ہیں ان کے پاؤں کہاں آلودہ ہوتے ہیں لیکن جو کیچڑ بھری راہ گزر سے گزرتے ہوئے خود کو چھینٹوں سے بچالے تو یہ کمال کی بات ہوتی ہے۔ لیکن سر اس سے بڑا کمال دوسروں کو بھی یہ طریقہ سمجھانا ہے۔" اس کے منہ سے اتنی گہری بات سن کر میں دنگ رہ گیا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں ماہم......؟" میں اپنی سیدھی سادی زندگی کو مشکل راہ بنتے ہوئے دیکھ کر سخت پریشان ہو چکا تھا۔ نہ جانے وہ مجھے کیا سمجھ کے کس مقام پر لا کر بٹھا چکی تھی۔ اپنی دانست میں تو میں اپنے اصولوں پر چلنے والا ایک نارمل انسان ہی تھا۔

"سر جب آپ عام لوگوں سے مختلف ہیں، آپ کی ایجنسی دوسروں سے بہتر کام کر رہی ہے، یہاں کا ماحول سب سے اچھا ہے، آپ ہر بار میرے کیے ہوئے کام کو جو ذرا ہٹ کے ہوتا ہے پسند کرتے ہیں تو پھر کیوں ناں یوں ہم سب مل کے کوئی ایسی تبدیلی لے آئیں جو مثبت ہو۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ، شیمپو، چپس کے لیے کروڑوں روپے کی مالیت کے اشتہارات بنا دیے جاتے ہیں۔ لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے اور لوگ سامانِ تعیشات اور سامانِ ضروریات میں تفریق کیے بغیر ہر چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر قیمت پر اور ہر صورت میں...... تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی ایجنسی کوئی چھوٹی سی نیکی کی بات بھی لوگوں میں اسی طرح پھیلائے کہ لوگ اسے بار



www.paksociety.com

بار ٹی وی اسکرین پر دیکھ کر اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیں؟''

''نیکی کی بات......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سچ بولو...... دھوکا مت دو...... بے جا اسراف گناہ ہے...... یا پھر بدلہ مت لو۔'' وہ مسکرائی۔

''اس ایڈ میں کوئی ایسا ہی پیغام چھپا ہے کیا؟'' میں نے جواباً مسکرا کے کہا۔

''جی ہاں۔''

''کیا......؟''

''یہ کہ وقت گزر جاتا ہے اور جو لوگ وقت سے فائدہ نہیں اٹھاتے بعد میں پچھتاتے ہیں، وقت سے فائدہ اٹھانے سے میرا مطلب دوسروں کو دھکا مار کے گرانا نہیں، اپنی قابلیت سے اپنی جگہ بنانا ہے۔ سمجھداری سے اپنا اور دوسروں کا بھلا کرنا ہے۔ یعنی بالوں کو غنیمت سمجھیں گنجا ہونے سے پہلے۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''ٹھیک ہے ماہم، میں آپ کے پروجیکٹ کو بنا دیکھے ہی اپروو کرتا ہوں۔ آپ امتیاز صاحب کو بتا دیجیے گا۔'' میں نے فیصلہ کرلیا۔ اب حیران ہونے کی اس کی باری تھی۔

☆☆☆

''ہم کل رشتہ لے کر تمہاری ہونے والی سسرال جانا چاہتے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔'' رات کے کھانے کے بعد امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بات کا آغاز کیا۔

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کچھ دنوں پہلے امی نے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے میرے لیے لڑکی پسند کرلی ہے اور آج وہ رشتہ لے کر جانے کی بات کررہی تھیں۔

''آخر اس لڑکی کا حدود اربعہ کیا ہے...... کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔'' میں نے حیرت زدہ ہو کے ان کی شکل دیکھی۔

''فرید تمہارا بہت پرانا دوست ہے، تم اسے کیسا سمجھتے ہو۔'' امی نے میری حیرت بھانپ کر تمہید باندھی۔ فرید کا بے موقع ذکر مجھے کچھ عجیب سا لگا۔

''فرید بہت اچھا آدمی ہے، شریف النفس اور پُرخلوص دوست ہے۔'' میں نے اپنی حیرانی کو دباتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا۔

''اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق کیا جانتے ہو؟'' دوسرا سوال آیا۔

''امی لڑکوں کی دوستیاں گھر سے عموماً باہر باہر ہی رہا کرتی ہیں۔ آپس میں دوستوں کے گھروں میں آنا جانا تو برائے نام ہی ہوتا ہے، اس کے متعلق تو بس میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک متوسط اور انتہائی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب اس کے والد حیات تھے بے حد شفقت سے ملا کرتے تھے، ایک آدھ دفعہ اس کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی ہے وہ بھی بہت وضع دار خاتون ہیں۔ اس کی بہنوں کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ اور میں کچھ نہیں جانتا۔'' اب میرے لیے حیرت دبانا مزید مشکل ہوگیا تھا۔

''تم اسٹیٹس کانشس تو نہیں ہو؟'' امی نے اطمینان سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔ بھلا آپ نے یہ کیوں پوچھا؟'' میں جلدی سے بولا۔

''بیٹا میں نے تمہارے لیے جو لڑکی پسند کی ہے اسے میں نے ایک شادی میں دیکھا تھا۔ تمہارے دوست فرید کا ولیمہ تو یاد ہوگا نا تمہیں۔'' امی مسکرائیں۔

''جی......'' میں نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''پھر اس کے بعد اس سے میری اتفاقیہ طور پر دو

www.paksociety.com





تین ملاقاتیں ہوئیں، ایک بار وہ مجھے درس کی محفل میں ملی اور ایک دفعہ میں کسی کی عیادت کے لیے اسپتال گئی تھی وہ وہاں اپنی والدہ کے ساتھ نظر آئی۔ وہیں اس کی والدہ سے بھی میری ملاقات تفصیل سے ہوئی۔ مجھے وہ دونوں ماں بیٹی بہت اچھی لگیں۔ میں یونہی بہانے سے ان کے گھر بھی پہنچ گئی۔ خوش اخلاق اور پُرخلوص ہر طرح کے دکھاوے سے پاک ماں اور بیٹیاں...... اس کی دو چھوٹی بہنیں اور ہیں اور ایک بڑی بہن جس کی شادی ہوچکی ہے...... تمہارے دوست فرید کے ساتھ۔'' امی کے آخری جملے پہ میں بری طرح چونک اٹھا۔

''بس یا اور کچھ بتاؤں...... کہ لڑکی جاب کرتی ہے۔ ماہم نام ہے اس کا اور ہوسکتا ہے تم اس سے واقف ہو۔'' امی نے شرارت بھرے لہجے میں مسکرا کے کہا۔

''ماہم زبیر......'' امی کے انکشاف پر میں یک دم سنبھل نہیں پایا۔ ''آپ نے اسے پسند کیا ہے میرے لیے......'' میرا لہجہ شاید کچھ عجیب و غریب ہوگیا تھا۔ امی کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم غائب ہوگئی۔

''تمہیں ماہم پسند نہیں ہے کیا...... یا کوئی اور بات ہے؟'' امی نے قدرے پریشان ہو کے پوچھا۔

دوسری طرف میں اپنی کیفیت خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھے حیرت ہورہی تھی یا میں پریشان تھا، خوش تھا یا ناخوش، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شاید سب کچھ غیر متوقع تھا یا ماہم کے لیے میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور میں اس کی عزت بھی کرتا تھا مگر شادی...... اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔

''ہارون کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ماہم مجھے شکل صورت، اخلاق، شائستگی میں بہت اچھی لگی......

میرے ذہن میں تمہاری شریکِ حیات کا جو تصور تھا وہ اس پر پوری اترتی ہے اگر تم نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں۔'' امی میرے انداز سے شاید یہی مطلب نکال پائی تھیں۔

''نہیں امی یہ بات نہیں...... بس آپ نے اچانک ہی یہ بات کردی اس لیے میں سنبھل نہیں پایا۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''ہارون تمہارے سلسلے میں نہ جانے کیوں اتنی دیر ہوگئی ہے۔ تم میرے تینوں بیٹوں میں سب سے مختلف اور منفرد ہو۔ تمہارے لیے تمہارے مزاج کی مناسبت سے شریکِ حیات ڈھونڈنا ایک مشکل کام تھا ورنہ لڑکیاں تو بہت ہیں پھر تم نے خود بھی اس سلسلے میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ میرا کام ہلکا ہو جاتا، خود ہی پسند کرلیتے تو کم از کم میری ذمے داری تو کم ہوجاتی ناں...... میں جانتی ہوں تمہیں ضرورت سے زیادہ ماڈرن اور آزاد خیال لڑکیاں پسند نہیں، اس لیے میری نگاہِ انتخاب ماہم پر پڑی۔ تم سوچ لو اگر نہیں تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے بابا بھی ایک پروپوزل کے بارے میں بتا رہے تھے۔ لڑکی ڈاکٹر ہے۔ یہاں نہیں تو وہاں دیکھ آتے ہیں۔'' امی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کو جہاں جانا ہے جائیں، میں نے یہ کام تو آپ کے سپرد کیا ہوا ہے۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں کہ میں خود کو ذہنی طور پر تیار کرسکوں۔ میرا مطلب ہے ماہم کو ایک دفعہ پھر اس زاویے سے دیکھ لوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ایک ہفتہ کافی ہوگا؟'' امی مسکرائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ماہم میرے آفس ہی میں کام کررہی ہے اس لیے انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔

''جی، بالکل...... کافی ہوگا۔'' میں نے مسکرا کے جواب دیا۔

☆☆☆

میں آفس جانے کے لیے تیاری میں عموماً کسی قسم کا تردد نہیں کیا کرتا تھا۔ جو ہاتھ لگے پہن لیتا۔ کبھی کبھار دو تین دنوں تک شیو بھی نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی کبھی پروا نہیں رہی کہ لوگوں کو میں کیسا نظر آرہا ہوں۔ مجھے بس اتنا پتا تھا کہ میں خود کو ہر حال میں اچھا ہی نظر آتا ہوں یہ اور بات کہ میری اس تساہلی اور بے پروائی کو لوگ بالخصوص لڑکیاں اسٹائل کا نام دیتی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اس دن میں ...... بڑی محنت سے تیار ہوا۔ ایسی تیاری عموماً میں تب کیا کرتا تھا جب کسی جگہ کوئی بڑی ڈیل ہونے جارہی ہوتی تھی...... آفس میں داخل ہونے کے ساتھ ہی بے شمار ستائشی نگاہیں میں نے اپنے اوپر محسوس کیں۔ میں بے نیازی سے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

کام تو ہر روز کی طرح آج بھی بہت تھے مگر سب سے زیادہ ضروری کام وہ تھا جو امی نے مجھ سے کہا تھا...... آج میں پہلی بار ماہم کو دوسری نگاہوں سے دیکھنے جارہا تھا جسے امی نے میری متوقع شریکِ حیات بنانے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ مجھے علم تھا ماہم مجھے ناپسند نہیں کرتی۔ وہ یقیناً اس خبر سے بہت خوش ہوگی۔ میں نے گلاس وال سے باہر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اسما جھنجلائے ہوئے انداز میں ان تین لڑکیوں سے نبٹ رہی تھی جو غالباً ماڈلنگ کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہوکے یہاں تک پہنچی تھیں۔

شوبز کی فیلڈ میں گلیمر ہی اس قدر زیادہ ہے کہ اس قسم کی بے شمار لڑکیاں روزانہ مختلف چینلز اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے چکر لگاتی نظر آتی ہیں' کچھ کا کام بن جاتا ہے اور کچھ چکر لگاتے لگاتے گھن چکر بن کے رہ جاتی ہیں۔ لڑکیوں کا حلیہ عجیب وغریب تھا۔ خود کو نمایاں کرنے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا تھا۔ کیا گھروں اور تعلیمی اداروں میں ان بچیوں کو اچھے بُرے، صحیح غلط کا فرق بتانے والا کوئی نہیں رہ گیا یا پھر یہ خود ہی کسی کی سننے کو تیار نہیں؟ اگلی نگاہ میری اسما پر پڑی جو انہیں کچھ تسلی دلاسا دے کر روانہ کرنے کے بعد اپنے چہرے پر آیا ہوا پسینہ خشک کررہی تھی۔ اسما کا حلیہ عام سا تھا۔ اس نے جینز کے اوپر لانگ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ کندھوں پر دوپٹا پھیلا ہوا تھا۔ چہرہ میک اَپ سے عاری تھا نہ کوئی زیور نہ سجاوٹ وہ ایک محنت کش شریف لڑکی تھی۔ پردہ نہیں کرتی تھی لیکن جسم کی اوچھی نمائش اور ناز و انداز سے کوسوں دور تھی۔ اس آفس میں مجھ سمیت سارے مرد دل سے اس کی عزت کرتے تھے۔

دفعتاً ماہم اپنی سیٹ سے اٹھ کر اسما کے پاس گئی۔ دونوں مسکرا کے ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگیں...... میں چونک گیا، آج مجھے صرف اسی کا تو انتظار تھا۔ موقع اچھا تھا میں دور سے اس کا دوسری نظر سے بغور جائزہ لے سکتا تھا۔

آج وہ بلیک سوٹ اور بلیک ہی اسکارف میں بلیک بیوٹی بنی ہوئی تھی۔ وہ خوب صورت تھی مگر اسٹائل نہایت سادہ تھا۔ بالوں کا رنگ کیا تھا وہ کتنے لمبے تھے مجھے اس کا مطلق علم نہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اسکارف کی قید میں نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ مزاج کی وہ کافی تیکھی تھی' صاف گو تھی۔ زیادہ ہنسنا مسکرانا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی اور فرائض کو جانفشانی سے ادا کرنا جانتی تھی۔ کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب لوگ اس کی بھی دل وجان سے عزت کرتے تھے۔ آج تک کوئی ناپسندیدہ بات اس کے متعلق میں نے نہیں سنی تھی۔

''کیا برائی ہے؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''اسٹیٹس میں مجھ سے کم ہے تو کوئی بات نہیں اسے بیاہ کر میرے گھر آنا ہے کون سا میں رخصت ہو کے اس کے گھر جارہا ہوں۔ ویسے بھی بیویاں اگر



شوہروں سے کم حیثیت ہوں تو ساری عمر دب کے رہتی ہیں۔ ورنہ کوئی بات برداشت نہیں کرتیں اور میں اپنی منوانا جانتا ہوں سو یہ ووٹ بھی ماہم کے حق میں جاتا ہے۔''

''پھر کیا خیال ہے؟'' دماغ نے دل سے سرگوشی کی۔

''ٹھیک ہی تو ہے...... بلکہ بے حد مناسب۔ مجھے بے حیائی سے نفرت ہے، میں پارسائی کا قدردان ہوں اور اپنی پارسائی پہ مغرور بھی۔ آج جہاں ہر طرف ایک انتشار پھیلا ہوا ہے لوگوں کو دھوکا دینا عام سی بات بن چکی ہے، میں ڈھونڈنے نکلوں تو کیا گارنٹی ہے کہ ایسی نیک اور باحیا لڑکی مجھے آرام سے مل جائے گی۔ کسی کے چہرے پر یہ کچھ لکھا ہوا نہیں ہوتا اگر تلاش کے بغیر گوہرِ مقصود ہاتھ آرہا ہے تو کیا برا ہے...... امی میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں شاید اسی لیے ان کی نگاہِ انتخاب ماہم پر جارکی ہوگی۔ لاشعوری طور پر مجھے بالکل ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی، میں نے مطمئن ہوکر اس کامیابی پر خود کو داد دی۔

اب مجھے آگے کا مرحلہ طے کرنا تھا یعنی ماہم کی رائے جاننی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ جیسے میں نے اس کو سراہا ہے وہ بھی مجھے سراہے...... میں اس کے چہرے کی وہ خوشی دیکھ کر محظوظ ہونا چاہ رہا تھا جو میرے پروپوزل کا سننے کے بعد متوقع طور پر اس کے چہرے پر آنے والی تھی۔

انٹرکام کا بزر بجا...... دوسری طرف اسما تھی وہ ماہم کو اندر بھیجنے کی اجازت چاہ رہی تھی...... نیکی اور پوچھ پوچھ میں تو خود ہی بہانے سے اسے بُلوانے والا تھا۔

''جی بھیج دیں۔'' میں نے لہجے کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی مسکراہٹ اسما کے پاس چھوڑ کر سنجیدہ شکل بنائے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو یہ ایک بار مسکرا کے میری طرف دیکھتی۔ دل میں ایک خواہش سی جاگی۔

دوسری طرف وہ میرے مسلسل دیکھے جانے پر کچھ جز بز سی نظر آرہی تھی۔

''سر یہ میں آپ کو پروجیکٹس کی آؤٹ لائن دکھانے آئی تھی۔'' میری طویل خاموشی سے تنگ آکے اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔ اس کے قدرے تنگ کے بولنے پر میں جیسے ہوش میں آگیا۔

''جی...... ابھی رہنے دیں۔''

''آپ مصروف ہیں تو میں بعد میں آجاؤں گی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں نہیں آپ بیٹھیں...... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' میں جلدی سے بولا۔

''کیا کہنا ہے سر؟'' وہ کچھ پریشان نظر آئی۔

لمبی چوڑی بات کرنے کا میں کبھی بھی عادی نہیں رہا تھا، نہ ہی مجھے کسی کو پروپوز کرنے یا اظہارِ عشق کا کوئی سابقہ تجربہ تھا' سو میرے منہ سے ایک دم نکلا۔

''ماہم...... آپ، آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' میرا سوال شاید زیادہ ہی غیر متوقع یا اچانک تھا۔ نہ وہ شرمائی نہ گھبرائی اور نہ ہی خوش ہوئی۔ بس ایک دم کھڑی ہوئی۔ عجیب سی نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی اس حرکت پہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ گویا امی کا آئیڈیا اور میرا اقرار دونوں ہی بیکار ثابت ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر کسی حوصلہ افزائی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ سرے سے حوصلہ شکنی ہی نظر آرہی تھی۔

''اچھا ہوا جو میں نے پہلے بات کرلی...... ابھی اس کو منانے یا قائل کرنے کی تھوڑی بہت گنجائش تو باقی ہے۔ ورنہ اگر کہیں یہ انکار باقاعدہ رشتہ لے کر



www.paksociety.com

جانے کے بعد ہوتا تو امی کس قدر ہرٹ ہوتیں۔" ایک نامعلوم سی اداسی نے دل کا گھیراؤ کرلیا تھا مگر امید کی ایک ننھی سی کرن اب بھی باقی تھی۔

☆☆☆

وہ اگلے دو دنوں تک آفس نہیں آئی۔ اسما نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں جھنجلا گیا۔ میں تو اُسے اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بہت سارے الفاظ جوڑ کے بیٹھا تھا۔ میرے پاس اس کا سیل نمبر موجود تھا مگر میں اس سے فون پر نہیں بلکہ ڈائریکٹ بات کرنا چاہتا تھا۔ اب بے چینی سے مجھے اس کی چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار تھا لیکن ایک ہفتہ پورا ہونے پر اس کے بجائے اس کا استعفیٰ پہنچ گیا۔ مجھے سخت شاک لگا۔ میں نے فوراً فرید کو فون ملایا اور اسے یہ خبر دی۔

"تم نے اس سے کچھ کہا تھا؟" دوسری طرف فرید کی جھجکتی ہوئی آواز ابھری۔

"اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟" میں نے اس کا سوال تھوڑے سے ردّوبدل کے بعد اسی کو لوٹا دیا۔

"وہ کچھ بتا نہیں رہی...... بس تمہاری ایجنسی چھوڑ کر کہیں اور جاب کرنا چاہ رہی ہے۔ وہ اتنے عرصے سے تمہارے پاس کام کر رہی تھی میں بہت مطمئن تھا۔ اس کی والدہ کا علاج، بہنوں کی تعلیم گھر کے اخراجات سب بہ حُسن و خوبی ہو رہے تھے۔ دوسری طرف مجھے اس کی اپنی ذات کی طرف سے بے فکری تھی مگر باہر کی دنیا بہت ظالم ہے ہارون۔" فرید پریشانی سے بولا۔

"بے وقوف ہے وہ اور کچھ نہیں۔" مجھے اپنی جلد بازی کے ساتھ ساتھ اس کے ردِّعمل پر سخت غصہ آرہا تھا۔

"مگر وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کوئی تو وجہ ہوگی نا یار...... تمہیں پتا ہونا چاہیے اگر نہیں ہے تو پتا کرو۔"

فرید کا لہجہ بدستور پریشان تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ یہ بتاؤ امی تم سے اس کا ایڈریس لے کر اس کے گھر گئی تھیں۔" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں...... آنٹی نے مجھ سے اس کا ایڈریس لیا تو تھا۔ میں تب سے کھٹکا ہوا ہوں اگر ایسی کوئی بات تھی تو کم از کم مجھے تو بتا دیتے۔" وہ جھجک کر بولا۔

"نہیں، وہ میرے کہنے پر وہاں نہیں گئی تھیں مگر اب مجھ سے پوچھ کے باقاعدہ جانا چاہ رہی تھیں۔" میں نے اس پر انکشاف کیا۔

"پھر......؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"پھر یہ کہ میں نے اس سے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہی۔" میں نے فرید کو راز دار بناتے ہوئے پوری کہانی اس کے گوش گزار کردی۔

"بے وقوف ہو تم...... جب آنٹی خود اس معاملے میں پڑ چکی تھیں تو تمہیں یہ اوٹ پٹانگ حرکت کرنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ صبر و سکون سے بزرگوں میں بات ہونے دیتے تو کوئی اچھا نتیجہ ہی سامنے آتا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"اب تو غلطی ہوگئی یار...... بس میں ذرا زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہوگیا تھا۔ بالکل اچانک ہی مطلوبہ چیز مل جانے والا حال ہوا تھا میرا...... اور میں سمجھتا تھا وہ مجھے ناپسند نہیں کرے گی، میں نے اس کی رائے جاننا چاہی اور وہ خفا ہوگئی۔" میں افسردہ ہو کے بولا۔

"ہوسکتا ہے اسے پروپوزل پر نہیں بلکہ تمہارے بے تکے انداز پر خفگی ہو۔" فرید نے نکتہ پیش کیا۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلی نہ جاتی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"تم کہو تو میں اس سے بات کروں؟" اس نے پیش کش کی۔

"نہیں...... تمہارے بات کرنے کا مطلب ہے



www.paksociety.com



کہ تم اسے برا بھلا سمجھانے بیٹھ جاؤ۔ اس کے ساتھ زبردستی کرو کہ اُسے ہاں ہی کرتے بنے اور میں اس طرح یہ سب نہیں چاہتا۔ اگر وہ ہاں کرے گی تو بالکل اپنے دل کی آواز سن کر ورنہ نہیں۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔

"ہارون تم میرے بہت اچھے دوست ہو جسے میں اپنی نوعمری سے جانتا ہوں۔ دوسری طرف وہ ہے جو مجھے بالکل اپنی سگی بہنوں کی طرح عزیز ہے۔ چچا میرے والد کے اکلوتے بھائی تھے۔ دادا کے بعد بھی کچھ عرصے تک دونوں خاندان ایک چھت تلے اکٹھے رہے۔ ایک دوسرے کے غم و خوشی میں شریک...... پھر بچے بڑے ہونے لگے اور گھر چھوٹا پڑ گیا تو ابا ہم سب کو لے کر سرکاری گھر میں شفٹ ہوگئے۔ چچا کی مالی حیثیت زیادہ مستحکم نہ تھی اس لیے انہیں آبائی گھر دے دیا گیا اور پھر چچا کا انتقال ہوگیا۔ تبسم یعنی میری بیوی سب سے بڑی تھی پھر ماہم تھی...... دونوں اس وقت بی اے اور سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہی تھیں۔ میری ان دنوں نئی نئی نوکری لگی تھی۔ ابا نے پہلا کام یہ کیا کہ میری اور تبسم کی منگنی کردی۔ جب تک ابا زندہ رہے بھائی کے گھر کی کفالت کرتے رہے پھر وہ بھی چل بسے تو ان دونوں بہنوں نے آگے بڑھ کر گھر کو سنبھالا۔ میری شادی کے بعد ماہم کو لگنے لگا کہ اب رشتہ اور ہوگیا ہے اور اس خوددار لڑکی نے مجھ سے یا تبسم سے ایک پیسہ لینا بھی اس گھر پر حرام سمجھ لیا۔ چچی چچا کے بعد سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں میڈیکل کالجز میں پہنچ چکی تھیں۔ ایک بارِ گراں تھا جو ماہم نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ مجھے صرف یہی سمجھ میں آیا کہ میں اس کے لیے کچھ ایسا بندوبست کردوں جہاں اسے کسی کی مدد کے بغیر اپنے گھر کی ذمّے داریاں اٹھانے کی طاقت حاصل ہو جائے...... آگے کی کہانی تو تم جانتے ہی ہو۔

## بے نام عید کارڈ

بے نام سا یہ عید کارڈ
دلاتا ہے ہم کو خوب یاد
عمر کے سلسلے تمام......
جواب تو ہوگئے ہیں خواب
بے نام سا یہ عید کارڈ
مچا گیا ہے قیامتیں
جتا گیا ہے الفتیں......
اس میں لکھے سب اشعار
چھیڑتے ہیں دل کے تار

مرسلہ: خالدہ نواز، منڈی بہاؤالدین

*************

## یادوں کی کہانی

میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں جب
ان میں اشکوں کی روانی ہوتی ہے
بس!
اسی لمحے ان آنکھوں میں
تیری یادوں کی کہانی ہوتی ہے

شاعرہ: رفعت خادم حسین، شہر اوستہ محمد

وہ بے حد خوددار ہے اور حساس لڑکی ہے۔ ایسے لوگ عموماً اپنا نقصان اپنے ہاتھوں کرلیتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اب وہ اپنی زندگی مزید مشکل میں ڈالے۔" فرید نے آزردگی سے ماہم کی داستان سنائی۔

"مگر میں پہلے اس سے خود بات کروں گا۔ اتنا حق تو مجھے بھی ہونا چاہیے عین شرعی طریقہ ہے لڑکی کی

مرضی معلوم کرنا۔“ میں نے ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے قدرے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”وہ اپنے آنے والے کئی رشتے بڑے آرام سے رد کر چکی ہے۔ اس کا مقصد اپنی دونوں بہنوں کی تعلیم مکمل کروانا ہے۔ وہ نہیں مانے گی اگر تم اسے قائل نہ کرسکے خیر تم کوشش کرلو...... پھر میں اپنی کوشش کروں گا لیکن ہارون تم سے درخواست ہے اگر تم اپنی نیت میں سچے ہو تو پیچھے مت ہٹنا......“ فرید نے التجا کی۔

”تم اسے ایک بار آفس بھیج دو۔ آگے کا کام میرا۔“ فرید سے کہتے ہوئے میں نے فون بند کردیا۔ پسندیدگی، عشق یا محبت سب سے زیادہ ماہم کا حصول اب مجھے ایک چیلنج کی طرح محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ آفس آگئی تھی میرے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی...... میں نے فوری طور پر اپنی تمام مصروفیات ترک کرکے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

”آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ یہاں تک چلی آئیں۔ ورنہ کہیں اور تو آپ مجھ سے ملنے پر آمادہ ہوتی نہیں۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کا آغاز کیا۔

”آپ کا خیال بالکل درست ہے۔“ وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی اس کا انداز بہت لیے دیے تھا۔

”دیکھیں ماہم، میں ایک انتہائی شریف آدمی ہوں۔ آپ کو پرپوز کرکے میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا جو آپ یوں ناراض ہوکے گھر بیٹھ گئیں۔ میری بات کا جواب تک نہیں دیا آپ نے...... غلط کام تو تب ہوتا جب میں آپ کو بغیر کسی رشتے ناتے کے یونہی لیے گھومنا چاہتا...... میں تو آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔

”غلط فہمی ہے آپ کی کہ آپ مجھے یونہی اِدھر اُدھر لیے گھومنا چاہتے اور میں آپ کے اشاروں پر ناچتی چلی جاتی۔“ وہ قدرے چیخ کر بولی۔

”آپ کو بھی غلط فہمی ہے میں اس قسم کا آدمی ہی نہیں ہوں اگر ہوتا تو اس مقصد کے لیے مجھے کوئی کمی نہیں تھی۔“ میں بھی جواباً تنک کر بولا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آرہا...... آپ اپنی پارسائی اور عظمت کے ہر وقت گُن کیوں گاتے رہتے ہیں۔ آپ یقیناً بہت اچھے ہوں گے لیکن مجھے آپ کی بات اچھی نہیں لگی اور میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی تو اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے؟“ اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

”کیوں نہیں کرسکتیں آپ مجھ سے شادی۔ کیا خرابی ہے مجھ میں...... میں بدشکل ہوں، بے روزگار ہوں، بدکردار ہوں، کیا ہوں؟“

”یہی تو مصیبت ہے آپ اس میں سے کچھ بھی نہیں ہیں۔“

”تو پھر......“ میں جھنجلا گیا۔

”دیکھیں ہارون صاحب، کچھ دنوں پہلے آپ کی والدہ ہمارے گھر آئی تھیں۔ اس میں شک نہیں وہ بے حد نفیس خاتون ہیں۔ ان سے میری پہلے بھی دو تین ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ انہوں نے اپنا مکمل تعارف تو نہیں کروایا مگر میں سمجھ گئی وہ کون ہیں۔ وہ آپ سے بے حد مشابہ ہیں...... بہرحال ان کا آنا، میرے گھر والوں سے ملنا، مجھے چونکا گیا تھا۔ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن میں... نادان نہیں ہوں پھر ان کے آنے کے چند دنوں کے بعد آپ کے منہ سے ڈائریکٹ پرپوزل کا سن کر میں خوف زدہ ہوگئی۔“ اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

”خوف زدہ...... کیوں اس میں خوف زدہ ہونے والی کون سی بات ہے؟“ میں نے حیرانی سے

www.paksociety.com





پوچھا۔

”ہارون صاحب شادی صرف دو انسانوں کے اکٹھا ہونے کا نام نہیں...... یہ دو خاندانوں کے ملاپ کا نام ہے۔ خاندان ہم پلہ ہوں یا ملتے جلتے ہوں تبھی ایسے رشتے پائیدار ثابت ہوتے ہیں ورنہ غیر متوازن رہتے ہیں...... اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا اور آپ کے خاندان کا کوئی مقابلہ نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”بس اتنی سی بات......“ میں جلدی سے بولا۔

”آپ کے لیے شاید یہ اتنی سی بات ہو مگر میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔“

”دیکھیں ماہم، یہ واقعی کوئی اہم بات نہیں ہے اگر ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو تو باقی سارے مسئلے ثانوی رہ جاتے ہیں۔“

”آپ کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہے؟ میں یہاں پر ملازم کی حیثیت سے کام کررہی ہوں آپ باس ہیں۔ آپ جو کہتے ہیں وہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور اگر آپ میری کوئی بات مان لیں تو وہ میرے لیے آپ کی عنایت بن جاتی ہے۔ نہ مانیں تو آپ کی مرضی کہلاتی ہے۔ ایسے میں انڈر اسٹینڈنگ کہاں سے آگئی؟“

میں قدرے لاجواب ہوگیا...... مگر ہار نہیں مانی تھی۔

”انڈر اسٹینڈنگ پیدا بھی تو ہوسکتی ہے۔“

”جس انڈر اسٹینڈنگ کی آپ بات کررہے ہیں وہ انڈر اسٹینڈنگ ہمیشہ برابری کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ خیر یہ الگ بحث ہے مجھے صرف اتنا کہنا ہے میری ذاتی ذمے داریاں بھی بہت ہیں ابھی میں اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی۔“

”آپ کی ذمے داریاں میری ذمے داریاں بھی تو بن سکتی ہیں۔“ میں نے فراخدلانہ پیشکش کی۔

”میں ایسا نہیں چاہتی...... میں اور میرا خاندان کسی کا دست نگر بن کے رہے یہ میرے لیے باعثِ شرمندگی ہوگا۔ مختصراً یہ کہ آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوسکتا، آپ کو کوئی بھی بہت اچھی لڑکی مل جائے گی، آپ اس سے شادی کرلیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”مگر مجھے تو آپ اچھی لگتی ہیں۔“ میں نے آخری کوشش کرنی چاہی۔

”ہارون صاحب مجھے آپ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ مجھے بھی آپ بہت اچھے لگتے ہیں اور میں دل سے آپ کی عزت کرتی ہوں۔ مگر ضروری تو نہیں کہ جو چیز ہمیں اچھی لگے وہ ہماری بن جائے...... ہمیں قدرت کے دلکش نظارے بھی بہت اچھے لگتے ہیں مگر نہ تو ہم آسمان کی وسعتوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتے ہیں نہ بلند پہاڑوں کو اپنی ٹیبل پر رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ہرے بھرے باغوں کو اٹھا کے اپنے گھر لے جاسکتے ہیں۔ جو چیز جہاں ہوتی ہے وہیں اچھی لگتی ہے ہر چیز کو اپنے بس میں کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ آپ نے مجھے عزت دی، آپ کا شکریہ...... اب آپ مجھے بھول جائیں اس میں ہی بہتری ہے۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ دل کے کسی گوشے میں اپنی ہتک کا احساس بھی سر اٹھا رہا تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر اسے اپنایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

”آپ جاب مت چھوڑیں...... میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“ میں نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھے دوسری جگہ جاب مل چکی ہے...... اب میرا یہاں کام کرنا مناسب نہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”مگر کیوں...... آپ کو پتا ہے کہ ہر جگہ کا ماحول ہماری ایجنسی کی طرح نہیں ہوتا۔“ میں نے خفگی سے

کہا۔

”جانتی ہوں...... میں نے یہاں جتنا عرصہ کام کیا بہت سکون اور عزت کے ساتھ کیا۔ ہوسکتا ہے دوسری جگہ مجھے ایسا ماحول نہ ملے مگر ہارون صاحب میں نے یہاں کام کر کے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کچھ اپنی حفاظت مجھے کرنی آتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”خوامخواہ میں ایڈونچر کرنے کا شوق کیوں ہو رہا ہے آپ کو۔“ میں نے خفگی سے پوچھا۔

”میں نے ایک بار آپ سے کہا تھا ناں کہ باغوں میں پھرنے والوں کے پاؤں آلودہ نہیں ہوتے مگر کیچڑ بھری راہ گزر سے گزرنے والوں کے پیر اگر کیچڑ میں لتھڑنے سے بچ جائیں تو کمال کی بات ہوتی ہے۔ کیچڑ کو صاف کرنا تو میرے بس میں نہیں لیکن دوسروں کو صاف راستہ تو دکھایا جاسکتا ہے، خود تو بچا جاسکتا ہے۔ بس یہی میرا مقصد ہے۔ میں جہاں بھی رہوں اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

اس کی باتیں مجھے آئینے کے روبرو لے آئی تھیں۔ میں خود کو عظمتوں کے اس مینار سے جہاں میں نے اپنے وجود کو سنبھال کے رکھا ہوا تھا نیچے اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے، جب دوسرے کوئی نیکی کریں تو ہم اس سے متاثر ہوجاتے ہیں، واہ واہ کرتے ہیں پھر اگر ہمیں کسی نیکی کی توفیق نصیب ہوجائے تو ہم خود کو دوسروں سے الگ تھلگ بہت اعلیٰ و ارفع تصور کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ دوسرے ہمیں حقیر کیڑے مکوڑوں کی طرح محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ہم ان سے دل ہی دل میں نفرت کرنے لگتے ہیں اور انہیں اپنے برابر بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اپنے برابر بٹھانے کے لیے ہم خود سے بھی زیادہ پاک وصاف وجود ڈھونڈتے ہیں جو اکثر ہمیں مل نہیں پاتا۔ نیکی صرف اس وقت تک نیکی رہتی ہے جب تک کرنے والے کو اس بات کا احساس نہ ہو جہاں اسے یہ گمان ہوجائے کہ وہ نیکی کر رہا ہے وہ نیکی فخر اور فخر سے غرور بننے میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ نیکی کرو اور بھول جاؤ۔ مجھے اجازت ہے سر!“

میرا دل چاہ رہا تھا اس سے کہوں...... رک جاؤ لیکن میرے منہ سے کچھ نہ نکلا...... صرف اسے دیکھ کے رہ گیا۔ کہنے سننے کو باقی کیا بچا تھا۔ وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد ایمانداری سے اپنا محاسبہ کیا۔

اس کا انکار میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ میں اتنا قدآور ہوں کہ جس چیز پر انگلی رکھ دوں گا میری ہوجائے گی۔ میرا مضبوط کردار، میری حیثیت، میری شخصیت اتنی بلندی پر محسوس ہوتی تھی کہ کوئی لڑکی مجھے بیوی بنانے کے قابل ہی نہیں لگتی تھی۔ میں ماہم سے شادی صرف اس لیے کر رہا تھا کہ اپنے فخر اور غرور کو دلہن بنا کے احتیاط سے سجا کے اپنے گھر میں رکھ دوں۔ دوسروں کو دکھاؤں کہ دیکھو یہ ہے حسن و پارسائی کا وہ نمونہ جو مشکل سے نظر آتا ہے مگر میں خوش نصیب ہوں کہ میرے پاس ہے۔ ماہم نے سچ کہا تھا۔

گرے ہوؤں پر حقارت کی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جانے سے کہیں بہتر ہے کہ ان کا ہاتھ تھام کے انہیں اٹھنے میں مدد دی جائے۔ بروں سے نہیں برائی سے نفرت کرنی چاہیے...... اپنے صاف لباس پر غرور کرنے کے بجائے دوسروں کو بھی صاف راستہ دکھانے کی کوشش تو کرنی چاہیے شاید کسی کا لباس کیچڑ کی چھینٹوں سے بچ جائے۔ میں بھی یہ کام کرسکتا تھا ماہم کی طرح...... یہ کام کوئی بھی کرسکتا ہے بس انسان کی نیت نیک ہونی چاہیے باقی کام تو سارے اللہ کے ہوتے ہیں۔



# سلام عید

زاہدہ پروین

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ تمام عالم کی طرح اس گھر پر بھی اپنی رحمتیں برساتا گزر رہا تھا۔ حسبِ معمول ماں جی مختلف سبزی ترکاریوں کی ٹوکری سجائے سامنے رکھے تھال میں کاٹ چھانٹ کر رکھتی جارہی تھیں۔ ناک کی پھننگ پر عینک دھری تھی۔ ہاتھ میں ان کی مخصوص چھری تھی‘ ساتھ ہی ساتھ اندر باہر آتی جاتی‘ لپک جھپک کرتی غزالہ سے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی جاری وساری تھا۔



www.paksociety.com

غزالہ ان کی بے حد قابلِ اعتماد اور منہ چڑھی ملازمہ تھی گوکہ ابھی نوعمر ہی تھی مگر بلا کی ذہین اور چلبلی۔ اس کا روز کا معمول تھا کہ اِدھر ماں جی نے نماز عصر ادا کی اس نے ترکاری کی ٹوکری ان کے آگے لا دھری۔ ہاں رمضان المبارک کا متبرک مہینہ لگتے ہی یہ فریضہ وہ نمازِ عصر کے بجائے نمازِ ظہر کے بعد ادا کرنے لگی تھیں۔ آج بھی ماں جی کو اس کی برق رفتاری پر ہنسی آ رہی تھی۔ آتے جاتے وہ کئی احکامات صادر فرما چکی تھی۔

”ماں جی، ہری پیاز اور ہری مرچیں زیادہ کترنی ہیں...... پالک بھی بہت ساری......“

”آج پکوڑے میں نے بہت سارے تلنے ہیں جی......“

”آلوؤں کے چپس میں آج تو نیبو بھی نچوڑوں گی......“

”چنوں میں املی اور نیبو دونوں ہی ملانے سے زیادہ مزہ آئے گا......“

”خبردار......!“ تحمل سے ہنستی ہوئی ماں جی چلا پڑیں۔ ”یہ سارے کھٹے کھٹے دھماکے تو اپنی پلیٹ میں کرلینا...... یہ بتا! تو روزہ اللہ پاک کے لیے رکھتی ہے یا افطار کے مزے اڑانے کے لیے ہیں......؟“

”میری سوہنی ماں جی، دونوں کے...... لیے۔“ غزالہ ڈھٹائی سے ہنستی ہوئی آئی اور فروٹ سے بھری ٹوکری ان کے آگے رکھ گئی۔

”ٹھیک ہے پھر۔“ ماں جی نے دبنگ لہجے میں اسے سنایا۔ ”جاگنی رات تک تیرے دو قرآن پاک پورے نہ ہوئے تو پھر دیکھنا اپنا حشر!“

”تے...... میری ماں جی نے جوڑے بھی تو دو بنوا کے دینے ہیں عید کے۔“ جواباً اس نے اِترا اترا کر اپنا فرمائشی پروگرام نشر کیا پھر قہقہے لگاتی ہوئی باورچی خانے میں گھس گئی۔

ماں جی کے روزے سے خشک ہونٹوں پر مشفق سی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور وہ امرود کا کچالو بنانے میں مصروف ہوگئیں۔

عین اس وقت پڑوس کی نجمہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دھم سے ان کے قریب آ بیٹھی۔ وحشت سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آواز پھٹی پھٹی......

”ماں جی...... ماں جی! لٹی گئی میں...... ہائے ربا! جنت میرے سر وچ خاک پا چھوڑی۔“

”یا اللہ خیر!“ ماں جی کے ہاتھ سے امرود چھوٹ گیا۔ انہوں نے پریشان ہو کر اس دہشت زدہ ماں کو دیکھا جو برگِ خزاں کی طرح کانپ رہی تھی۔ ”کیا کر دیا جنت نے؟“ ان کا لہجہ لڑکھڑا سا گیا۔

نجمہ نے ان سے بھی زیادہ لڑکھڑا کر اور گھبرا کر جواب دیا۔ ”لو جی لو، آپ خود ہی پڑھ لو اس کے کرتوت۔“ اتنا کہہ کر اس نے اوڑھنی تلے چھپا ہاتھ باہر نکالا، جس میں بہت خوب صورت لال گلابی پھولوں والا عید کارڈ دبا بڑی رازداری سے مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ”مجھے پہچانو، میں کون ہوں؟“

”ہیں...... یہ کیا ہے نجمہ؟“ ماں جی نے پریشانی کے لہجے میں پوچھا۔

”لو جی! آپ کو پتا ای نہیں؟“ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”یہ وہی ہے جی، جس کو آج کل بولتے ہیں لل...... لے...... لو...... لے لو ویٹر۔“

قریب سے جاتی ہوئی غزالہ نے تصحیح کی۔ ”لے لو ویٹر نہیں...... آپاں نجمہ...... لَو لیٹر، لَو لیٹر بولو۔“

”تو چپ رہ لتری کہیں کی۔“ ماں جی نے اسے زور سے ڈانٹا۔ ”اپنے کام سے کام رکھا کر۔“ پھر نجمہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”ذرا حوصلہ رکھ نجمہ! بے صبری مت بن، آہستہ بول۔“ اتنا کہتے کہتے انہوں نے عید کارڈ اس سے لے کر عینک درست کی۔

عید کارڈ کے اندرونی ورق پر صاف ستھری رائٹنگ میں شعر لکھا تھا۔

”میری دعا ہے مناؤ ہزار عیدیں تم
مسرتوں کی تمہیں ہر گھڑی مبارک ہو
منجانب: ۔شاہ جہاں خان“

نجمہ کی مضطرب نگاہیں ماں جی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں جو کارڈ پڑھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ نجمہ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ان کا شانہ ہلا کر فریاد کی۔

”لو جی! پڑھ لیا ناں اپنی اکھیوں نال۔ ہن دسو میں کی کراں۔ ہائے رُبا میں لٹی گئی۔ ماں جی! اب کیا ہوگا؟“ شہر آ کر وہ پنجابی اور اردو ملا جلا کر بولنے لگی تھی۔

”ہائے ہائے نجمہ، اللہ عقل دے تجھے۔“ اس کے مسلسل بین سے گھبرا کر ماں جی چونک پڑیں۔ ”ہوش کر ہوش کر، بے وقوف زنانی۔“ انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ ”یہ کارڈ لائی کہاں سے ہے؟“

ان کی لتاڑ سے نجمہ نے قدرے حوصلہ پکڑا اور گیلی آنکھیں رگڑ کر بولی۔ ”او جی، پرس سے نکالا ہے اس کے۔ وہ اسکول سے آ کر لیٹی پڑ گئی تو میں نکال لائی۔“

”لاحول ولاقوة۔“ ماں جی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”تو بچیوں کی چیزوں کی تلاشی لیتی ہے...... دفع دور۔“

”تو پھر کیا کروں جی!“ نجمہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”آج کل زمانہ نازک...... گھروں سے نکلنا آسان نہیں۔ جدھر دیکھو، منڈے ای مُنڈے کھڑے رہتے۔ اب میں اس کی تلاشی نہ لوں تو کیا کروں ماں جی......؟ اس منحوس کا...... رڈ کا بھی اسی لیے پتا لگ گیا۔“ اس نے لفظ کارڈ دو حصوں میں ادا کیا اور ماں جی کی طرف دیکھنے لگی جیسے بہت عقلمندی کا کام کر کے آئی ہے۔





”اچھا......! اب کیا کروگی؟“ ماں جی نے اس پل پل بدلتی عورت کو بغور دیکھا۔

”نوکری ختم کراواں گی۔“ اس نے بڑے جلال سے جواب دیا۔

”پھر...... گھر کے مسئلے حل کیسے ہوں گے؟“ ماں جی نے اسی انداز میں پوچھا۔

”نہ ہوتے نہ سہی!“ اس نے نہایت طیش کے عالم میں فیصلہ سنایا لیکن یہ فیصلہ فقط چند لمحوں کا تھا۔ فوراً سے پیشتر ہی اس کے بین دوبارہ شروع ہوگئے۔

ماں جی اس کی مجبوریوں سے واقف تھیں۔ خوب جانتی تھیں کہ اس بے پڑھی اور سادہ لوح، سر سے پاؤں تک سفید پوشی کی چادر میں لپٹی رہنے والی عورت کی مختصر سی داستانِ حیات دکھوں اور ذہنی اذیتوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کی حواس باختگی کا سبب اور اصل محرک ہی اس کے بے شمار تفکرات اور محدود مالی وسائل ہیں۔ تاہم آج جو اس نے مسئلہ بیان کیا تھا، وہ اپنی جگہ نہایت ہی تشویش ناک اور فکر انگیز تھا۔ وہ خود اندر ہی اندر دہل کر رہ گئی تھیں۔ اِدھر روزہ افطار کا وقت دوڑا چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نجمہ کو سمجھا بجھا کر اور زباں بندی کی تاکید کر کے گھر بھیج دیا اور کہا ...... تراویح شروع ہونے سے پہلے پہلے جنت کو ساتھ لے کر ان کے پاس آ جائے۔ بھیجنے سے پہلے بار بار تاکید کرتی رہیں کہ گھر پہنچ کر از خود بیٹی سے عید کارڈ کے متعلق ہرگز کوئی بازپرس کرنے نہ بیٹھ جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

لیکن افطار سے نمازِ مغرب ادا کر لینے کے بعد تک ماں جی کا جہاندیدہ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ کرنے کو تو انہوں نے نجمہ سے بہت بڑا وعدہ کر لیا تھا مگر اندر ہی اندر کوئی اَن دیکھا احساس ان کو ڈرا بھی رہا تھا۔ زمانہ اور حالات، جن راستوں کی طرف گامزن تھے، کون ناواقف تھا؟ کسی لمحے تو وہ



www.paksociety.com

نجمہ کے خوف اور شبہات کو بچ جان کر کانپ جاتیں مگر دوسرے ہی لمحے ان کا شعور، حوصلے اور نیک عزم کا سائبان بن کر تن جاتا۔

گو کہ نجمہ سے ان کی واقفیت بہت پرانی نہ تھی تاہم گہرے تعلقات اور بھائی چارے کے لیے لمبی مدتیں ضروری نہیں ہوتیں۔ کسی زمانے میں نجمہ والا گھر جو درحقیقت نجمہ کا میکا تھا، ایک آباد گھرانا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد اس کے دونوں بھائی ایک عرصہ اسی گھر میں رہے۔ بعدازاں دونوں فیملی سمیت کہیں باہر شفٹ ہوگئے تو جاتے جاتے گاؤں میں بیاہی اکلوتی بہن نجمہ کو یہ گھر بخش گئے۔ لہٰذا وہ اپنے تین بچوں اور میاں کے ساتھ شہر آبسی۔ نجمہ اور اس کا رہن سہن دیکھ کر ماں جی کو تعجب ہوتا تھا کہ بھائی تو جدید تعلیم سے آراستہ شہری اور بہن کو بالکل ہی دیہاتی بنادیا حالانکہ خاندانی اعتبار سے یہ لوگ کچھ کم نہ تھے۔

میاں نے نہ تو گاؤں میں اس کے لیے ہل بیل جوتے تھے، نہ شہر آکر کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ گاؤں کے چوپال میں البتہ وہ ایک داستان گو کی حیثیت سے ضرور اپنی شناخت رکھتا تھا۔ شہر آکر وہ اپنی اس شناخت سے بھی محروم ہوگیا۔ اپنی اس محرومی کا تمام تر ذمے دار وہ کھلے بندوں اپنے ''سالوں'' کو ٹھہرانے بیٹھ جاتا اور جب ذہنی رو بھٹکتی تو ان دور پردیس جا بسنے والے سالوں کی شان میں وہ، وہ قصیدہ خوانی کرتا کہ نجمہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر ماں جی کے گھر پناہ گزیں ہوجاتی۔ ایسے ہی کسی موقع پر ماں جی نے نجمہ کو مشورہ دیا کہ ''پہلے خود اپنا رویہ درست کرو پھر میاں کو سمجھا بجھا کر کسی کام کے لیے تیار کرو۔'' قصہ مختصر نجمہ نے مکان کا پچھلا کمرا جو پرلی گلی میں بھی کھلتا تھا، مرمت کرایا۔ اپنی کانوں کی ڈنڈیاں بیچ کر اس میں کچھ سامان ڈالا اور میاں کی منت سماجت کر کے گھر کی چارپائی سے اٹھا کر وہاں ایک کرسی پر جابٹھایا۔ خوبیٔ قسمت...... جلد ہی ماں جی کا مشورہ ''جو نے دی ہٹی'' بن کر نجمہ کے میاں یونس کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ یونس کو اپنی منی سی ہٹی پر دو چار داستان گوئی کا شوق پورا کرنے والے ہمہ تن گوش ٹائپ ہم نوالہ و ہم پیالہ میسر آگئے بلکہ کسی حد تک گھر کی دال روٹی چلنے کا وسیلہ بھی پیدا ہوگیا۔

ایک دن نجمہ نے انہیں بتایا کہ جنت کو محلے کے ہی ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت مل رہی ہے۔ خود نجمہ بھی چاہ رہی تھی کہ ایسا ہوجائے۔ اس طرح اس کا خیال تھا، وہ جنت کے لیے کچھ جمع جوڑ کرسکے گی۔ ماں جی نے بھی ان کے حالات دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس طرح جنت اسکول پڑھانے جانے لگی۔ نجمہ بہت خوش اور مگن تھی۔ ماں جی اور ان کے گھرانے کی اس کے دل میں ایک خاص قدر اور عقیدت تھی مگر آج جنت نے بقول خود اس کے ''سر میں خاک پا چھڈی۔''

ماں جی انہی خیالات میں کھوئی ہوئی خاموش گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں کہ وہ دونوں ماں بیٹی آگئیں۔ جنت نے ادب سے انہیں سلام کیا اور دھیرے سے سر جھکا کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

ماں جی نے اس کے سراپے کو گہری نظر سے تولا مگر پھر خود ہی جھٹکا کھا گئیں۔ ''یہ...... جنت ہے؟'' انہوں نے نجمہ سے پوچھا۔

''ہاں جی...... بالکل......'' اس نے بیزاری سے منہ بگاڑ کر جواب دیا۔ ظاہر ہے دوپہر سے ماں جی کی ہدایات پر عمل پیرا رہتے رہتے اور اپنی زبان بندی کی سزا کاٹتے کاٹتے اس کا منہ کڑواہٹ سے لبالب بھر چکا تھا۔ اگر جو ماں جی کا ادب نہ ہوتا تو وہ اب تک بقول شخصے بیٹی کو ''پھڑکا'' چکی ہوتی مگر ابھی تو سارا جوار بھاٹا اس کے اندر ہی اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور





باہر نکلنے کو بے قرار تھا۔ کوئی اس کے اندر سے گرج گرج پوچھ رہا تھا۔ ''یہ منحوس شاہ جہاں خان ہے کون؟''

جنت کو دیکھتے ہی بالکل یہی خیال ماں جی کے دماغ میں بھی سوال بن کر گونج گیا لیکن انہوں نے تحمل سے کام لیا۔ عین اسی وقت غزالہ دھم دھماتی ہوئی آپہنچی۔ ماں جی نے کچھ سوچ کر فوراً ہی اسے مصروفیت بتا کر ٹالا۔

''غزالہ! آج خیر سے چار پانچ روزے آگئے تو نے کچے قیمے کے کوفتے ابھی تک تیار کر کے فریز نہیں کیے۔ اللہ خیر سے وہ ٹائم لائے، دوسرے عشرے میں ہی سب کا آنا جانا لگ جائے گا۔ چل میری لعل! فٹافٹ ایک کیتلی چائے یہاں پہنچا کر شروع ہوجا۔ دیکھ سارا قیمہ سل پر پیسنا، چاپر میں نہیں ورنہ......'' وہ بڑے ڈلار سے ہنسیں۔ ''سارا اوور ٹائم ضبط...... اور ساتھ ہی اسٹار پلس کے ڈرامے شرامے سارے ختم۔''

''واہ جی، واہ۔'' غزالہ شوخی سے نجمہ کی طرف دیکھ کر منمنائی۔ ''میں اکیلی تو نہیں دیکھتی یہ ڈرامے...... آپاں نجمہ بھی تو شوق سے دیکھتی ہے۔'' مگر آپاں نجمہ تو خود ہی آج کل بقول خود ''کھلار پھس'' بنی ہوئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ غزالہ کو دیکھا، مسکرائی نہ کچھ بولی۔

چائے آنے تک ماں جی اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں مگر دل ہی دل میں اس شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ لڑکی سے کس طرح ''شاہ جہاں خان'' کی وضاحت معلوم کریں؟

بالآخر چائے کا آخری گھونٹ بھر کر انہوں نے گھٹنے کے نیچے دبا عید کارڈ نکالا اور جی کڑا کر کے جنت کے سامنے ڈال دیا۔

''لعل! ذرا یہ تو بتاؤ، تمہیں یہ کارڈ کس نے دیا ہے؟'' جب انہوں نے سامنے بیٹھی لڑکی سے جواب طلب کیا تو انہیں اپنی آواز خود ہی اجنبی لگی۔

''ارے...... یہ تو شاہ جہاں کا عید کارڈ ہے مگر آپ کو کہاں سے ملا؟''

جنت کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اپنا کارڈ یہاں دیکھ کر وہ متحیر رہ گئی تھی۔ ماں جی براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی کی سچی حیرانی ان کی جہاندیدہ نظر سے چھپ نہ سکی۔ تاہم اس کا جواب ابھی وضاحت طلب اور تشنہ ہی تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ تفتیش کا آغاز کرتیں، نجمہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ جنت کے منہ سے ''شاہ جہاں'' کا نام سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہوگئی اور کڑک کر بولی۔

''میں پچھدی آں...... یہ مرن جوگا ''شاہ جہاں'' ہے کون؟ تیرا کی لگدا؟ اے عید کارڈ کیوں دتا، ہور تو کیوں لتا؟'' اس کی پھٹے بانس کی سی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ جنت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماں کو تکنے لگی۔ اول تو اسے یہ عجیب و غریب جرح پلے ہی نہ پڑی، اوپر سے اس کا جارحانہ انداز۔

اس کی حیرت و معصومیت سے نجمہ مزید تاؤ کھا گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ماں جی کے ''ہائیں، ہائیں'' کرتے کرتے، رکھ کے ایک زوردار چانٹا بیٹی کے نرم گلابی گال پر جڑ دیا اور تھانے دارنی بن کر پھنکاری۔

''دس او شاہ جہاں مٹی پیڑاں کون ہے؟''

اب جنت کی عقل قدرے ٹھکانے لگی۔ مارے خجالت اور کھسیاہٹ کے آنسو آنکھوں کی منڈیروں پر ہی ٹک کر تھم گئے۔ جی چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ بہ مشکل اس کی زبان سے نکلا۔

''امی جی! امی جی! آپ جانتی تو ہیں شاہ جہاں کو...... میں اور وہ ہر روز مل کر تو اسکول جاتے ہیں پڑھانے۔''

''ہیں......؟'' اب حیران ہونے کی باری نجمہ کی



www.paksociety.com

تھی۔

''او...... ''شاداں'' ہے کہ ''شاہ جہاں؟'' اس نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

''مجھے......نہیں معلوم! اس کے گھر سے پتا کریں جا کر۔'' جنت نے جل کر جواب دیا اور بہت شاکی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ اس دفعہ وہ کسی کے بھی رعب میں نہ آئی۔

''ہائے میرے نصیب 'ٹٹ پینے ......'' نجمہ نے دوہتھڑ اپنے سر پر مارا۔ ''سارا دن رو رو مر گئی۔ آ پتا ای نئیں وہ شاہ جہاں نئیں شاداں ہے۔ حکیم جی دی دھی۔ پر ماں جی' اونے اپنے نام دے نال بھلا ''خان'' کیوں لایا؟ اوتاں آپ ہی منڈا لگے؟''

''تو دوہتھڑ نہیں' اپنے سر پر لکڑ مار نجمہ!'' اتنی دیر سے بت کی طرح ساکت بیٹھی ماں جی نے اسے لتاڑا۔ انہیں رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں ایک بے کھوپڑی کی عقل سے پیدل عورت کے کہے میں آ کر ایک معصوم لڑکی کا دل توڑا۔ جی ہی جی میں وہ سخت شرمسار ہو رہی تھیں۔ کاش' وہ بلا تحقیق ہرگز بھی نجمہ کی بات پر یقین نہ کرتیں' جنت کی بڑی بڑی آنکھوں میں یکبار اتر آنے والی حیرانی اور پھر ماں کا تھپڑ کھانے کے بعد خجالت کے احساس سے تپا ہوا چہرہ! وہ اندر سے لرز کر رہ گئی تھیں۔

ساتھ ہی ان کو نجمہ پر بھی بہت غصہ تھا۔ مارے ناراضی کے انہوں نے پھر اس وقت تو نجمہ کو منہ ہی نہیں لگایا۔ وضو کر کے تراویح کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ ناچار وہ بکتی جھکتی خود ہی اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

اگلی دوپہر...انہوں نے نجمہ کو اس کے گھر سے بلوا لیا اور سامنے بٹھا کر خوب جھاڑ پلائی۔ اچھی طرح ڈانٹ کھانے کے باوجود اس کا موڈ خوشگوار ہی رہا۔ کل والے واقعے پر وہ خود ہی اپنے آپ کو ''جھلی'' کہہ کہہ کر چھیڑ رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔

عید کارڈ اسے واپس دیتے ہوئے اچانک ہی ماں جی کی نگاہ کارڈ کی پشت پر جم کر رہ گئی۔ اس شعر پر انہوں نے توجہ ہی نہ دی تھی' لکھا تھا۔

چھوٹی سی چڑیا ......گاتی ہے گانا
عید کی نماز پڑھ کر ہمارے گھر ضرور آنا

ماں جی کے نرم دل کو دھکا سا لگا۔ ان کی آنکھیں گیلی سی ہو گئیں۔

''ہائے! گڑیاں اور چڑیاں...... ایک جیسی تو ہوتی ہیں؟ کیسی معصوم سی' بے ضرر سی تمنا کا اظہار کیا تھا سہیلی نے سہیلی سے......''

انہیں ایک بار پھر نجمہ کی حماقت اور اپنی نااہلی پر غصہ آنے لگا گو کہ یہ وقت انہوں نے اپنے لیے قرآن ترجمے سے پڑھنے کے لیے وقف کر رکھا تھا مگر اسے موقوف کر کے انہوں نے آج ان لمحوں میں نجمہ کو سمجھانا ضروری سمجھا۔

''نجمہ! کل تجھے جنت کو مار کے سکھ مل گیا؟''

''سکھ کیوں...... دکھ ہو گیا۔ پر اگے لئی چنگا ہویا جی!''

''یہ تیرا خیال ہی خیال ہے۔'' ماں جی نے لہجہ نرم کر کے سمجھایا۔ ''بھلی مانس! اولاد پر سختی اسے سدھارتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہے۔ بچے اس طرح اور بھی زیادہ باغی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب تیرا میرا زمانہ نہیں رہ گیا۔ اب بہت کچھ بدل گیا ہے' ویسے بھی اگر بغور لوگوں کا جائزہ لیا جائے تو زندگی میں وہی لوگ زیادہ کامیاب اور بااعتماد دکھائی دیتے ہیں جن کو ان کے گھروں سے بچپن میں پیار اور دُلار کا ماحول ملا ہو' وہ آگے بھی خلوص و پیار ہی بانٹتے ہیں۔ تجھے پتا ہے پیار تو جانور کو بھی رام کر لیتا ہے۔ انسانی بچے تو پھر بھی انسان کی ہی اولاد ہوتے ہیں۔''

www.paksociety.com





''میں......کلّی (تنہا) کیا کراں جی......'' نجمہ نے حسب معمول اپنا پرانا دُکھڑا سنانا چاہا مگر ماں جی نے اس کی بات کاٹ دی اور اپنی بات میں وزن پیدا کر کے کہنے لگیں۔

''تو چھوڑ اپنی راگنی! اس جہان میں ہر کوئی تو سکھ سے نہیں ہے نا۔ کسی کا کوئی دکھڑا...... کسی کا کوئی' ہر کسی کی زندگی کو کوئی نہ کوئی روگ ضرور لگا ہوتا ہے پھر تو بندہ اور کچھ کرے ہی نا......... بس اپنے دکھوں پر بیٹھا روتا' بین کرتا رہے...... یہ سب بزدلی کی نشانی ہے نجمہ! تمہیں تو اپنی بیٹی کی عقل سے ہی سبق سیکھنا چاہیے' جس نے انٹر تک پڑھا ہوا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو گھر میں بیٹھ کر زنگ لگانے کے بجائے پڑھانے جانے لگی۔ بے شک وہ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ اسکول ہے مگر ہے تو تعلیمی ادارہ نا...؟ کچھ نہ کچھ تو صلہ پائے گی ہی۔ اس کی معلومات اور تجربے میں اضافہ ہوگا۔ انٹر ہے تو کیا ہوا۔'' جنت کی مسلسل تعریف نے اس کا بھی حوصلہ بڑھایا' خوش ہو کر بولی۔

''باراں نئیں جی' ہن تے جنت نے چودھویں دے فارم پُر کر دتے۔'' اس نے لفظ فارم کو بھی دو ٹکڑے کر کے ادا کیا۔

''لو...... یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔'' ماں جی نے سچ مچ بہت خوش ہو کر جواب دیا۔ ''ایسی لائق فائق بیٹی کی تو قدر کرنی چاہیے تجھے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم دونوں جنوں نے تو اولاد کا بیڑا غرق کرنے میں کسر ہی کوئی نہیں چھوڑی۔ ہر وقت آپس میں ہی لڑتے جھگڑتے رہتے ہو۔ یہ خبر نہیں کہ بچوں پر کیا اثرات ہوں گے۔ کل جو تم تقریر کر رہی تھیں کہ ہر گلی کے ہر موڑ پر آج کل آوارہ بے ہودہ مُنڈے کھڑے لڑکیوں کو تکتے' فقرے کستے رہتے ہیں تو بھئی' ایسی باتوں کا دور تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ بس جس جس کے گھر کا ماحول پاکیزہ ہے گھریلو رہن سہن اور آپس کے

## زندگی کیا ہے؟

☆ زندگی بند کلی ہے، جسے کھلنے اور مرجھانے میں دیر نہیں لگتی۔

☆ زندگی کتاب ہے، جس کے ورق پلٹنے اور بند ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

☆ زندگی شمع ہے، جو جلتے جلتے آخر کار بجھ جاتی ہے۔

☆ زندگی قلم ہے جس کی سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔

☆ زندگی چاند ہے، جو موت کی آغوش میں چھپتی ہے۔

زندگی سایہ ہے، موت کا۔

☆ زندگی امانت ہے، خدا کی۔

☆ زندگی پانی ہے، جسے ہوا کی طرح موت اڑاتی ہے۔

☆ زندگی سمندر ہے جس کی گہرائی موت ہے۔

☆ زندگی نیند کے بعد ہونے والی بیداری ہے۔

☆ زندگی کھانا ہے، موت کے پیٹ میں ہضم ہونے والا۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی
گاؤں بدرمرجان

تعلقات خوشگوار اور پُرسکون ہیں' وہ اِدھر اُدھر نکڑوں پر گھنٹوں کھڑے رہ رہ کر اپنا وقت کبھی برباد نہیں کر سکتے اور نہ ہی پرسکون اور ستھرے ماحول کی لڑکیاں' کھڑکیوں' دروازوں اور چوباروں سے تاک جھانک کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ بلکہ سمجھ دار مائیں تو انہیں ان کے خوش آیند مستقبل کے لیے شروع سے ہی گھر گرہستی کے دھندوں میں مصروف کر دیتی ہیں۔ ایسی ہی باتیں گھر کے ٹھنڈے اور پُرسکون ماحول کی ضامن ہوتی ہیں۔ یاد رکھو! اچھی بیٹی ہی ہمیشہ اچھی بیوی اور اچھی بیوی ہی ذمے دار ماں ہوا کرتی ہے۔"

مسلسل بولتے بولتے ماں جی ذرا تھمیں پھر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ستمبر 05ء کا پاکیزہ نکالا اور مجھے کچھ کہنا ہے کا صفحہ نکال کر اس کے سامنے کیا اور بڑے دل سوز لہجے میں دوبارہ گویا ہوئیں۔

"کاش نجمہ......! تو ذرا بھی پڑھی لکھی ہوتی تو کم از کم ایسی عقل والی باتیں پڑھ کر کچھ تو تیرے پلے بھی پڑتا۔ دھیان سے سُن یہ کیا سونے جیسی بات لکھی ہے۔" ہم اپنے بچوں کو گھر میں قید رکھ سکتے ہیں نہ باہر رکھوالی کر سکتے ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا تو بے وقوفی ہوگی۔ اس لیے اپنے بچوں کے دوست بنیں۔ خصوصاً بیٹیوں کی سہیلی بنیے۔ ایسی سہیلی جو اُن کی سچی خیر خواہ ہو۔ محبت سے' پیار سے' لاڈ سے اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں ان کے مسائل شیئر کیجیے...... "کیا سمجھی؟" انہوں نے عینک کے پیچھے سے ہونق بنی نجمہ کو گھورا۔

"تو جنت کی سہیلی بن جا۔ اس کے دکھ سکھ سن' اپنا سنا...... دوستی کر لے اپنی دھی رانی سے نجمہ! پھر دیکھ تیرے سارے اندیشے' سارے خوف اور ساری فکریں کس طرح سے اُڑن چھو ہوتی ہیں۔ کبھی اس کے قریب تو ہو جھلیے۔ تو' تو نصیبوں والی ہے۔ اوپر والے نے تیرے گھر میں ہی تیرے لیے ایک سہیلی کا انتظام کر دیا ہے' میری طرف دیکھ' اس رحمت کے لیے تڑپتی رہی اور یہ سب بھائی ایک بہن کے لیے کبھی میری اس محرومی پر غور کرنے کی فرصت ملی ہے تجھے؟ اپنے دکھڑے تو ہر آئے گئے کو سناتی رہتی ہے۔ کبھی ماں جی کا سُونا آنگن دیکھ کر پوچھا' ماں جی تیرا کیا حال ہے؟ شاوا بھئی نجمہ شاوا!"

نجمہ کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے فوراً اعتراف کیا۔ "آہو جی! اے تو تسی ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"تو پھر...... مجھے کبھی گلہ کرتے سنا؟" انہوں نے پہلے سوال کیا پھر خود ہی جواب بھی دیا۔ "اب بھی ناشکری نہیں کرتی بس تجھے سمجھانے کے لیے اپنی مثال دی ہے۔ شکر ہے اس نے گبرو جوان بیٹے عطا کیے ہیں۔ جو باشعور بھی ہیں اور فرمانبردار بھی اگر خدانخواستہ کچھ بھی نہ دیتا تو کیا کر لیتے ہم! اصل میں رب کی مصلحت میں ہی بندے کی بھلائی چھپی ہوتی ہے۔"

ماں جی بہت دیر تک دوسروں کی مثالیں دے دے کر نجمہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی رہیں۔ وہ بھی نہایت معقولیت اور سمجھ لینے والے انداز میں گردن ہلاتی رہی۔

ایک بے بنیاد اور لغو خیال کو سچ سمجھ کر جو گزری کل ان دونوں نے مل کر جنت کے معصوم دل و دماغ پر ستم ڈھایا تھا اس کا اندر سے ملال دونوں کو ہی تھا۔ ماں جی کی نگاہوں میں تو جنت کی بھولی بھالی صورت اور سادہ انداز کُھب کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ کل سے پہلے بھی یقیناً وہ کبھی نہ کبھی ان کے گھر آئی گئی ہوگی مگر ماں جی نے اسے بغور دیکھا ہی نہ تھا۔ ماں کی بدگمانی پر اس کی حیرت اور جاتے جاتے اِک شکایتی نظر۔ انہیں کل سے بیسیوں دفعہ تڑپا چکی تھی۔ یہی سبب تھا کہ آج وہ نجمہ کو پکڑے بیٹھی تھیں۔ حتیٰ کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔

نجمہ ان کے پاس سے اٹھی تو اور کچھ اس کے دماغ میں سمایا نہ سمایا ہو مگر یہ نکتہ اس کی عقل شریف میں نقش ہو چکا تھا کہ "اپنی دھی کو سہیلی بنانا اے۔ سہیلی نوں تھپڑ نہیں مار ی دا۔ بلکہ پیار کری دا۔"

☆☆☆

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ بخیر و خوبی رحمتوں کی نوید دیتا گزرتا چلا گیا۔ نصیبوں والوں نے بہت کچھ پالیا۔ عاقبت سنوار لی' کم نصیب پڑے سوتے رہے۔ ایک دن سویرے ہی نجمہ' ماں جی کے پاس گھبرائی ہوئی آئی اور آتے ہی روتی آواز میں اطلاع دی۔

"ہائے ربا! چنگا نہیں کیتا توں۔ میری دھی دی تاں صورت ہی اتر گئی۔"

"کیوں...... اب کیا ہوگیا؟" ماں جی نے پریشانی کے لہجے میں دریافت کیا۔

نجمہ نے روہانسی ہو کر جواب دیا "او...... جیڑا جنت نے چودھویں کلاس دا کاغذ پُر کیتا سی' واپس آ گیا۔ کڑی دا داخلہ رک گیا۔"

"اوہ خدایا......!" ماں جی بھی دکھ سے ساکت رہ گئیں۔ دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔

ماں جی کے سمجھانے بجھانے کے بعد سے کئی دنوں کے بعد آج پھر نجمہ نے اپنے میاں کی شان میں کلماتِ بد کا آغاز کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک جلی کٹی کرنے کے بعد وہ اٹھ کر غزالہ کے پاس کچن میں جا پہنچی۔ ماں جی اپنے ہی کسی خیال میں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ پھر انہوں نے کاغذ قلم اٹھا کر کوئی حساب کتاب کیا۔ اس جوڑ توڑ میں کافی وقت گزر گیا۔

کچن سے نکل کر وہ دونوں ٹی وی والے کمرے میں جا بیٹھیں اور اسٹار پلس پر اپنا کوئی پسندیدہ ڈراما نہایت ذوق شوق سے دیکھنے لگیں۔ یہ ان دونوں کا مشترکہ شوق تھا۔ شہر آنے کے بعد ان ڈراموں کے سحر نے نجمہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔





گو کہ اماں جی کیبل کے سخت خلاف تھیں مگر اپنے شوہر عبدالباری صاحب سے مجبور تھیں۔ یوں تو ان کا زیادہ وقت زمینوں کی دیکھ بھال میں گاؤں میں ہی گزرتا تھا مگر جب بھی گھر میں ہوتے' لمحے بھر کے لیے بھی حالاتِ حاضرہ اور بین الاقوامی سیاست سے جدا ہونا' یا غافل رہنا انہیں گوارا نہ تھا۔

دو لڑکے عبدالسمیع اور عبدالرافع کراچی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ بھی تقریباً باپ کے ہی ہم ذوق تھے۔ کرکٹ کا عشق اس کے علاوہ تھا۔ ان دونوں سے بڑا عبدالباسط' پاک آرمی میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا۔

اب ہوتا یہ تھا کہ جب یہ مرد حضرات غیر حاضر ہوتے تو غزالہ اور نجمہ نہایت پابندی کے ساتھ اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھیں۔ اس ذہنی عیاشی کی وہ لوگ اس درجہ عادی ہو چکی تھیں کہ اگر کبھی لائٹ چلی جاتی تو کوفت اور ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتیں۔ کچھ نہ بن پاتا تو اٹھتے بیٹھتے دیکھے ہوئے ڈراموں پر بے لاگ تبصرے چلتے رہتے۔ ماں جی ان دونوں کی یہ سرگرمیاں کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دیکھتی سنتی رہتیں۔ کم کم ہی سرزنش کرتیں۔ غزالہ ان کے لیے بہت کارآمد اور ہرفن مولا ٹائپ ملازمہ کم' گھر کی فرد زیادہ تھی اور ظاہر ہے' اس کی دلچسپی انہیں عزیز تھی۔ غزالہ سے ایک بہت بڑا فائدہ انہیں یہ بھی حاصل تھا کہ جیسے ہی اس خاموش بنگلے کی سنسان فضاؤں میں افرادِ خانہ کا اضافہ ہوتا یا عید تہوار یا کسی تقریب پر کام میں اضافہ ہوتا' وہ بغیر کچھ کہے فوراً اپنی کسی چاچی، مامی یا خالہ کی خدمات حاصل کر لیا کرتی تھی۔

ماں جی ماشاء اللہ بذاتِ خود صاحب نصاب تھیں۔ ان کے اپنے ذاتی اثاثوں کے علاوہ شوہر کی جانب سے بھی قدرت نے انہیں اپنی ہر نعمت سے



www.paksociety.com

نوازا ہوا تھا اور ان نعمتوں میں سے وہ مستحقین کا حصہ ادا کرنا کبھی نہ بھولتی تھیں۔ رمضان المبارک کے علاوہ بھی سارا سال ان کا ہاتھ کھلا ہی رہتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ نجمہ کے لیے کبھی انہوں نے اس طور سے نہیں سوچا تھا حالانکہ اب تو ان کے تعلقات خاصے پرانے ہو چکے تھے یا پھر اس غفلت کا سبب اس مکان میں نجمہ سے پہلے رہنے والے اس کے بھائی تھے جو خاصے آسودہ حال تھے۔

جنت ان کے دل کو بہت بھا گئی تھی۔ چنانچہ جونہی نجمہ نے اس کے بی اے کا فارم واپس آ جانے کی وجہ مکمل فیس کی عدم ادائیگی کا ذکر کیا' ماں جی کے حساس دل کو یکلخت ہی ان لوگوں کی مدد کا خیال آ گیا۔ جوں جوں وہ اس پہلو پر غور کرتی گئیں' ان کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ انہیں یاد آیا جنت کے علاوہ نجمہ کے دو چھوٹے بیٹے بھی تھے' جو کسی گورنمنٹ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے چونکہ عید سر پر تھی تو اس بہترین موقع کے لیے اماں جی نے حسبِ توفیق بہت کچھ اس سفید پوش گھرانے کے لیے سوچ ڈالا اور انہی لمحوں میں عمل بھی کر ڈالا۔

جیسے ہی ڈراموں سے فراغت پا کر نجمہ زور زور سے باتیں کرتی ہوئی اندر سے برآمد ہوئی' انہوں نے اشارے سے بلایا اور چپ چاپ ایک بھاری لفافہ اس کے سپرد کر دیا۔ ڈراموں کی دلچسپی میں کھو کر نجمہ تھوڑی دیر کو گھر کے مسائل فراموش ضرور کر بیٹھی تھی لیکن ظاہر ہے وہ جوں کے توں موجود تو تھے ہی۔ وہ سادہ دل عورت لمحے بھر کو حیران رہ کر فوراً ہی خوش ہو گئی اور کسی بھی باریکی یا گہرائی کو سمجھے بغیر خوش خوش گھر چل دی۔

اس کے چلے جانے کے بعد ماں جی کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ روحانی طور پر وہ ایسی ہلکی پھلکی اور سرشار ہوئیں کہ تکیے پر سر رکھتے ہی تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو گئیں اور ایسی میٹھی ...... اور پُرسکون نیند سوئیں کہ جاگنے کے بعد خود ہی حیران رہ گئیں۔ افطار اور نماز مغرب کے بعد انہوں نے مختصر سا وظیفہ پڑھا۔ غزالہ نے انہیں دودھ پتی کا گرم گرم پیالہ لا کر پیش کیا' جس میں سے چھوٹی الائچی کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ جسے وہ چسکیاں لے لے کر پینے لگیں۔ اب کچھ دیر کے لیے وہ فارغ تھیں۔

تب آہستگی سے جنت اندر داخل ہوئی اور انہیں ادب سے سلام کر کے سامنے بیٹھ گئی۔ آج بھی اس کا وہی انداز تھا۔ جارجٹ کی بڑی سیاہ چادر میں لپٹی' جس میں سے اس کا چمپئی رنگت والا صبیح چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ماں جی نے سلام کا جواب دے کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا...... جان گئی تھیں کہ وہ شکریہ ادا کرنے آئی ہے لیکن...... انہونی ہو گئی۔

پچھلی دفعہ جب وہ ان کے سامنے بیٹھی تھی تو ماں جی کے لہجے میں خود بخود ہی چٹانوں کی سی سختی آ گئی تھی۔ مگر آج صورتِ حال بدل گئی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی الفاظ پتھر بن گئے۔

''آنٹی جی! آپ نے کیا سوچ کر...... یہ اتنے سارے پیسے ہمارے گھر بھیج دیے؟'' اس نے چادر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر لفافہ واپس کیا۔ ''معاف کیجیے گا' آپ کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ ہم پر زکوٰۃ' خیرات یا فطرہ...... لینا نہیں بلکہ دینا واجب ہے کیونکہ ہمارے ہاتھ پیر' عقل' شعور اور صحت سب سلامت ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔''

ماں جی دم بخود تھیں۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

''دلعل! ایسی تو کوئی بات نہیں' قرضِ حسنہ سمجھ کر رکھ لو۔'' بالآخر دھڑکتے دل سے تاویل پیش کرنی پڑی۔ ''میری نیت تو خراب نہ تھی لعل! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ بار بار اپنی صفائی میں کہہ رہی تھیں۔

انہیں خواب میں بھی گمان نہیں گزرا تھا کہ کبھی ان کو ایک نئی نسل کی ننھی سی لڑکی کے سامنے جواب دہ





پڑے گا۔ جنت بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اب انہیں تفصیل سے سمجھا رہی تھی۔

''میرا بی اے کا فارم فیس میں کمی کی وجہ سے نہیں آیا آنٹی! بلکہ...... ڈومیسائل کا کچھ مسئلہ ہو گیا ہے ورنہ...... اللہ کا شکر ہے' میرے پاس تو ٹیوشنز ہی اتنی ہیں کہ تینوں بہن بھائیوں کی فیسیں آرام سے ادا ہو جاتی ہیں۔''

معاً ماں جی کو دوسری سوجھی' خوشامد کا سا انداز اپنایا۔ ''دلعل! بھائیوں کے لیے رکھ لو۔ عید کا موقع ہے' جوڑے کپڑے بن جائیں گے۔'' سادگی' سادگی میں گویا جلتی پر تیل گر گیا۔ تاہم جنت نے بڑے تحمل سے کام لیا۔ آج شاید اس کی تعلیم اور شعور کی آزمائش تھی۔ ہزار نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گزری۔

''میری پیاری آنٹی جی! اپنی سوچ کا انداز بدل لیجیے۔ ہر کسی کے لیے ایک ہی پیمانہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس باری تعالیٰ کا لاکھ احسان ہے کہ عید' بقر عید پر یا عام طور پر بھی ہمیں کبھی اس ذات پاک نے ننگا' بھوکا نہیں رہنے دیا۔ یوں بھی ہم ہر طرح کی مصنوعات' وہ پہننے اوڑھنے کی ہوں یا کھانے پینے کی' سب کچھ پاکستانی استعمال کرتے ہیں اور پاکستانی کپڑا تو بہت سستا اور اچھا ہے' خرید کر دیکھ لیجیے۔''

ماں جی چپ کی چپ رہ گئیں۔

کافی دیر کے بعد وہ سلام کر کے واپس جاتے جاتے لوٹ آئی۔ ماں جی اب تک گم صم بیٹھی اسے تکے جا رہی تھیں۔ اچانک ہی جنت نے بڑھ کر لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دلار سے پوچھا۔ ''میری باتوں کا آپ نے برا تو نہیں مانا آنٹی جی!''

ماں جی باغ باغ ہو گئیں۔ اسے اور بھی لپٹا کر جواب دیا۔ ''جیتی رہو' خوش رہو لعل! تمہاری سچی باتیں مجھے اچھی لگیں۔ نصیبوں والی ہے تمہاری ماں' جس نے ایسی نیک خو بیٹی پائی۔''

وہ اس کا ملائم سا ہاتھ تھامے تھامے باہر تک آئیں اور پیشانی پر بوسہ دے کر رخصت کیا۔

☆☆☆

نی میں پکیاں رومالی سینویاں
توں کوٹھے کوٹھے آوے گا
چم چی نال کھاوے گا

نجمہ باقاعدہ لے میں گاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی اور حقیقت میں بھی اس نے اسٹیل کا ایک بڑا ڈونگا پکڑ رکھا تھا جس کے اوپر کروشیے سے بنا ہوا خوب صورت سا سفید رومال ڈھکا ہوا تھا۔

''ہُرا...... ماسی مصیبت...... او سوری' میرا مطلب ہے آنٹی نجمہ آ گئیں۔''

اسے دیکھتے ہی رافع نے زوردار نعرہ لگایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی ''سلام آنٹی'' کہتا ہوا بھاپ اڑاتے ڈونگے پر قبضہ کر لیا۔

قریب سے ہی ایک اور آواز ابھری۔ ''سلام آنٹی'' یہ سمیع تھا۔ اب جو میٹھے سروں میں گاتی نجمہ نے آنکھیں کھول کر جائزہ لیا تو برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے سب مسکرا رہے تھے۔ ماں جی کا صحنِ گلشن مردانہ آوازوں سے آباد ہو چکا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر افطاری کی تیار کر رہی تھیں۔ نجمہ نے باری صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے جواباً خیر خیریت معلوم کی۔

''آنٹی' آپ سویاں ''رومال'' میں رکھ کر پکاتی ہیں؟'' رافع نے بڑی بھولی صورت بنا کر پوچھا۔ وہ ابھی اس کا گانا سن چکا تھا۔

''لاحول ولاقوۃ!'' سمیع کو ابکائی آ گئی۔

''پتر جی' یہ مشینی سنویاں نہیں۔ میں ہتھیاں نال بنائی ایں۔'' وہ فخریہ انداز میں سوتیوں کا تاریخ جغرافیہ بتانے بیٹھ گئی۔

''آنٹی' وہ آپ کی ''چم چی'' تو ہے نہیں۔ میں



www.paksociety.com

کھاؤں کیسے؟'' سمیع ہنس رہا تھا مگر رافع کے چونچلے جاری تھے۔

''لو جی آ گئی ''چم چی!'' وہ دوڑ کر کچن سے چمچ اٹھا لائی۔

''عبدالرافع!'' ماں جی نے اسے آنکھوں آنکھوں میں تنبیہ کی۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو مکمل نام سے پکارتی تھیں۔

''اور جی...... اپنا کیپٹن پتر نہیں آیا؟'' نجمہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔

''شام کو آ رہا ہے عبدالباسط انشاء اللہ!'' باری صاحب نے جواب دیا۔

''اچھا جی!'' نجمہ کو اطمینان ہوا۔ وہ اس پورے گھرانے سے بہت مانوس تھی۔ رافع نے اس کے ہاتھ میں خالی ڈونگا تھمایا تو اسے خیال آیا۔

''ہا...... ہائے' چھوٹے پتر! تسیں روزہ توڑ دتا!''

باری صاحب کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

''اوہ...... آنٹی' ہاسٹل میں کسی نے جگایا نہیں سحری میں۔''

''تاں...... اٹھ پیرا رکھ لیتے۔'' وہ ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ ''میری جنت تاں ہر ہفتے اٹھ پیرا روزہ رکھدی اے۔''

''جنت! مسماۃ جنت!'' رافع اور سمیع دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ ''امی' یہ وہی مسماۃ جنت ہیں نا' جن کا ذکر آپ ابو سے رات کو خوش ہو ہو کر رہی تھیں؟'' رافع نے ماں کی بالکل بغل میں گھس کر سرگوشی کی۔

''چپ...... بے ہودہ کہیں کا۔'' انہوں نے بھی سرگوشی میں گھُرکا۔

انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ رات سحری سے قبل جب عبدالباری صاحب تہجد کے نوافل ادا کر کے بیٹھے تھے' تب انہوں نے کچھ باتیں کی تھیں میاں سے مگر اس شیطان کے چیلے نے کیسے سن لی تھیں؟ اور شیطان کا چیلا بڑے پُراسرار انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے مائی ڈیر مما کہ ان مسماۃ جنت کو آپ نے دراصل تجویز کس کے لیے کیا ہے' آخر؟''

جیسے ہی عبدالباری صاحب اِدھر اُدھر ہوئے' رافع یہی سوال لے بیٹھا۔ کیپٹن باسط کے آنے سے پہلے پہلے وہ پھر ماں کو کریدنے بیٹھ گیا تھا۔

سمیع کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ وہ اخبار لپیٹ کر بولا۔ ''تم 'تجویز' تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے وہ لڑکی نہیں' دوا کی شیشی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔'' وہ خود بھی ہنس پڑا۔ ''بلکہ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ قرعہ اندازی میں نکلنے والا پلاٹ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اب نام کس خوش نصیب کے ہوتا ہے۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے باپ کو دیکھ کر اضافہ کیا۔

''ہم تینوں...... نہیں شاید چاروں میں سے......''

ماں جی نے جوتی کھینچ کر اسے ماری مگر وہ باہر بھاگ چکا تھا۔

رات افطار سے پہلے' پہلے عبدالباسط بھی آ پہنچا تھا۔ چاروں باپ بیٹوں نے ایک دوسرے سے گلے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے بلند و بانگ قہقہوں سے یہاں کی خاموشیاں دم دبا کر بھاگ گئی تھیں' ہر گوشے کی رونق لوٹ آئی تھی۔

تراویح کے بعد باری صاحب خبرنامے کی دنیا میں کھو گئے اور تینوں ماں کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ رافع کو پہلے ہی کھد بد ہو رہی تھی۔ باسط سے پوچھنے لگا۔

''بھائی جان! آپ مسماۃ جنت سے ملے ہیں کبھی؟'' آنکھوں سے شرارت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

باسط حیران ہو کر اس کی صورت تکنے لگا۔ ماں جی نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''الٰہی توبہ! یہ لڑکا تو میری جان کو آ گیا ہے۔ میں ایک بات زبان سے نکال کر چور بن گئی۔ واہ بیٹا' عبدالرافع!''

پھر انہوں نے رافع کے بتنگڑ بنا ڈالنے کے ڈر سے خود ہی باسط سے جلدی جلدی جنت کا مختصر تعارف اور اپنا ارادہ بتا ڈالا۔ وہ تو مسکرا کر خاموش ہو گیا مگر وہ رافع ہی کیا جو نچلا بیٹھ جاتا۔ ماں کی گود میں لاڈ سے لیٹ کر بولا۔

''امی جان! یہ وہی جنت ہے ناں جو نجمہ آنٹی کے پیچھے پیچھے رال بہاتی اور شڑ شڑ ناک پونچھتی آیا کرتی تھی۔ گنجی تھی وہ اس وقت۔''

''اچھا......!'' ماں جی برا مان گئیں۔ ''یہ کون سی جنت دیکھ لی تو نے؟ وہ تو اچھی بھلی میٹرک کیے ہوئے آئی تھی' اس گھر میں۔ بڑی ہی سوہنی' سجیلی بچی ہے۔ تو نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ ہمارے گھر تو وہ بس کبھی کبھار ہی آئی ہے۔ وہ بھی جب تم لوگ نہیں ہوتے ہو' بڑی سمجھ دار ہے۔'' ماں جی کی تعریف پر تینوں ہی مسکرا اٹھے۔

''یہ قرعۂ فال کس کے نام نکلے گا امی جان!'' رافع نے بے صبری دکھاتے ہوئے پوچھ ڈالا۔ پوچھا تو اس نے بھی مذاق، مذاق میں تھا لیکن ماں جی سچ مچ سوچ میں پڑ گئیں۔ بیٹے تو تینوں ہی ماشاء اللہ لائق فائق اور قابل تھے۔ عبدالسمیع اور عبدالرافع میں تو فقط گیارہ ماہ کی ہی بڑائی چھوٹائی تھی۔ البتہ عبدالباسط دونوں سے تین ساڑھے تین برس بڑا تھا۔ ابھی وہ چپ ہی تھیں کہ رافع پھر بول پڑا۔

''ہاں ہاں' مجھے معلوم ہے قرعۂ فال آپ ضرور بھائی جان کے نام نکالیں گی۔ آپ کے زیادہ لاڈلے ہیں نا یہ لیکن میں بھی بتائے دے رہا ہوں۔'' اچانک رک کر اس نے سب کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے ماں سے پوچھا۔


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینکنگ فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551


www.paksociety.com

"امی جان! مسماۃ جنت کی کوئی چھوٹی ہمشیرہ ہیں؟"
"نہیں لعل!" ماں جی نے ہنستے ہنستے اس کی پیٹھ پر ایک دھموکا رسید کیا۔
"شکر ہے رب کا۔" اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔
"یقیناً یہ جنت تو وہ "جہنم" ہی ہوتی۔ میرا مستقبل محفوظ ہوگیا۔"

☆☆☆

"نجمہ آنٹی...... نجمہ آنٹی!" رافع نے دانستہ برآمدے میں کھڑے ہوکر زور زور سے آوازیں لگائیں۔ باورچی خانے میں غزالہ سے باتیں مٹھارتی نجمہ ہڑبڑا کر باہر نکل آئی۔
"کی ہویا چھوٹے پتر! خیر ہے؟" اس نے گھبرا کر دریافت کیا۔
"آنٹی! وہ "شطار پھس" پر آپ کی پسند والا ڈراما آرہا ہے۔" رافع نے مزید زور سے ہانک لگائی۔ اسے معلوم تھا نجمہ ہمیشہ ہی "اسٹار پلس" کو شطار پھس ہی کہتی تھی۔
"شش......!" نجمہ نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرایا پھر قریب آکر دھیرے سے بولی۔ "آپ کو پتا نہیں جاگنی رات ہے آج "شطار پھس" دیکھ کر پھنسنا ہے۔ ماں جی چھترول کردیں گی۔"
"اچھا ......اچھا!" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ "وہ آپ کے بچے وغیرہ تو دیکھتے ہوں گے۔ بچوں کو امی کچھ نہیں کہتیں۔ انہیں تو بلالیں آپ؟" وہ بڑی مکاری سے بولا۔
بند کمرے کے دروازے میں کھڑے سمیع اور باسط سانسیں روکے ہنسی ضبط کیے ساکت کھڑے تھے۔
"ہائے نئیں پتر! میرے بچے بس پاکستان دیکھتے ہیں ہور کچھ نئیں۔"

سمیع نے رافع کو پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا اور اب قہقہوں کی بارش میں دونوں مل کر اس کی "دُھنیا" لگا رہے تھے۔

☆☆☆

رات تراویح پڑھ کر تینوں بھائی تھوڑی دیر کے لیے گھر آئے اور پھر مسجد چلے گئے۔
برکتوں والی رات تھی۔ اس متبرک اور مقدس رات کو کس کا جی چاہتا ہے کہ عبادت کے بغیر گزارے؟ بازاروں، گلی کوچوں، گھروں، ہر جگہ، ہر مقام پر ہر مسلمان کو شب قدر کی اہمیت کا احساس تھا۔ مساجد سے نعتوں اور شبینہ کی روح پرور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
گھر واپس آکر سب نے ایک ساتھ سحری کی۔
آج ماں جی اندر ہی اندر اک الجھن کا شکار ہورہی تھیں۔ دوپہر میں جب ذرا فرصت ہوئی تو انہوں نے میاں سے دل کا حال کہہ کر رائے مانگی۔ آج وہ کسی نہ کسی آخری فیصلے پر پہنچ جانے کی تمنائی تھیں۔
"یار، تم تو بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔" باری صاحب مسکرائے۔ "ظاہر ہے لڑکی ایک اور تمہارے بیٹے تین ہیں۔ تینوں کا عقد تو کرنے سے رہیں۔"
"افوہ......" وہ جھلا گئیں۔
"یہی تو میرا مطلب ہے کہ ماشاء اللہ تینوں شادی کے لائق ہیں لیکن میں نجمہ اور یونس سے جنت کس کے لیے مانگوں؟"
"لاحول ولاقوۃ۔" باری صاحب بھی جھلا گئے۔
"ارے بھئی کسی ایک کے لیے ہی تو مانگو گی، باقی دو کے لیے پھر بھی۔"
"مگر......" ماں جی ہچکچائیں۔ "لڑکی بہت اچھی ہے، باقی دو کا دل میلا ہوگا۔"
باری صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔
"کیوں! کیا ہوگیا؟" ماں جی نے گھبرا کر پوچھا۔

www.paksociety.com

"تمہاری عقل پر ماتم کررہا ہوں۔" وہ غصیلی آواز سے بولے۔ "ارے بھلی مانس! اگر پانچ سات بیٹے ہوتے تو کیا کرتیں؟"

ماں جی نے ان کی بات سنی ان سنی کردی۔ "میرے خیال میں ...... ایسا کرتے ہیں کہ......" وہ خود ہی خود سوچ کر اپنی تجویز بتانے لگیں۔

باری صاحب آنکھیں پھاڑے اپنی بیگم کو گھور رہے تھے، جن کی عقلمندی اور دانش مندی کے چرچے خاندان بھر میں تھے۔ وہ اور کچھ سمجھے نہ سمجھے مگر یہ ضرور سمجھ گئے کہ "وہ سچ مچ ہی ساس کے حواس پر چھا جانے والی بہو ثابت ہوگی۔"

☆☆☆

آج انتیسواں روزہ تھا یعنی چاندرات۔

"اچھا! تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ مسماۃ جنت کو لے کر سامنے برآمدے میں بیٹھی ہوں گی اور ہم سب کھڑکی سے جھانک کر ان کا دیدار کرلیں، یعنی پسند کرلیں۔" رافع نے ماں کا مطلب کھول کر بیان کردیا۔

"ہاں!" ماں جی نے مزید وضاحت کی۔ "پسند کرنے کے بعد تم تینوں میں سے جو بھی ہم دونوں کے پاس سے گزر کر آنگن کی طرف چلا جائے گا، میں اسی کے لیے جنت کو مانگ لوں گی اور اسی وقت لڑکی کے ہاتھ میں چوڑیاں پہنادوں گی۔" وہ سرخ اور سبز چوڑیاں لیے بیٹھی تھیں۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ تم میں سے پہل کون کرتا ہے؟"

"اور اگر جو...... ہم تینوں کے بجائے ابو گزر گئے؟" رافع کی زبان آج بھی بے قابو تھی۔ اس کے دائیں بائیں بیٹھے باسط اور سمیع نے اسے دبوچ لیا۔

پروگرام کے مطابق افطار کے بعد نجمہ اور جنت کو ماں جی کے پاس آنا تھا۔ وہ دونوں تو ماں جی کی سوچوں سے بے خبر تھیں مگر ماں جی کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ ویسے دل میں کہیں دور یہ اطمینان موجود تھا کہ چونکہ ان کے ہونہار بچوں میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس لیے ان کا دستِ سوال انشاء اللہ لوٹایا نہ جائے گا۔ خدا کے بھروسے پر ہی وہ اتنا بڑا اقدم اٹھانے کو تھیں۔ بس ان کا خیال تھا کہ اس تدبیر سے ان کا ضمیر بھی مطمئن رہے گا اور بچوں میں تفرقہ بھی نہیں پڑے گا۔

☆☆☆

بند جالیوں میں سے چاروں باپ بیٹوں نے ماں جی کی پسند کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

باری صاحب کو تو خیر اس مقابلے میں حصہ ہی نہیں لینا تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ عبدالسمیع اور عبدالرافع بھی ماں جی کی ہدایت بھول کر بس جنت کو دیکھنے میں محو ہو کر رہ گئے۔

شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

کیپٹن باسط نے شرارت سے دونوں بھائیوں کی محویت تاڑی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر دھیرے دھیرے جنت اور ماں کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

ماں جی نے اطمینان کی گہری سانس کھینچ کر اپنی نشست چھوڑ دی اور جنت کا نرم وملائم ہاتھ پکڑ کر کیپٹن باسط کے نام کی چوڑیاں پہنادیں۔ باسط بڑا تھا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھیں۔

"بیٹی! خالی ہاتھ کبھی مت رہا کرو اور آج تو چاندرات ہے۔" اتنا کہہ کر انہوں نے بے اختیار جنت کو گلے لگالیا۔

ان کی پشت پر وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کیپٹن باسط کو تک رہی تھی جو پیشانی پر ہاتھ رکھے اسے زوردار سلیوٹ پیش کررہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "سلامِ عید!"

وہ ہکا بکا اسے تکے جارہی تھی جبکہ باہر سے چاند ہوجانے کا شور سنائی دے رہا تھا۔

اندر سے باری صاحب، رافع اور سمیع...... جنت اور جنت کے عقب میں باسط کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔



# رشتوں کی تلاش میں

سدرۃ المنتہیٰ

"ہمارے گھر کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کو بدلنا چاہتے ہیں اور جب نہیں بدل سکتے تو ایک دوسرے پر ذمے داریاں تھوپتے چلے جاتے ہیں۔ چاہے پھر انہیں ڈھنگ سے نہ نباہ سکیں۔ جس طرح بھیا پر زمین کی ذمے داریاں، اماں پر بڑے سے مہمان خانے کی، بھابی پر اماں کی اور مجھ پر کچن کی۔" وہ کتابوں کے سیٹ الگ الگ کرکے رکھتے ہوئے بولے گئی۔ یمی کرسی پر بیٹھی



www.paksociety.com

کتاب سے سر نکالے اسے بڑے مزے سے دیکھتی چیونگم چباتی رہی اور مسکراتی رہی اس کے موڈ کو دیکھ کر۔

''اماں کا بس چلے تو مجھ سمیت پڑوس والوں کو بھی کچن میں کھڑا کردیں اور بھائی کا بس چلے تو دن کو بھی پیر پسارے سوتے ہی رہیں مگر ہائے مجبوری!''

''اور تمہارا بس چلے تو کچن کا چولھا بند کر کے کھانا پینا چھڑوا کر سارے پروگرام کینسل کروا کے سب کے ہاتھ میں درسی، نصابی کتابیں دے دو۔ کوئی ب سے بکری کی تان لگاتا پھرے تو کوئی الف سے آم کی تسبیح جپتا رہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر اسی کی طرح مزے سے اضافہ کرنے لگی۔

''تم کبھی ذہنی طور پر الف سے آم اور ب سے بکری سے آگے مت بڑھنا۔'' وہ اسے اس کے کوڑھ مغز ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے مسکرادی۔ ''اور میں یہاں تمہیں لائی ہوں کتابیں سیٹ کروانے کے لیے نہ کہ یہیں بیٹھی رہو۔''

''تم مجھے کبھی اپنے ذوق میں بڑھنے مت دینا۔'' وہ ناچار کتاب کے صفحے میں نشانی ڈال کر اٹھی اور کتابیں ریک میں سیٹ کرنے لگی۔

''ویسے تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اتنے سارے کام کرپاؤ گی، ایک طرف بچوں کی پڑھائی دوسری طرف یہ نیا کھڑاگ۔ لائبریری، تیسری طرف تمہاری اماں کی سونپی ہوئی کچن کی ذمے داریاں اور ان کے اعتراضات اور چوتھی تمہاری شادی جو آج نہیں تو کل اچانک ہو کر پٹاخا پھوڑے گی۔ کر کیا رہی ہو لڑکی اپنی معصوم جان پر اتنے ستم۔'' اسے اس سے خاص طور پر ہمدردی سی ہو رہی تھی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم پر بہت سی ذمے داریاں آن پڑی ہیں۔ ایسے جیسے مہنگائی کے دور میں ضرورتیں اور خواہشیں بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح ذمے داریاں بھی ٹوٹ پڑتی ہیں اگر سب ان ذمے داریوں سے آنکھ چُراتے جائیں تو کسی ایک دو کو تو کام کرنا ہی پڑتا ہے پھر خواب دیکھنے سے کوئی روک تو نہیں سکتا نا۔'' اس نے پیارے ساری کتابوں کو تکتے ہوئے روانی سے کہا۔

''ہم نہ جانے کیوں کبھی ناممکن کو ممکن کرنے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں، ہارتے بھی ہیں پر جب جیت کا ایک سرا بھی ہاتھ لگتا ہے تو مت پوچھو کیا ملتا ہے، جیسے دنیا بھر کا خزانہ مل جاتا ہو۔'' وہ آج ویسے ہی کچھ زیادہ خوش تھی کہ اس کا سالوں کا خواب پورا ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کے گاؤں میں خاص طور پر عورتوں کے لیے کوئی چھوٹی سی لائبریری ہو، اس کے گاؤں کی عورتوں کو بھی کتابوں سے دلچسپی ہو اور بڑے شوق سے وہ یہاں کتابیں پڑھنے کتابیں لینے آئیں اور اس کی ایک شہری دوست کی مدد سے یہ خواب اس صورت پورا ہوا تھا کہ کوئی سرکاری بُک فاؤنڈیشن ادارہ تھا جس کا کام گاؤں، قصبوں میں چھوٹے سے ویلیج بک کلب قائم کرنا تھا۔ اس نے جیسے ہی اخبار میں تفصیلات دیکھیں فوراً نمبر ملا کر بات کرلی۔ اس کی دوست نے بھی ہیلپ کی اور بات بن گئی۔ ادارے کی طرف سے لائبریری کا بورڈ، ایک عدد شیلف چند کرسیاں اور چند سو کتابیں اس کے ایڈریس پر پہنچ گئیں باقی کا سارا کام اس کا تھا۔ عمارت کا انتظام اور دیگر کتب کی کمی اس نے پوری کرنی تھی۔ عمارت کے طور پر اوطاق سے فاصلے پر اس کے والد نے فارم ہاؤس کے طور پر دو کمرے بنائے تھے یہاں ان کے مہمان ٹھہرتے تھے، وہ اب بیکار تھے اوطاق کی مرمت کے بعد سو اس نے بھیا سے بات کی۔ سب سے بڑا اعتراض اماں کا تھا پھر بھیا کا...... دادی نے کوئی خاص اعتراض نہیں کیا کہ بچی ہے چار دنوں کا شوق ہے۔ شادی کے بعد تو مصروف ہی ہو جائے گی، بھیا کو چچا نے کہا کہ رو دے دو





بچی کا دل رکھ لو اور وہ خوش ہوگئی۔ سامان تمام سیٹ کروا کر اپنی ذاتی کتب بھی الماری سے اٹھا کر لے آئی۔ اب ہوتا یہ تھا کہ صبح بچوں کو نصابی تعلیم دیتی تھی اور شام میں یہ اوطاق لائبریری کا کام دیتا۔ نئی نئی موٹی موٹی کتابوں کو عورتیں بڑے اشتیاق سے دیکھنے آئیں۔ کتاب ہاتھ میں لے کر ان کے چہرے پر مسرت تھی، یہ دیکھ کر وہ نہال ہوگئی کہ کچھ تو ایسی عورتیں ہیں جو دلچسپی رکھتی ہیں۔ تھوڑا بہت جنہیں پڑھنا بھی آتا ہے۔ وہ بڑی توجہ سے ہر ہر کتاب کا تعارف کرواتی رہی، دو تین کتابیں انہیں پکڑا دیں، کچھ خواتین کے پرچے تھمادیے جو عام طور پر بھی ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے پڑھنے کی عادت پڑتی تھی۔ جب تمام عورتیں چلی گئیں تو وہ سیمی کے ساتھ بند پیکٹ کھولنے اور بکھری کتابیں ترتیب دینے کا کام کرنے لگی اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی تھی۔

''ایسا کوئی اپنی شادی میں بھی اتنا خوش نہیں ہوتا ہوگا جتنا تم آج چہک رہی ہو اپنی محبوب کتابوں سے مل کر، اس طرح کوئی اپنے محبوب سے بھی نہ ملتا ہوگا۔'' وہ اس کی چہک دیکھ کر ہنسی تو وہ بھی ہنس دی۔

''تمہیں محبوب اور شادی کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے۔''

''جیسے تمہیں کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ پر مجھے تو وہ کہیں بھی نہیں سوجھ رہا۔ خدا جانے پیدا بھی ہوا ہے کہ نہیں۔'' وہ منہ بسور کر کام ختم کر کے ہاتھ جھاڑنے لگی۔

''پیدا تو ہوا ہوگا، نہ جانے کس کونے میں ہوگا۔ نکل آئے گا کسی دن مینڈک کنویں سے۔'' وہ اسے تسلی دینے لگی۔ شیلف بند کر کے اس کی سرد آہ پر ہنستے ہوئے کمرے کے دروازے کو تالا لگایا چھوٹی سی چار دیواری کے پاس آ کر برقع پہنا۔ جبکہ وہ صرف بڑی سی چادر لیتی تھی سو اس نے چادر اچھی طرح کور کی، اس نے حجاب لگایا اور دونوں ایک ایک کتاب اٹھا کر گھر آ گئیں۔ آج نہ اسے اماں کی جھاڑ بُری لگ رہی تھی نہ بھیا کا رعب بے وجہ کا۔ چچا کے پاس گئی تو چچی کی لن ترانیاں بھی سہہ لیں۔ آپا کے نخرے اور بڑی پھپھو جو اس کی آواز سن کر کمرے سے نکلی تھیں نہ ان کی ڈانٹ اور اپنے مسائل کا رونا برا لگا، سب کچھ فطری اور نارمل لگا۔ شاید دل جب خوش ہوتا ہے تو انسان ساری چیزیں آسانی سے سہہ لیتا ہے یا پھر اگنور کر لیتا ہے۔

☆☆☆

سورج کے غروب کا منظر اسے ہمیشہ ہی راستے میں روک لیتا، لمحے بھر کو دل چاہتا کہ سورج کے اس گولے کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔ سورج نہر میں ڈوب رہا تھا تب ریت کے ٹیلوں کے پار کا منظر کس قدر دلنشین تھا۔ قدموں کے ساتھ دل بھی رک جاتا۔ اور دل چاہنے لگتا نہر میں ڈبکیاں لگا کر ریت کے ٹیلوں میں گم ہوجائے اور یہاں سے جو اس قدر قریب سے سورج کا گولا نظر آتا ہے، اس گولے کو پکڑ لے۔ عجیب خواہش، وہ اپنی اس بے ساختہ خواہش پر خود ہی سر جھٹک کر مسکرادی۔

''السلام علیکم! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں خیریت؟'' وہ پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر رکا تھا۔

''آپ تو مجھے نقاب میں بھی پہچان لیتے ہیں، وعلیکم السلام!'' وہ چونک کر مڑی۔

''پہچان جانے میں عافیت ہے مگر یہ درست وقت تو نہیں یہاں کھڑے ہونے کا۔ اس راستے پر جہاں ہر طرح کے راہ گیر گزرتے ہوں۔ جن میں سے ہر کوئی پہچان کی آنکھ نہیں رکھتا۔'' اس نے کچھ فاصلے پر گزرتے لوگوں کو دیکھ کر ناگواری سے کہا۔

''اس وقت لوگ اپنے کام ختم کر کے فصلوں سے



www.paksociety.com

لوٹ رہے ہوتے ہیں اور نہر میں نہا کر گھر جاتے ہیں، نہر کنارے اس وقت بچوں بڑوں بوڑھوں کی لمبی قطاریں لگتی ہیں۔"

"آپ درست کہتے ہیں، اصل میں کیا ہے کہ بچیاں جلدی گھر چلی گئیں، یمی بھی نہیں آئی آج ورنہ ہم دونوں دوسرے راستے سے آتے ہیں۔ آج اکیلی تھی سو شارٹ کٹ رستہ دیکھا۔" وہ ذرا سا شرمندگی سے کہتے ہوئے اس کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگی۔ دل ہی دل میں اور ڈر محسوس ہوا شکر ہے چچا یا رشتے داروں میں سے اس وقت کوئی یہاں نہیں ملا۔

"کوئی بات نہیں، میں اتنا بھی تنگ نظر نہیں ہوں بس لوگ...... پھر ماحول... یمی کو آج بہت بخار تھا، ورنہ وہ خود آنے کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ اماں نے روک لیا اسے۔" وہ گھر والی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔

"اوہ...... اگر وقت مناسب ہوتا تو میں آپ کے ساتھ چلتی اسے دیکھنے کے لیے کل بھی اسے بخار تھا مگر ہلکا سا لاایک تو یہ لڑکی دوائی بھی نہیں لیتی نا۔" وہ افسوس سے کہتے ہوئے گیٹ تک آ کر رکی۔ "آپ کو میرے ساتھ اندر چلنا چاہیے تاکہ میرے گھر والوں کو پتا چلے میں اکیلی یہاں تک نہیں آئی اور ہاں پلیز یمی کے نہ آنے کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اسے جاتا ہوا دیکھ کر تنبیہہ کرنے لگی تو وہ اسی کے ساتھ اندر آ گیا اس خیال سے کہ آپا سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

"ارے مُراد آیا ہے کیا......؟" وہ بھائی کو کچن کی کھڑکی سے دیکھ کر ہی باہر نکل آئی۔

"مراد میاں کیسے ہو۔" دادی نے اسے پاس بلا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک اماں جی، آپ کیسی ہیں؟" وہ سلام کرتا ہوا چارپائی کے ایک کونے پر ٹک گیا۔ "یہ آج آپ کا پرانا اسٹور کھلا ہے کیا؟" پاس بکھرے پرانے برتنوں کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"ارے میاں، یہ برتن قلعی کرانے کے لیے نکالے ہیں اور یہ پلیٹیں اور لوٹے اب میرے کس کام کے، کچھ ملازم کو دینے ہیں اور پلیٹیں رمضان کے لیے نکالی ہیں نئی، یہ ایک کام کر دو برتن تو قلعی کرا دو بیٹا۔" وہ بڑے پیار سے جیسے درخواست کرنے لگیں۔

"اوہ...... اماں جی، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، کل ہی میں شہر جا رہا ہوں یمی کے لیے کتابیں لینے تو دے دیجیے گا۔" اس نے مسکرا کر ان کا ہاتھ جو اس کے شانے پر ٹکا تھا اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگالیا، وہ عقیدت کی حد تک ان کا احترام کرتا تھا۔

"میرے لیے بھی کچھ کتابیں لائیے گا، جاتے وقت پیسے لے کر جائیے گا۔" کتابوں کی بات سن کر برقع تہ کر کے رکھتے ہوئے وہ بھی باہر آئی تھی۔

"ضرور لاؤں گا، آپ ابھی مجھے نام لکھ کر دے دیں پرچی پر پھر ایس ایم ایس کر دیجیے...... یمی کے نمبر پر۔" اس نے ایک دم سے کہا۔

"جی میں...... لاتی ہوں لکھ کر۔" وہ فوراً کمرے کے اندر آئی۔

"کس کے ساتھ آئی ہو، اتنی دیر کر دی تم نے، آج تمہاری چچی نے دو مرتبہ پوچھا ہے۔" وہ ابھی واش روم سے فریش ہو کر نکلی تھیں اسے دیکھ کر غصہ کرنے لگیں۔

"وہ...... مراد بھائی مل گئے تھے راستے میں، اصل میں مجھے تھوڑا کام تھا تو دیر ہو گئی...... میں نماز پڑھ لوں!" وہ فوراً وضاحت دیتے ہوئے وضو کی نیت سے واش روم میں گھس گئی اس سے قبل کہ وہ اور پوچھ گچھ کرتیں یا اسے کچھ سناتیں۔

"یہ لو چائے تو پی لو، ایسے کیسے جا رہے ہو اتنے دن بعد تو آئے ہو۔" آپا جلدی سے اس کے لیے



www.paksociety.com



چائے بنا لائی تھیں۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ انہیں سامنے آتا دیکھ کر چائے کی پیالی پکڑے احتراماً اٹھا۔

"ٹھیک ہوں...... تمہاری ماں اور بہن کیسی ہیں، کیا کرتے پھر رہے ہو آج کل؟" وہ خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کی بہن کو بھی نظر انداز کر گئیں۔

"جی آپ کی دعا سے ٹھیک ہیں، میں آج کل ایم اے کلیئر کرنے کے بعد سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح ان کا لہجہ اگنور کر کے شائستگی سے جواب دینے لگا۔

"تو ساری عمر پڑھتے ہی رہو گے کیا، شادی نہیں کرنی۔" اب ان کا لہجہ کچھ نارمل ہوا تھا۔

"پہلے یمی کی شادی کریں گے، پھر دیکھوں گا۔" وہ اس بے وقت بات پر تھوڑا حیران ہوا، اب اس کی شادی کی ان کو کیوں فکر ہو رہی ہے۔

"جب تک تو بوڑھے ہو جاؤ گے...... میرا مطلب ہے کہ یمی کا ابھی تک تو کوئی رشتہ بھی نہیں آیا۔ بچیوں کو جلدی بیاہنا چاہیے ورنہ سر چڑھ جاتی ہیں۔ ہم تو بھئی ابیہا کی کچھ مہینوں میں کر دیں گے...... عباس آ جائے تو تاریخ رکھ دیں۔" وہ اسے جان بوجھ کر سنا رہی تھیں۔

"اللہ مبارک کرے......" وہ آدھی پیالی چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی کمرے میں کسی کی آمد پر جانماز لپیٹی۔

"کتابوں کے نام بتا دیں۔" وہ دہلیز سے تھوڑا آگے کھڑا تھا۔ اس نے جانماز تہ کرتے ہوئے کھلے دروازے کو تسلی سے دیکھا اور بیڈ کی دراز سے پیڈ اور پین نکال کر لکھنے لگی پھر اپنے بیگ سے پیسے نکالنے لگی تھی کہ اس نے روکا۔

"رہنے دیں پیسے۔" [illegible]

"کیوں رہنے دوں......" اس نے پرچی کے ساتھ پیسے رکھ کر اسے دیے۔

"اتنی بھی کیا غیریت...... پیسے رکھ لیں۔ اس نے پرچی سے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیے اور جانے کو مڑا۔

"مراد مجھے کتابیں نہیں چاہئیں...... اور آئندہ میں آپ کو کوئی کام بھی نہیں کہوں گی۔"

"دھمکی...... اچھی دھمکی ہے۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ جز بز ہوتی باہر آئی تو وہ گیٹ پار کر چکا تھا۔ دوسرے دن اسے ضرورت سے زیادہ دو اضافی کتابیں ملیں اور اس نے اسی بچے کے ہاتھ کتابیں واپس لوٹا دیں، تھوڑی دیر بعد وہ خود کتابیں لے کر لائبریری آیا۔

"یہ آپ کے بک کلب کے لیے بطور تحفہ ہیں رکھ لیجیے سارے ممبران کے لیے ہے۔" اسے پتا تھا کہ وہ اب نہیں رکھے گی اگر ایک بار لوٹا دیں۔ اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بچوں کے لیے نوٹس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

"ویسے اب کیسی چل رہی ہے لائبریری...... بچیاں دلچسپی لے رہی ہیں۔" وہ خود ہی بک شیلف میں کتابیں ترتیب وار سیٹ کرنے لگا۔

"مراد یہ سب کیا ہے...... میں نے منع کیا تھا آپ کو۔" اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھیں آپ بھی اس بک شیلف کے لیے منگوا رہی تھیں تو میں بھی اسی کے لیے لے آیا۔ اب اس میں میرا حصہ بھی ہو جائے گا، رکھ لیں، میں نے یہ نہیں کہا آپ گھر لے جائیں، یہ کتابیں آپ نے تو بہرحال واپس بھیج دیں۔" وہ شیلف بند کرتے ہوئے پلٹا۔

"ایک بات مراد آئندہ یوں بے دھڑک مت آئیے گا، یہ میرا گھر نہیں ہے بچیوں کی کلاس ہے اور

یہاں بڑے گاؤں سے بچیاں آتی ہیں۔ کسی مرد کا یوں آنا قطعی غیر مناسب ہے۔ ابھی تو بچیاں جا چکی ہیں مگر آئندہ احتیاط کیجیے گا۔‘‘ اسے بہرحال اس کا یوں فری ہونا یا بار بار آنا جانا اچھا نہیں لگتا تھا گو کہ وہ اس پر بھروسا بھی کرتی تھی مگر خود کو ایک حد میں رکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ویسے بھی اب عیاں ہونے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور وہ دبے دبے لفظوں میں بہت کچھ کہہ جاتا تھا۔

’’جی بہتر...... بس آج سیمی کو لینے آیا تو سوچا میں خود لیب میں رکھ آؤں، آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا آپ کو۔‘‘ اس کا چہرہ ایک دم سے اتر گیا۔ اپنائیت پر پھر سے اجنبیت کا پردہ کھسک آیا اور وہ دوسرے روم میں کتابیں سیٹ کرتی سیمی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے باہر آ گیا، اس دن کے بعد وہ کبھی سیمی کو لینے بھی نہیں آیا، نہ ہی اس نے گھر کا چکر لگایا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی وجہ سے۔ ذاتی طور پر تھوڑی شرمندگی بھی ہوئی کہ اتنے سخت انداز میں کہنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ اس نے تو دل پر ہی لے لیا مگر پھر سوچا چلو اچھا ہی ہوا کہ روز روز کے آمنے سامنے سے بچت ہو گئی۔ ویسے بھی وہ اس سے بات کرنے سے جھجکتی تھی۔ کبھی کبھار بات کرنے کے بعد بات کچھ بڑھ جاتی تھی اور وہ بات کو بڑھانا ہی تو نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

’’کیا حال ہیں ایبہا، تمہاری لائبریری کیسی جا رہی ہے؟‘‘ سلام دعا کے بعد اس نے پہلا سوال اس کے کام کا کیا تھا۔

’’زبردست جا رہی ہے، بس تھوڑی سی مشکلات کا سامنا ہے، دعا کرنا میں اپنی کوششوں میں کامیاب جاؤں۔‘‘ اس کے لہجے میں امید تھی۔

’’ایبہا تمہارے گاؤں میں جتنے کیس بنتے ہیں اگر تم میڈیا کے سامنے لاؤ یا اخبار میں ہی فیچر لکھو تو بات کچھ تو بن ہی جائے گی۔‘‘ وہ اسے ہمیشہ کی طرح اکسانے لگی۔

’’کس کے خلاف لکھوں...... اپنے باپ اپنے بھائی یا پھر اپنے خلاف...... ہم سب ہی اس سسٹم کا حصہ ہیں۔ ان ہی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں۔‘‘

’’ایبہا تم پاگل ہو یار، تم کوئی اسٹیپ اٹھاؤ تو سہی پچھلے دو سال سے میں تمہارے گاؤں کے حالات کے بارے میں سوچ رہی ہوں یار وہاں کی عورت کتنی بے بس ہے، لاچار ہے، کتنے ناانصافی کے کیسز بن سکتے ہیں۔ آخر اس عورت کو کب انصاف ملے گا جو فصلوں میں دن رات کام کرتی ہے۔ گھر کی ذمے داری الگ...... پھر بھی اسی کو رد کیا جاتا ہے، اسی کی حق تلفی کی جاتی ہے۔‘‘

’’میرے خیال سے تو عورت پر ہر جگہ دگنی ذمے داریاں لاد دی گئی ہیں۔ دیکھو جیسے جیسے ترقی کا شعور اور ضروریاتِ زندگی بڑھی ہیں ویسے ویسے حوا، آدم کی اولاد گردش میں آ گئی ہے۔ دن رات کام کر کے سارے لوگ کماتے ہیں جب ہی گھر چلتا ہے۔ اسے ہم اب اپنی ترقی کا دور کہیں یا بے چارگی کا بہرحال حقیقت بہت تلخ ہے، عورت پر دگنی ذمے داریاں لادنے والا مرد ہے یا وہ خود اس کا فیصلہ بھی حالات پر ہے۔ ہاں شہر کی نسبت گاؤں کی عورت زیادہ مظلوم ہے اگر تعلیم کا رجحان ہوتا تو شاید جہالت کے ساتھ ساتھ وہ مظلومیت کی چار دیواری سے نکل ہی آتی مگر تم سوچو سمیرا جہاں لوگ اپنے لڑکوں کی تعلیم پر ہی توجہ نہیں دیتے وہ لوگ لڑکیوں کو پڑھانے میں کتنے روشن خیال ہو سکتے ہیں بھلا...... پھر غربت اور تنگی، وسائل کا نہ ہونا...... سہولیات اور مواقع کی عدم دستیابی ویسے بھی جب پیٹ پالنا ہی دشوار ہو تعلیم اور





شعور کی بات تو بہت بعد میں آتی ہے۔ بھوکا انسان کبھی ہوش و حواس میں نہیں رہتا۔ حالات تبدیل کرنے کی جن کی ذمے داری ہے، وہ خزانے لوٹنے میں مصروف ہیں...... ہم بس ہاتھ پیر چلا سکتے ہیں، سو چلا ہی رہے ہیں۔ باقی رہی بات شور مچانے اور واویلا کرنے کی تو بات کو سنتا اور بڑھتا ہر کوئی ہے پر ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ وہ عورتیں جو روپے پیسے کے لیے اپنے مرد کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں وہ ان کے خلاف کھڑی ہو جائیں تو کیا ان سے ایک چھت کا جو آسرا ہے وہ بھی نہیں چھن جائے گا۔ کون اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگاتا ہے، تبدیلی آہستہ آہستہ آئے تو صحیح ہے۔ اگر ہم لائیں تو قربانیوں کی فصل تیار کرنی ہو گی اور قربانی کے نام پر میدان میں بہت کم لوگ نکلتے ہیں، جو میرا خیال ہے کہ اپنے اپنے حصے کا کام تحمل سے کرتے رہیں تو ہو سکتا ہے سب نہ سہی کچھ تو تبدیلی آ ہی جائے گی۔‘‘

’’کس کا فون ہے؟‘‘ اماں اسے لمبی تقریر کرتا دیکھ کر باہر سے اندر آئیں، ان کے لہجے میں تجسس تھا۔ اس کا دل چاہا کہہ دے لڑکی ہی ہے مگر خاموشی سے فون انہیں تھما دیا...... سمیرا کی آواز سن کر وہ ایک دم سے مطمئن ہوئیں پھر سرسری سی بات کر کے اسے فون تھما کر باہر چلی گئیں۔

’’ہاں یار بس حقیقتیں ہی تلخ ہیں، خیر اپنی بات کیا، شادی نہیں تو۔‘‘ وہ اس سوال پر ارد گرد نظر ڈالتے ہوئے ٹالنے لگی۔

’’تم کر رہی ہو کیا؟ اچھا گاؤں کا ہے، گاؤں کے لوگوں سے اتنی نفرت ہے پھر بھی اور مردوں کا مزاج تو تم پہلے ہی جانتی ہو۔‘‘ وہ اس کی بات سن کر ہنس دی۔

’’اچھا...... اگر اچھا ہے تو کر لو...... پتا نہیں یار میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔‘‘

’’کہاں کا رہنے والا ہے...... یہ بھی نہیں پتا، حد ہے...... اچھا شہر میں ہوتا ہے خود تمہیں وہیں رکھے گا تو پھر تمہاری سہولیات کے لیے بہتر ہے۔ ویسے بھی تم کسی گاؤں کے ماحول میں مشکل سے ایڈجسٹ کرو گی۔‘‘

’’اچھا ضرور دعا کروں گی...... ہاں تم بھی یاد رکھنا...... اوکے، اللہ حافظ۔‘‘ وہ فون بند کر کے مڑی تو بھابی کو پیچھے کھڑے پایا۔

’’ایبہا اپنی سلائی مشین تو نکال دو یار، یہ شرٹ کف سے ادھڑ گئی ہے۔‘‘

’’ہاں آپ اٹھا لیں یہ سامنے ہی رکھی ہے، دوپہر کے کھانے میں کیا بنتا ہے؟‘‘ وہ کہہ کر مڑی جانے کے لیے۔

’’ہانڈی چڑھا آئی ہوں تم روٹیاں ڈال لینا۔ اچھا سنو، یہ کون تھا؟‘‘

’’اف...... بھابی، لڑکی تھی۔‘‘ وہ ہنس دی ان کے تجسس پر۔

’’میرا یہ مطلب تو نہیں ایبہا، مجھے پتا ہے لڑکی ہی ہو گی۔‘‘ وہ کف ٹھیک کرتے ہوئے جیسے شرمندہ سی ہو گئیں۔

’’ارے میری دوست تھی...... وہ جو دو ڈھائی سال پہلے جس نے میرے ساتھ بی اے کے پیپر دیے تھے پھر گاؤں بھی آئی تھی گھومنے، یاد ہو گا آپ کو۔‘‘

’’ارے ہاں، وہ کیسی ہے، بڑے عرصے بعد فون کیا اب آ نہیں رہی یہاں۔‘‘

’’اب کہاں...... اب تو اس کی شادی ہو رہی ہے۔‘‘

’’تمہیں بلایا نہیں اس نے، اچھا تم بلا لینا اسے اپنی شادی پر۔‘‘ مشین چلاتے ہوئے وہ مشورہ دینے لگیں۔



www.paksociety.com

"اس بارے میں ہماری کوئی بات نہیں ہوئی...... جب ہوگی تو دیکھی جائے گی۔"

تم نے اسے اپنے بارے میں نہیں بتایا' میرا مطلب ہے اپنی منگنی کے بارے میں۔"

"نہیں تو ضرورت محسوس نہیں کی جب وہ یہاں آئی تھی تب ہمارے آپس میں اختلافات تھے چچا والوں کے ساتھ بات جیسے ختم تھی پھر فون پر کبھی کبھار ہی بات ہوتی ہے وہ بھی مختصر سی۔"

"اچھا مگر بلانا اسے اپنی شادی میں۔"

"اوہ...... آپ بھی نا...... شادی تو ہو لینے دیجیے۔" وہ ان کی عجلت پر ہنس کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ بات سے بات نکالنا چاہ رہی تھیں شادی کا ذکر چھیڑ کر مگر اس کے مطمئن سے انداز پر مایوس سی ہوگئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کبھی تو شادی کے نام پر وہ بگڑ جاتی اور کبھی...... انہیں اس کی فکر تھی مگر اس سے زیادہ مراد کی...... وہ مراد کے لہجے اس کی باتوں سے سمجھ گئی تھیں اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کا رنگ دیکھ چکی تھیں ابیہا کے لیے ان کا بھائی جو شادی کے لیے تیار نہ ہوتا تھا، اس کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ بس اک جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ ابیہا کا موڈ رویّہ اور بات تھی۔ وہ بے دلی سے قمیص کے کف ٹھیک کر کے اٹھ گئیں۔ انہیں افسوس اس بات پر تھا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے کچھ کر نہیں پا رہی تھیں اس لیے ابیہا کی رضامندی یا ساتھ چاہیے تھا جو بہر حال ان حالات میں ناممکن دِکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گھر میں افراتفری حسبِ معمول عروج پر تھی۔ ایک طرف بھیا فل والیم میں نیوز لگائے دیکھ رہے تھے لاؤنج میں۔ اس سے آگے برآمدے میں بچے زور زور سے سیپارہ پڑھنے میں مصروف تھے کچن سے مسلسل کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ برتنوں، بچوں، ٹی وی اور لوگوں کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اس کا دماغ جیسے گھوم رہا تھا۔ جلدی جلدی بالوں کی چوٹی بنا کر دوپٹا سر پر لیا اور برقع نکال کر برآمدے میں آ گئی۔

"امی، میں ذرا یمی کے ہاں جا رہی ہوں شام تک واپس آ جاؤں گی۔" اس نے دروازے سے جھانک کر ایک دفعہ بتانا مناسب سمجھا گو کہ اجازت تو رات لے چکی تھی۔

"ایک دن بھی سکون سے گھر نہیں بیٹھنا تم، یہ نہیں کہ تھوڑا کام کاج کرا دیا' ہاتھ بٹا لیا پھر موسم بھی خراب ہو رہا ہے کوئی ضرورت نہیں ہے، یمی خود تو آتی نہیں تم ہو کہ روز روز وہاں جانے کے لیے تیار ہو۔" گوشت بھونتے ہوئے وہ پسینہ پونچھتے اپنے مخصوص انداز میں بولیں تو وہ بھابی کے سامنے جیسے شرمندہ سی ہوگئی۔

"یمی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر وہ آتی تو ہے میں خود ہی لائبریری بلا لیتی ہوں کہ یہاں تو کسی کو کسی کی آواز تک نہیں سنائی دیتی اس وقت اس شور میں بھلا کیا بندہ کوئی کام کرے گا۔"

"ہر گھر میں شور ہوتا ہے، اب وہاں تو جیسے سکون ہی ہو۔ خیر افراد ہی کتنے ہیں پھر نہ کسی سے کوئی لینا دینا نہ ذمّے داری، ہمارا تو مہمان خانہ ہی کھلا رہتا ہے چوبیس گھنٹے پھر سو لوگ آتے ہیں گاؤں میں' ملنا جلنا، لینا دینا کئی طرح کے معاملات ہوتے ہیں، اب ایسے میں شور تو ہوگا ہی جہاں دس لوگ بیٹھیں گے، خیر چلی جاؤ پر آ جانا شام تک۔" وہ باتوں باتوں میں جتانا نہ بھولیں ثروت پر، وہ توے پر خاموشی سے روٹی ڈالتی رہیں' ہاتھ لگنے کی وجہ سے جلن کے احساس سی...... کی سی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے تاثرات ہی دب گئے تھے۔ اس نے بڑے افسوس سے اپنی





ماں کو دیکھا جو بولنے سے پہلے کبھی بھی سوچنے کی زحمت نہیں کرتی تھیں۔ پھر اک نگاہ بھابی پر ڈالی جو سر جھکائے بظاہر تو اپنے کام میں مگن نظر آ رہی تھیں مگر چہرہ اُترا اترا سا تھا۔

"بھابی کچھ دینا ہو یمی کے لیے تو دے دیں۔" اس نے ان کا دھیان بدلنا چاہا تھا۔

"نہیں ابیہا صرف پوچھ لینا میری طرف سے اسے اور کہنا مجھے بھی کبھی اپنا چہرہ دکھا جائے' بہت دن ہوئے مراد نے بھی چکر نہیں لگایا۔" وہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بات کو درگزر کر کے بولیں۔

"تم ہی نے کچھ لے لیا ہوگا اس کے لیے، اسے الگ سے دینے کی کیا ضرورت ہے۔" ان کا بولنا ہر حال میں ضروری تھا پھر اس کے ہاتھ میں پکڑا ڈونگا بھی تو دیکھ لیا تھا انہوں نے سو رہا نہ گیا۔

"رات کو کھیر پکائی تھی میں نے وہ لے کر جا رہی ہوں۔" وہ ڈونگا کاؤنٹر پر رکھ کر برقع پہننے لگی پھر سپارہ پڑھتے ہوئے بچے کو آواز دی۔

"کامی اِدھر آؤ، مجھے یمی کے گھر تک چھوڑ آؤ۔" ان کے گھر تک کچھ زیادہ فاصلہ تھا اس لیے اسے برقع لینا پڑتا تھا ورنہ اندرونی گلیوں میں جہاں سوائے اس کے اپنے خاندان کے کسی اور برادری کے گھر نہ تھے یہ تکلف کرنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ حجاب درست کرتے ہوئے ڈونگا پکڑ کر بچے کے ساتھ چلی گئی۔ اسے دیکھ کر یمی تو اٹھ کر بیٹھ گئی مگر اس کی اماں بھی آ گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے ان سب سے بہت پیار سے ملتی تھیں اور بہت خیال بھی رکھتی تھیں اور ایک اس کی ماں تھی۔ پیار سے بات تو دور کی بات لحاظ تک نہ کرتیں کوئی گھر آیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ طبعاً بدلحاظ تھیں...... بلکہ اس فیملی کے لیے بہت تنگ دل تھیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اس کا بھائی جسے بیاہ کر لایا تھا پوری مخالفت کے ساتھ جس کی وجہ سے

www.paksociety.com

اسے اپنی چچازاد چھوڑنا پڑی...... جس کی وجہ سے گھر کا سکون تباہ ہوا اور اس کے بیمار باپ کو مسلسل ٹینشن نے اتنا کمزور کردیا کہ وہ زندگی سے زیادہ ساتھ نہ بناہ سکے۔ جب تک وہ زندہ تھے انہوں نے اپنی بھتیجی پر کسی اور کو فوقیت نہیں دی...... ان کی بھتیجی جیسی بھی تھی بدتمیز، بدلحاظ یا ان پڑھ تھی بہر حال ان کے بھائی کی اولاد اور ان کے بیٹے کی بچپن کی منگ سو وہ قطعی رضا مند نہیں تھے۔ ایک طرف بھائی کا پریشر کہ شادی جلدی کرا کے معاملہ ختم کرو...... دوسری طرف بیٹے کا مسلسل انکار اور وہ دونوں طرف سے کمزور تھے۔ نہ بیٹے کو زبردستی قائل کر پائے نہ ہی بھائی کو سمجھا سکے...... بس اتنا کہا کہ میرے جیتے جی میرا بیٹا کہیں اور نہیں کرے گا...... اور شبیر جو موقع کی تلاش میں تھا باپ کا غم جیسے ہی کچھ کم ہوا، اپنی منوالی اور سادگی سے نکاح کر کے گھر والوں کے ساتھ.... یاسمین کو لے آیا گو کہ اس کے گھر والے بھی اس طرح افراتفری کی شادی پر رضا مند نہیں تھے مگر حالات دیکھ کر چپ ہونا پڑا۔

وقت کے ساتھ ساتھ چچا کی ناراضی کچھ ختم ہوئی۔ ناراضی کے سبب بیچ والی دیوار جو بڑھا دی گئی تھی اس میں سے دروازہ نکال لیا گیا۔ آنے جانے کے بعد ناراضی ختم ہوئی۔ چچا کو ایبہا دل سے پسند تھی۔ اس کی وجہ اس کا دھیما مزاج، صلح جو انداز...... اور خدمت اور سلیقہ تھا، وہ بچپن سے ان کے نزدیک رہی تھی۔ جب بھی ضرورت پڑتی، سر میں تیل کی مالش کروانی ہے، ایبہا کو بلایا جاتا...... چچا کو اخبار پڑھ کر سنانا ہے یا ان کے لیے ان کی پسند کی کھیر بنانی ہے، ایبہا کے پاس فرمائش آتی۔ اپنی اولاد سے تو وہ شروع سے کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔ بیٹی جو ماں کا پرتو تھی سوائے شکایتوں کے اور کوئی بات نہیں تھی زبان پر۔ بیٹا جو شروع سے بے جا لاڈ کی وجہ سے خودسر اور بے پروا تھا اس سے ایسی امیدیں رکھنا ہی بیکار تھیں پھر پڑھائی کے سلسلے میں وہ ہمیشہ ہی گاؤں سے باہر رہا تھا۔ چھٹیوں میں ہی آتا۔ سو ایبہا پھر سے ان سے قریب آگئی۔ اسے بھی چچا سے ابا کی خوشبو آتی۔ ابا کی وفات کے بعد وہ چچا کے لیے کچھ زیادہ ہی حساس ہوگئی تھی۔ حالانکہ ویسے ان کے گھر کا ماحول اس کے لیے ایک عذاب ہی تھا۔ بڑی آپا کی تنقید، چچ چچ گو کہ کبھی کبھی ہی آتیں مگر حساب کلیئر کر جاتیں۔ اور چچی کی وہی نکتہ چینی اور اعتراضات۔ واحد چچا تھے جن کی وجہ سے اسے کچھ ڈھارس تھی ورنہ عباس کی فطرت کا اسے پتا تھا۔ وہ اگر یہ زہر پی رہی تھی تو اس کی بڑی وجہ اس کے باپ کی عزت چچا کا پیار تھا اور ویسے ہی اپنے لیے وہ احتجاج کر کے سب کچھ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ان سب کو آمادہ کر کے اسے اور بھی بہت سے کام کرنا تھے۔ ان ساری باتوں سے اس نے دل کو ہر حال میں مطمئن کرنا چاہا تھا۔ مگر ایک دل ہی تو نادان تھا اپنی منوانا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہر حال میں اس دل پر کنٹرول رکھنا چاہتی تھی۔ مسائل کی ایک لمبی قطار تھی جو یہ سارے احساس بھلا دیتی تھی۔ یہ شاید زندگی کی سچائی تھی، تلخ سہی۔

☆☆☆

”سنا ہے عید پر عباس آرہا ہے۔“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولیں۔

”پھر......؟“ اس نے برتن دھوتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔

”پھر یہ کہ تمہاری شادی کی تاریخ رکھی جائے گی۔“ انہوں نے جیسے اس کی نالج میں اضافہ کیا تھا۔

”اچھا!“ وہ سر جھٹکتے ہوئے کام میں پھر سے مصروف ہوگئی۔

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرا مطلب ہے خوشی نہیں ہوئی؟“



www.paksociety.com



”بھابی......“ اس نے تنقیدی انداز میں کہتے ہوئے منہ بنایا۔

”ہونا تو بہر حال چاہیے...... تمہیں خوشی نہیں ہوئی ایبہا...... واقعی۔“

”کبھی کبھار آپ بھی بالکل بچوں کی طرح ری ایکٹ کرتی ہیں۔“ وہ ان کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی مگر پتا تھا وہ پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔

”میں جس طرح بھی ری ایکٹ کروں...... مگر تمہارا ایکشن میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”آپ کیوں سمجھنے کے لیے ہلکان ہوتی ہیں، سمی کی فکر آپ کو بھی نہیں۔“ وہ گفتگو کا رخ موڑنا چاہتی تھی۔

”سمی کے لیے جب تک کوئی اچھا رشتہ نہیں آتا، صبر ہی کیا جاسکتا ہے۔ تمہیں سمی نے کچھ کہا ہے کیا، آئی مین کوئی ہے اس کی نظر میں۔“ وہ ذرا ٹھٹکیں اس کی بات پر۔

”ایسا تو کچھ نہیں، میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ کل آنٹی بھی پریشان ہورہی تھیں...... بہر حال۔“

”ایبہا تم اپنے بارے میں کھلتی کیوں نہیں، کیا سمی کے ساتھ بھی نہیں۔ کس کس کو بہلاؤ گی۔“ انہیں آخر کار صاف صاف بات کرنی پڑی۔

”بھابی، اپنی غلط فہمیاں لپیٹ کر رکھ دیں، ایسا کیا ہے جو میں نے چھپا کر رکھا ہوا ہے وہ بھی آپ سے یا سمی سے، بلاوجہ کے وہم......“ وہ اب کام ختم کر کے جلدی جلدی کچن سے باہر جانا چاہ رہی تھی۔

”تو پھر تمہارا رویّہ اس بارے میں اُکھڑا اُکھڑا کیوں ہے، تمہیں خوشی کیوں نہیں ہوتی اس کے ذکر سے، تم اس کے متعلق کوئی بات کہنا سننا پسند کیوں نہیں کرتیں...... کیا وجہ ہے اس سب کی...... ان بہانے بازیوں کی...... کب تک ایسا چلے گا؟ کھیل رہی ہو تم خود سے۔“ وہ اسے ہر حال میں کھولنا چاہتی تھیں۔

”آپ یہ سمجھیں کہ کچھ بھی نہیں میرے دل میں ... محبت، نہ نفرت، نہ احساس، نہ شدت، کچھ بھی نہیں...... میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا اس بارے میں...... سوچنے کے لیے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ذمے داریاں ہیں...... میں نے کبھی اس معاملے میں خود کو زیادہ انوالو نہیں کرنا چاہا۔“ اپنے تئیں وہ انہیں مطمئن کر چکی تھی۔

”ایبہا...... تم مجھے بنا رہی ہو...... کیا میں تم سے بھی کم عمر یا احمق ہوں؟“ ان کو افسوس ہوا اس کے صاف مکر جانے پر۔

”بھابی...... پلیز...... جس بات کا کوئی وجود نہیں اسے رہنے دیں۔“ وہ بیزار آچکی تھی اس مسلسل اصرار سے۔

”کس بات کا وجود نہیں ہے ایبہا......؟“ وہ اسے کریدنے میں کچھ کچھ کامیاب ہو ہی چکی تھیں۔

”آپ چاہتی ہیں کہ میں اعتراض کروں اور گھر کا ماحول خراب ہو، آپ چاہتی ہیں میں اپنا اور دوسروں کا سکون تباہ کر کے چھوڑوں، آپ چاہتی ہیں میں وہ جنگ لڑنا شروع کردوں جس کا انجام صرف تباہی ہے اپنی اور دوسروں کی...... تو بہر حال مجھ میں نہ اتنا حوصلہ ہے نہ ہی خواہش......“ وہ بحث کر کے تھک چکی تھی، پہلے بھی بہت بار انہوں نے اس موضوع پر اس سے کھل کر بات کرنا چاہی تھی اور وہ ٹال مٹول کر کر کے تھک چکی تھی۔

”یہ سب تمہارے بھائی نے بھی کیا تھا۔ کیا تم اپنے حق کے لیے نہیں لڑسکتیں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی، تمہارے بھائی سے بات کروں گی، تم کہو تو صرف ایک بار۔“ وہ جیسے اکسا رہی تھیں۔

”وہ میرا بھائی تھا، اس معاشرے کا مرد جس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا...... اور پھر میں اب کس کے مرنے کا انتظار کروں گی، اماں کے، اپنے،

یا پھر...... اور آپ میرا ساتھ کیوں دیں گی، کس لیے صرف اس لیے کہ وہ آپ کا بھائی ہے، صرف اس لیے کہ آپ اس کے لیے لڑنا چاہتی ہیں۔ اگر کوئی اور اس جگہ ہوتا تو بھی کیا آپ اتنی ہی دلچسپی دکھاتیں، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں...... کیوں اس آگ کو ہوا دینا چاہ رہی ہیں، میں یہ سارے ہنگامے نہیں چاہتی۔ اس کے علاوہ بھی زندگی کچھ ہے۔"

"تم بھی مراد کو چاہتی ہونا؟" وہ کھل کر اس سے اقرار کروانا چاہتی تھیں۔

"نہیں، یہ آپ کی غلط فہمی ہے، میں عباس کو پسند نہیں کرتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔" وہ صاف نظریں چرا گئی۔

"تو پھر تم نے مراد کا نام کیوں لیا حالانکہ اس نے تو کبھی ہمارے سامنے اس پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ تمہیں کچھ کہا ہے کیا اس نے۔" اب وہ کیا کہتی کہ اس کے رویے...... اس کی باتوں اور آنکھوں سے کیا جھلکتا ہے، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کیا کہہ دیتا ہے۔

"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ آئندہ آپ مجھ سے بات نہیں کریں گی اس معاملے پر، میرے خیال سے اگر کچھ نہیں تو آپ کو کم از کم کسی کی فکر میں دُبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ دکھ اور افسوس کی ملی جلی کیفیت سے اتنا کہہ کر باہر نکل آئی۔

وہ اپنے ماں باپ کے سامنے اظہار نہیں کرسکتا اور اسے کمزور کرنے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے دل میں جو رہی سہی اس کی اہمیت تھی وہ بھی نہ رہی۔

☆☆☆

"تمہیں پتا ہے محبت میں کتنی آزمائشیں ہوتی ہیں، کتنا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ محبت خود ایک امتحان سے کم نہیں۔ ہم جیسی لڑکیاں محبت کے خواب افورڈ نہیں کرسکتیں عباس... حقیقت کی تنگ نظری محبت کے خوابوں کو کھا جاتی ہے۔" وہ آس پاس کی رنگینیوں سے بے خبر تلخی سے بولی۔

"تمہارے اندر میرے لیے کتنی بے اعتباری ہے نا......" وہ افسوس سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہم خود پر بھی اعتبار کرنے کے لائق نہیں رہتے کبھی کبھار۔ میں نے کب چاہا تھا کہ میں کسی سے اتنا قریب آجاؤں...... یا کسی کو اتنی اجازت دوں گی...... ڈیٹ پر جانے والی لڑکیاں مجھے سخت ناپسند ہیں اور آج میں خود ان میں شامل ہوگئی ہوں۔" وہ نظریں جھکا کر اپنے ناخنوں کو کھرچ رہی تھی۔

"ہم ڈیٹ پر نہیں آئے...... میں خود اس طرح باہر چھپ کر تم سے ملنا نہیں چاہتا مگر بغیر تعلق کے گھر پر ملنے آنا بھی تو... مناسب نہیں ہوگا۔"

"امی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کب...... مجھے بتاؤ، میں آؤں گا۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، جسے دیکھ کر وہ مطمئن ہوئی تھی۔ اس شخص سے اسے محبت نہ تھی مگر اس کی محبت اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ اسے کشش کا نام دیتی تھی اور وہ محبت کہتا تھا۔ اصل کیا تھا یہ وہ سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ بس اپنی زندگی سے بیزار تھی اور کوئی ایک حل چاہتی تھی۔ ہر عام طبقے کی لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کی طرح اس کا سب سے بڑا مسئلہ بھی شادی ہی تھا۔ پہلے پہل حسبِ معمول وہ چڑتی تھی، پھر حقیقت کی قائل ہوگئی۔ محلے والوں کے سوال، بڑھتی عمر...... ذمے داریوں کا ڈھیر سر پر لادے وہ کوئی خواب دیکھنے کی خواہش تو نہیں کرسکتی تھی پر کوئی ایک موڑ چاہتی تھی اس سفر میں... پھر امی کی پریشانیاں جو اس کے حوالے سے عمر کی طرح ہی بڑھ رہی تھیں۔



www.paksociety.com



"میں ان سے ضرور ملوں گا۔" اس نے جیسے یقین دلایا اور دوسرے دن ہی وہ اس کے گھر پر تھا۔ وہ خوش شکل تھا اور خوش اخلاق لگتا تھا۔ اس کا اپنا کاروبار اور اپنی زمینیں تھیں، ہر لحاظ سے ان کو وہ قابل لگا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ اسے شادی کا کہہ گئیں۔

"امی تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کررہی ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے...... چائے لے آئی۔

"میں خود آپ سے یہی بات کرنے آیا ہوں...... مگر میری کچھ مجبوریاں ہیں، آپ کو تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔" خود سے جڑی ہوئی نام نہاد مجبوریاں ان کے آگے رکھیں اور چند سچائیاں اپنی جو وہ اس سے وابستہ کرچکا تھا، وہ چپ ہوگئیں یہ سن کر اور وہ مسلسل بولتے ہوئے ان کا دھیان بٹانے لگا۔ سمیرا خاموشی سے دونوں کی باتیں سنتے کبھی مسکرا دیتی تو کبھی آنکھوں ہی آنکھوں میں امی کو جلد بازی پر ٹوک دیتی۔

وہ پوری شام وہ ان کے ساتھ رہا اور جاتے جاتے اپنی باتوں سے جو چھوڑ گیا وہ ایک چھوٹا سا یقین کا احساس تھا جس احساس نے ہی اس گھر میں کچھ رونق سی بھر دی۔ یہ رونق چہروں اور لہجوں میں جھلک رہی تھی۔ عباس کا آنا جانا بڑھ گیا تھا ساتھ ان کا یقین بھی۔

☆☆☆

"وہ کل آئی تھی۔" اس نے اسے کتاب میں گم دیکھ کر مخاطب کیا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ ورق الٹ کر دیکھنے لگا سرسری انداز میں۔

"اور صبح آپا آئی تھیں۔"

"کوئی اور نئی بات......؟" اس نے کتاب بند کرکے اس کی طرف بیزاری سے دیکھا۔

"پتا ہے وہ کیا کہہ رہی تھیں۔" وہ تجسس بڑھا رہی تھی۔

"اپنے گھر کے مسئلے...... اور کچھ......؟" وہ چڑ چڑا سا ہو کر اٹھا۔

"تمہیں آخر ہوا کیا ہے ادا، اتنے غصے میں کیوں رہتے ہو ہر وقت...... کل وہ آئی تھی، تم گھر نہیں آئے اور نہ ہی مجھے چھوڑنے یا لینے آتے ہو نہ ہی اس کے گھر گئے ہو آخر بات کیا ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟" وہ کتاب بغل میں دابے باہر نکلا۔

"وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔" وہ اسے جاتا دیکھ کر ایک دم بولی۔

"اچھا...... اس کا اظہار اس نے تم سے کیوں کیا۔" اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ وہ جاتے جاتے دہلیز کے بیچ رکا۔

"نہیں آپا سے...... میرا مطلب ہے وہ بتا رہی تھیں۔" وہ گڑبڑائی۔

"بہت خوب...... آپا کو مبارک باد دے دینا۔" وہ اسی لہجے میں کہتا ہوا آگے بڑھا۔

"آپ کو یقین کیوں نہیں آتا......" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے آگئی۔

"کس بات کا یقین؟" وہ اسے گھورنے لگا اس بے تکی بات پر۔

"آپ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں۔ اس کے اور اپنے لیے، یہ تو کوئی بات نہیں، اسے تو پروا نہیں ہے مگر آپ تو قدم اٹھا سکتے ہیں نا۔"

"یہی بات تم نے اس سے بھی کی؟" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلایا۔

"کبھی کرنا بھی مت، سمجھیں...... مجھے اس کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتی ہو تو...... کم از کم میرا خیال رکھ لینا۔"

"آپ دونوں کو اتنی غلط فہمیاں کیوں ہیں ایک دوسرے کے بارے میں؟"

"مجھے نہیں ہیں، اس کا مجھے نہیں پتا۔" وہ کچھ ٹھٹکا تھا اس بات پر۔

"آپ کو یہی غلط فہمی ہے کہ وہ آپ سے الرجک ہے، متنفر ہے، یہی نا......اور اسے شاید۔" اس بار وہ کچھ کہہ نہیں پائی وہ کہاں بھلا کچھ بھی ظاہر کرتی تھی یا احساس دلاتی تھی۔

"اسے بھی نہیں......اور ہاں یہ فضول خیالات چھوڑ دو اور آپا کو بھی سمجھاؤ، اسی گھر میں رہتی ہیں کیوں اپنا اور لوگوں کا جینا حرام کرنا چاہتی ہیں۔" وہ لٹھ مار انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"آپ بہت سیلفش ہیں، اپنا اور اس کا نقصان کر رہے ہیں۔" اس نے جاتے جاتے پیچھے یمی کی آواز سنی تھی۔ اس کے قدموں میں تھکن آ گئی جو دل کے اندر تھی۔

☆☆☆

"کیا عباس سے بات نہیں ہوئی، نہیں آ رہا وہ......؟ تم نے بتایا اسے کہ کھانا یہاں کھائے۔" وہ اسے کام کرتا ہوا دیکھ کر کچن کے دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئیں اور فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

"اس کی بہانے بازیاں کم ہوتے میں نہیں آتیں۔" وہ بریانی دم پر رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی ناراضی تھی۔

"تو کیا نہیں آئے گا...... پھر تم اتنی محنت کیوں کر رہی ہو؟" ان کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"کہتا ہے آئے گا......اب پتا نہیں کب آئے گا۔" وہ مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے کام میں لگ گئی۔

"اسے فون کرو...... یا میں کرتی ہوں۔" ان سے اس کی یہ کیفیت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

"امی خدا کے لیے......اسے بار بار یہ احساس مت دلائیں کہ ہم اس کے کتنے محتاج ہیں۔ آپ کے اس رویے نے مجھے پہلے ہی اس کی نظر میں گرا دیا ہوگا۔ آپ دیکھتی نہیں اس کے نخرے اور بہانے۔" اس کے لہجے میں جہاں بھر کی بیزاری تھی۔

"تو کیا چھوڑ دیں اب اسے...... نکاح ہو چکا ہے تمہارا اس سے اور اب وہ بہانے کر رہا ہے کیوں؟ میں بات کرتی ہوں اب اس سے۔" وہ غصے سے کہتے ہوئے اندر چلی گئیں اور فون ملانے لگیں...... جب باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ فون رکھ کر جلدی سے دروازے تک آئیں، وہی آیا تھا ان کی سانس جیسے بحال ہوئی تھی۔

"آ جاؤ اندر اتنی دیر لگا دی، کیا بات تھی، کب سے یمیرا انتظار کر رہی ہے۔" وہ اس کے اندر آتے ہی بولیں۔

"ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔ آ ہی رہا تھا۔ کہاں ہے وہ، کچن میں۔" فروٹ کے شاپر انہیں تھما تا وہ کچن میں ہی چلا آیا۔

"کیسی ہو ناراض محترمہ۔ میسج کا جواب بھی نہیں دیا۔"

"ٹھیک ہوں......اور ایسی ہی ہوں، سوچ سمجھ کر چنا ہے تم نے اب ایسا نہ ہو کہ بیزار آ جاؤ۔"

"کس نے کہا ہے کہ بیزار آ جاؤں گا وہ بھی تم سے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولا۔

"لگتا تو یہی ہے...... تمہارے مسلسل بہانے اور بات گھمانے سے۔"

"میں تم سے کیوں بہانہ کروں گا بھلا...... کیا سمجھتی ہو مجھے......اتنا تو بھروسا رکھو شادی کی ہے میں نے تم سے۔" وہ اسے شانوں سے تھام کر اپنے آگے کرتے ہوئے بولا۔





"صرف نکاح......" اس نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ بہت دنوں سے اسے غصہ تھا، شکایتیں نہیں، دکھ تھا جو اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

"رخصتی ہوگی اسی ہفتے......آؤ باہر آؤ، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ اسے خفا دیکھ کر دلجوئی کرتے ہوئے باہر لے آیا۔

"بیٹھو یہاں...... اب بولو، کیا مسئلہ ہے کتنا غصہ ہے مجھ پر؟" پہلے وہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

"تمہیں پروا ہوتی تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔" غصہ ابھی تک اپنی جگہ تھا۔

"آنٹی......آپ بتائیں، اب سمجھائیں اسے، مصروف تھا میں جبھی نہیں آ سکا اور رخصتی ہم اسی ہفتے کریں گے آپ کو بلانا ہو کچھ لوگوں کو تو میں ویسے کی تقریب کا انتظام کروں۔" اسے پتا تھا فی الحال اس سے بات کرنا بحث کو طول دینا ہے سو اُن کو بُلا کر بتایا۔ ویسے ہی اسے شروع سے وضاحت دینے یا صفائی پیش کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ تو پھر بھی اس کے لیے کافی نرم پڑا تھا۔

"بیٹا تمہارے امی ابو نہیں آئیں گے؟" ان کے چہرے پر کچھ اطمینان در آیا رخصتی کی بات سن کر۔

"یہ تو ناممکن ہے آنٹی فی الحال...... انہیں تو کانوں کان خبر نہیں ہے۔ مجھے بہت ٹائم لگے گا یہ سب کلیئر کرنے میں پھر میں جو یہاں ہوں، آپ کو مجھ سے سروکار ہونا چاہیے۔"

"بیٹا پر دنیا تو باتیں کرتی ہے نا، ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"اب یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میں... فی الحال انہیں نہیں قائل کر سکتا آپ لوگوں کو ویٹ کرنا پڑے گا، نکاح کی جلدی آپ کو تھی سو میں نے کر دیا کہ آپ لوگوں کو اعتبار آ جائے۔ اب اس کے علاوہ میں اور کیا کروں۔ یمیرا کے نام ایک فلیٹ لیا ہے میں نے، یہ اس کی چابیاں ہیں اور میری گاڑی بھی اسی کے نام ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں کل نیا فرنیچر ڈلوایا ہے میں نے گھر سیٹ کر دیا ہے۔ کہیں تو رخصتی کا کوئی اہتمام کروں یا پھر سادگی سے لے جاؤں اسے۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"تم اسے لے جاؤ رخصتی کر کے۔ میں اپنے گھر میں ٹھیک ہوں۔" وہ کچھ توقف کے بعد اٹھیں۔

"مجھے گھر اور گاڑی کا لالچ نہیں ہے عباس، تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی ضرورت ہے ان کی طرف سے قبولیت کی، میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، تم لے جاؤ مجھے میں پاؤں پکڑ کر انہیں منا لوں گی۔ ایک موقع تو دو مجھے۔"

"ساری سچویشن تمہیں پتا ہے پھر بھی بچی بن رہی ہو، حد ہوتی ہے ابھی وہاں جا کر میں اپنے ماں باپ کو صدمہ دوں، وہ بھی اس حالت میں اتنی اچانک...... اور شادی تم نے مجھ سے کی ہے نا کہ میرے گھر والوں سے...... تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے ان کے ساتھ نہیں۔ ان کے ساتھ رہنے کے لیے ان کی بھتیجی بہت ہے۔" وہ غصے سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو کیا تم وہاں جا کر شادی کرو گے؟" وہ صدمے سے گنگ تھی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... ہوسکتا ہے کرنی پڑے......ہوسکتا ہے کہ......"

"ہوسکتا ہے پر مجھے مت ٹالو صاف صاف بات کرو مجھ سے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کیوں شادی کی مجھ سے بتاؤ۔ تم لوگ ہمیں بے وقوف بنا کر خود خوش رہنا چاہتے ہو، دس جگہ شادیاں کر کے۔ ہر کسی کو محبت کا جھوٹا دلاسا دے کر۔"



www.paksociety.com

"بے وقوف تم خود بنی ہو یا پھر مجھے بنایا ہے تم نے، پہلے شادی کی جلدی پڑی تھی اب جب نکاح کرلیا تو بلیک میلنگ ہوگئی شروع...... مرضی ہے تمہاری جہاں رہو جو کرو...... جارہا ہوں میں گاؤں' کچھ دنوں تک سر مت کھانا میرا۔" وہ چابیاں میز پر پھینک کر باہر چلا گیا۔

"دیکھا آپ نے...... دیکھا...... کہا تھا میں نے آپ سے مت کریں جلدی...... میرے ساتھ دھوکا ہوگیا...... ہوگیا نا......وہ شادی کرے گا وہاں جا کر بیٹھ جائے گا پھر نہیں آئے گا لوٹ کر...... چلا گیا۔" وہ روتی چلّاتی کمرے میں گئی اور جا کر دروازہ بند کرلیا اور اپنی قسمت پر رونے لگی یا پھر اپنی غلطی پر...... جسے بھگتنا بہرحال اسے ہی تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

حسبِ معمول صبح سویرے ناشتا کرکے برقع پہن کر وہ لائبریری چلی گئی، اندازہ نہ تھا کہ آج یہ دھماکا ہوگا گھر میں ویسے ہی عباس کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ آدم بیزار سی چند گھڑیاں ہی اپنی مرضی سے گزارنے یہاں آئی تھی فری ہو کر کچھ دیر یمی سے گپ شپ کے دوران وہ ساری پریشانیاں وقتی طور پر بھول جاتی تھی اور گھر واپسی پر وہ ہمیشہ خوشگوار رہا کرتی۔ آج تو حد ہوگئی، ابھی بچوں کی کلاس ہو رہی تھی کہ وہ کسی عزرائیل کی طرح بن بلائے بن بتائے اچانک آدھمکا تھا۔ کلاس کی بچیوں کی طرح وہ بھی دم بخود تھی مگر کلاس سے لڑکیوں کو اٹھتے دیکھ کر اسے جیسے ہوش آیا۔

"آپ...... یہاں...... پلیز باہر جائیں، آپ کو بتایا نہیں کسی نے کہ یہاں مرد حضرات کا آنا منع ہے، کم از کم دروازے پر لگا بورڈ دیکھ لیتے۔" اسے فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، بچیاں ساری اٹھ گئی تھیں۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے کاپیاں پنسلیں، کتابیں اِدھر اُدھر بکھر گئیں اور وہ کلاس کا اور اس کا تنقیدی جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"محترم خدا کے لیے باہر جائیں، یہ کوئی وقت ہے۔ آپ کو ذرا تمیز نہیں۔" اسے یہ ڈھٹائی دیکھ کر غصہ آگیا تھا اوپر سے اس کی گہری تنقیدی طنز برساتی نظریں، وہ خجل سی ہوگئی۔ "آپ کو سمجھ نہیں آتا یا سنائی نہیں دیتا جو میں کہہ رہی ہوں۔ کمرے سے باہر جائیں ابھی اور اسی وقت۔" وہ سختی سے کہتے ہوئے بکھری کتابیں فرش سے اٹھانے لگی جب یمی تیزی سے اندر آئی ایک لمحے کو رک کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا اور کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

"آپ کو یہاں ملنے نہیں آنا چاہیے تھا عباس بھائی...... یہاں پورے محلے کی بچیاں ہوتی ہیں کوئی نہیں آتا۔" وہ جھجک کر بول پڑی۔

"کوئی ضرورت نہیں تھی مجھے ملنے کی تم سے...... دیکھنے آیا تھا یہ جو تماشا لگایا ہے تم لوگوں نے اور ساتھ میں تمہاری بدتمیزی اور بدلحاظی بھی ملاحظہ کرلی۔ بہت دماغ خراب ہوگیا ہے نا، ٹھیک ہوجائے گا سارا۔" وہ یمی کے بجائے اس سے مخاطب تھا۔

"آپ پلیز یہاں سے ابھی اور اسی وقت چلے جائیں اس سے پہلے کہ مجھے حقیقی معنوں میں... بدتمیزی یا بدلحاظی کرنا پڑے۔" وہ کتابیں یمی کو تھما کر بولی۔

"تمہارا یہ جو دماغ بہت خراب ہے نا...... یہ اکڑ یہ رعب ہمیشہ نہیں رہے گا۔" کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے وہ جیسے دھماکا کرکے باہر نکل گیا لال بھبھوکا چہرہ لے کر۔ یمی نے ساری بچیوں کو دوسرے روم سے میلا کر کتابیں لے جانے کو کہا اور چھٹی کرکے اسے





ساتھ لیے باہر آگئی۔

اس کا جیسے دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ عباس کا روتیہ لہجہ اور انداز دیکھ کر، وہ بے یقینی کے عالم میں چلتے گیٹ تک آئی۔ یمی دروازے تک اس کے ساتھ آئی تھی مگر اس نے یمی کو اندر آنے کا نہیں کہا۔ اسی غائب دماغی میں اسے چھوڑ کر وہ اندر آگئی جہاں ایک تماشا اس کا منتظر تھا۔ چچا کو چھوڑ کر ان کا پورا گھرانا جمع تھا۔ چچی، آپا، عباس، پھپھو وہ سب کے غصیلے چہرے دیکھ کر آگے بڑھ گئی کمرے کی طرف جہاں امی بھری بیٹھی تھیں اور اس کے آتے ہی شروع ہوگئیں۔ اس سے جیسے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا تھا جس کی وضاحت سننے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ سب سنانے کے موڈ میں تھے۔ رہی سہی کسر آپا جی اور چچی نے کمرے میں آکر پوری کرلی۔ اس کی سماعتیں جیسے پھٹنے کو تیار تھیں۔

☆☆☆

اول تو اسے اپنا قصور سمجھ نہیں آیا اور پھر سزا کے طور پر جو کچھ سننا پڑا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا مگر وہ سنگدلی کی آخری حدوں کو چھوتے اپنے بے پروا گھر والوں کی یہ گولہ باری سہتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا دلیل دے، خود پر پورا کنٹرول تھا سو خود کو جبراً چپ رکھا۔ لائبریری پر تالا پڑ گیا، وہ چپ رہی، بچیوں کے فون آتے رہے وہ چپ رہی، اس وقت سوائے چپ کے جیسے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اتنے دن صرف سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے اس کا دماغ جیسے سُن سا ہوگیا تھا۔ اس کی حالت پر سب سے زیادہ پریشانی اس کی دادی اور بھابی ہی کو ہوئی، بھیا جیسے گھر میں تھے ویسے نہ تھے۔ ان کی موجودگی کا نہ اسے کبھی کوئی فائدہ ہوا تھا نہ کوئی امید تھی۔

"ایمہا کیسی ہو؟" یمی کی آواز پر وہ ایک دم سے مڑی، وہ اس سے لپٹ گئی۔ "کیا ہوا ہے گھر ہی بیٹھ گئی ہو، کیوں ایسا کردیا ہے خود کو۔" وہ اسے جانچتے ہوئے افسوس سے کہنے لگی۔

"یمی...... میں بہت تھک چکی ہوں۔" اس کی آواز میں تھکن کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

"اتنی جلدی ہار مان لی تم نے......؟" اسے افسوس ہوا۔

"کچھ بھی مت کہو...... پلیز یمی...... میں تھک گئی ہوں، بہت سن سن کر۔" اس کا گلا رُندھ گیا اور وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ یمی حواس باختہ اسے چپ کراتی رہ گئی۔ اندر آتی پھپھو واپس پلٹ گئیں۔ امی نے کھلی کھڑکی سے بیزاری سے یہ منظر دیکھا گویا وہ بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہے اور دروازے میں کھڑی بھابی دکھ اور افسوس سے وہیں کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

"اب ایسا بھی کیا ہوگیا جو بچوں کی طرح رونے بیٹھ گئیں۔ لوگ کیا سمجھیں گے، بڑا ظلم کیا ہے گھر والوں نے بیٹی پڑھایا لکھایا، ہر خواہش پوری کی اب بھلائی کے دو بول کیا بول دیے جیسے گناہ ہی ہوگیا ہم سے۔" یمی کے جاتے ہی اماں اس پر برس پڑیں۔

"چھوڑ دو بھابی، حد ہوتی ہے پہلے ہی بچی سہم گئی ہے، آؤ ایمہا باہر چل کر بیٹھتے ہیں صحن میں، دیکھو کتنی اچھی ہوا چل رہی ہے۔" پھپھو کے دل میں نہ جانے کیسے رحم آگیا تھا۔ وہ تعجب سے ان کی طرف دیکھ کر اٹھی اور ان کے ساتھ باہر آگئی۔ موڈ جو مشکل سے یمی نے بحال کیا تھا اسے بگاڑنے میں اماں نے ایک منٹ ہی لیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے ایمہا دل کرتا ہے تمہارے لیے سب سے خوب لڑوں...... مگر صرف ایک بات سوچتی ہوں...... میں جس طرح کنواری بیٹھی رہ گئی کہیں تم نہ



www.paksociety.com

بیٹھی رہ جاؤ...... تنہائی بہت بُری چیز ہے اور پھر بڑھاپے کی تنہائی، جب نہ کوئی سننے والا ہو، نہ کوئی بات کرنے والا ہو۔ بڑا مشکل وقت گزارہ ہے میں نے، تمہیں کیا پتا' بھائیوں کے آگے جب پیسے پیسے کے لیے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں' اپنا حق بھی احسان سمجھا کر ملتا ہے وہ بھی مشکل سے۔ اب تو کوئی گھاس ڈالنے والا نہیں۔'' ان کے لہجے میں دکھ اور افسوس شدید تھا۔ وہ اپنا دکھ بُھلا کر ان کی بات کی سچائی میں کھو گئی۔

''ایک دفعہ منگنی ٹوٹ جائے تو مشکل سے ہوتی ہے دوسری جگہ۔ پھر ہمارے خاندان والے لڑکی باہر بھی نہیں دیتے۔ میں نہیں چاہتی رشتہ ٹوٹنے کے بعد تم بیٹھی رہ جاؤ۔'' ان کی منگنی بھی بھائیوں کے جھگڑے کی وجہ سے ٹوٹی تھی اور پھر کہیں نہ ہوئی۔ گو کہ ان کی زمین کا حصہ چھوٹے بھائی عباس کے والد کے پاس تھا اور وہ اسی کے پورشن میں بنے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھیں مگر ان سب کا رویّہ...... بھائیوں کی بے پروائی نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔

''پھپھو...... بابا نے بھی آپ کے لیے کچھ نہیں کیا......'' اسے یہی افسوس تھا۔

''کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا بیٹا، سب اپنے اپنے گھر میں، اپنی مصروفیات اپنے بچوں میں مگن ہوتے ہیں۔ گھر کے اضافی فرد کا کسی کو کوئی دھیان نہیں ہوتا۔ اُدھر اماں جی اکیلی اِدھر میں...... اماں جی تو پھر بھی سو کاموں میں بہلی ہوئی ہیں مگر میں...... خیر چھوڑو یہ بات...... ایبھا میں صرف تمہارے لیے دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ تمہارے حق میں بہتر کرے یا عباس کو ہدایت دے مگر یہ رشتہ ہی ٹوٹ جائے یہ بات دل کو نہیں لگتی'' وہ بے بسی سے بولیں۔

''پھپھو آپ پریشان مت ہوں۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی تو انہیں ٹوٹ کر پیار آ گیا اس پر۔ اس کا سر چوما اور بہت ساری دعائیں دیں۔

بہت دن بعد وہ کسی کی دعا پر پُرسکون ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ اسی پل اللہ کے حوالے کر دیا یہ سوچ کر کہ جب بندہ کچھ نہیں کر پاتا تو سب کچھ اللہ کرتا ہے۔ اسے اسی فیصلے کا انتظار تھا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چہل پہل اور افراتفری سی مچ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ اس نے بچیوں کو گھر بلا کر پڑھانا شروع کیا۔ فی الحال باہر جانے پر پابندی تھی۔ آگے بھی خدا جانے کیا ہونا تھا۔ وہ کچھ سوچتی تو مزید پریشان ہوتی تھی اس لیے سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ پھپھو سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ نیمی بھی آ جاتی تھی اس کا دھیان بٹانے کے لیے اور اس کی بھابی بھی جس کے دل میں جو بھی تھا مگر وہ اس موضوع پر اسے کھول کر مزید الجھانا نہیں چاہتی تھی۔ ان کو یقین تھا کہ اب یہ شادی ہو کر رہے گی جس کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

☆☆☆

''امی وہ شادی کر رہا ہے۔ عباس شادی کر رہا ہے، وہ مجھے چھوڑ دے گا۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں فون رکھ کر ان کو بتانے لگی...... ''اس نے صرف اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ اس نے مجھے بتانے کے علاوہ کچھ بھی ضروری نہیں سمجھا۔ امی وہ مجھے چھوڑ دے گا۔'' وہ ٹوٹ ٹوٹ کر رو دی۔

''ہمت مت ہارو سمیرا...... جاؤ اس کے پاس جاؤ بتاؤ اس کے گھر والوں کو...... بتاؤ اس نے تمہیں دھوکا دیا...... جاؤ ہمت کرو۔'' وہ سر اٹھا کر ان کو دیکھنے لگی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور اس کے کولیگ کو فون کر کے اس کے گاؤں کا پتا معلوم کیا۔ یاد پڑا یہاں تو وہ پہلے بھی جا چکی تھی۔ رستے دیکھے بھالے تھے۔ اس نے اپنا بیگ تیار کیا۔ ضرورت کی ساری چیزیں رکھیں اور شام والی ٹرین میں بیٹھ گئی۔ وہ اب سب سے لڑنے، مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

وہ اب عباس سے قطعی نہیں ڈرے گی۔ اسے اپنا حق لینا ہے، اپنے بارے میں سوچنا ہے، اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔ رات تک وہ گاؤں پہنچ گئی۔ اسے گھر ڈھونڈنے میں وقت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

محلے میں ہلچل سی مچ گئی۔ عباس کی بیوی آ گئی ہے۔ وہ شادی شدہ ہے تو اس نے بدلا لیا ہے چچا سے، اپنی بہن کا...... وہ ایسا نکلا...... یقین نہیں تھا...... گمان نہیں تھا...... مختلف تاثرات گردش کر رہے تھے گھر میں شور سا پڑ گیا تھا۔ تہلکہ سا مچ گیا۔ شام کو چچی نے آ کر کہا کہ وہ ایبھا سے شادی کرے گا چاہے کچھ بھی ہو۔ بھلے اس کی پہلی شادی ہو، وہ اسے شہر میں رکھے گا ایبھا کو یہاں رکھے گا۔ وہ شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ مرد کیا دو دو شادیاں نہیں کرتے۔ چچی امی اور دادی کو پٹی پڑھا گئیں۔

وہ جو غصے سے بھری بیٹھی تھی ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا مگر بھیا چپ سے ہو گئے۔ بھائی کو سانپ سونگھ گیا جیسے۔ وہ خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی...... زندگی اس کی تھی اور فیصلے لوگ کر رہے تھے۔ پریشانی ان کی بنی ہوئی تھی وہ کتنوں پر بوجھ تھی...... آنسو لڑھک کر اس کے گال بھگو گئے۔ وہ کس سے بات کرتی اور کیا بات کرتی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ مختلف خیالات...... مختلف باتیں تھیں...... اور وہ چپ تھی، کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ نہیں پوچھا، اس کی جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

عباس اپنی ضد پر اُڑا تھا۔ گو کہ اس کی فیملی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قبول کر لیا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ دوسری شادی کرے گا۔ اس کا بھروسا ٹوٹ گیا۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے یا

## غزل

پھول یہ جتنے نیلے پیلے ہیں
سب کے سب پیار کے وسیلے ہیں
بچے گھر اور نوکری کا جواز
بھول جانے کے سارے حیلے ہیں
ان کو زندہ خدارا رہنے دو
زندہ رہنے کے جو وسیلے ہیں
یہ بہاروں کو ساتھ لائیں گے
پھول ہر سو جو پیلے پیلے ہیں
میری دھڑکن کی تال پر اے کنول
جتنے نغمے ہیں سب سُریلے ہیں

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

## نظم

میں یہ سوچ کر اُس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو
ہواؤں میں لہراتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ بٹھا لے گی مجھ کو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر منا لے گی مجھ کو
نہ دامن ہی پکڑا
نہ آواز ہی دی نہ واپس بلایا
میں آہستہ آہستہ
بڑھتا ہی آیا یہاں تک
کہ اس سے جدا ہو گیا میں
جدا ہو گیا میں!

مرسلہ: صوفیہ قمر، کراچی







www.paksociety.com

عباس کو چھوڑ جانا یا اس کے ساتھ یہیں رہ جانا...... اس نے فون کر کے ماں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اسے خوب بھڑکایا کہ عباس کو دوسری شادی کرنے نہیں دینی مگر وہ بے بس تھی۔ اسے پتا تھا عباس اس کی نہیں مانے گا بہتر ہے وہ یہاں سے چلی جائے یا پھر سب کچھ قبول کر لے۔ مگر ایبہا کا نام سن کر اسے دھچکا سا لگا۔ کیا وہ اپنی دوست کے حق پر ڈاکا ڈال چکی تھی۔ وہ اس کا بچپن کا منگیتر تھا۔ ایبہا کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ اس نے سوچا ہتھیار پھینک ہی دے مگر اس سے پہلے ایبہا سے ملنا ضروری تھا۔ بہت کچھ ایکسپلین کرنا تھا۔ وہ اس کے لیے اپنا شوہر چھوڑ دے گی اسے بتانا تھا...... وہ کس منہ سے ہمت جمع کر کے اس کے گھر گئی تھی۔ ایبہا اسے دیکھ کر حیران تھی۔

☆☆☆

''مجھے نہیں پتا تھا ایبہا میرا یقین کرو۔ خدا کے لیے ...... ایبہا میں چھوڑ کر جا رہی ہوں...... اپنا سب کچھ، مجھ سے خفا مت ہونا۔ مجھے اپنا مجرم مت سمجھنا۔ ایبہا میرا قصور نہیں ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ رہی تھی۔

''میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔ تمہیں کچھ بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں...... میری صرف منگنی تھی، تمہارا شوہر ہے وہ...... میں بات کروں گی سمیرا...... میں اس شادی سے انکار کر دوں گی۔ تم جاؤ گھر، کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہیں رہنا ہے، بے وقوفی مت کرو۔ اپنے لیے میں بات نہیں کر سکی مگر اب تمہارے لیے میں بات کروں گی چاہے لڑنا پڑے مجھے سب سے۔'' اس نے اس کے ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

وہ جیسے چوری چھپے گئی تھی اسی طرح واپس آ گئی بیچ والے دروازے سے، اسے اب کچھ بھی خود سے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یقین تھا ایبہا نے جو کہا ہے اس کا مان ضرور رکھے گی۔ اسے عباس سے شکایت تھی کسی اور سے نہیں۔

☆☆☆

''بھابی...... مجھے آپ کی مدد چاہیے۔'' وہ پہلی مرتبہ ان سے درخواست کرنے ان کے کمرے میں آئی۔ ''میری کہیں ہو یا نہ ہو مگر یہ شادی رکوا دیں۔ پہلے کی بات اور تھی مگر اب مجھے اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی برباد نہیں کرنی۔ مجھے پتا ہے سمیرا اکیلی ہے، ماں کے علاوہ اس کا کوئی نہیں۔ میں اس کا سکون برباد نہیں کرنا چاہتی۔ آپ بھائی سے بات کریں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے بس یہ شادی رکوا دیں۔ میں نہیں کہوں گی کہ میری کہیں اور کریں۔ میں نہیں کہوں گی کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ بس آپ یہ شادی کینسل کروا دیں۔'' اسی وقت وہ واش روم سے نہا کر باہر نکلے تھے اس کی بات سن کر وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ بات مکمل کر کے کمرے سے چلی گئی اور سامنے کھڑے شوہر کو انہوں نے بڑی امید سے دیکھا تھا سب کچھ سن تو وہ چکے تھے۔ وہ کیا کہتی۔ وہ تولیے سے بال خشک کر کے قمیص پہنتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ ناسمجھی سے ان کے پیچھے آئیں۔

☆☆☆

عباس نے خوب تماشا کیا تھا مگر بھائی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ صاف صاف انکار کو امی اور دادی کوئی بھی اقرار میں نہ بدل سکا۔ چچی اور آپا نے دس چکر لگائے گو کہ امی رضامند تھیں مگر بیٹے کے انکار کے آگے بے بس تھیں۔ جس کا غصہ بہرحال ایبہا پر ہی نکالا۔ عباس نے دھمکیاں دیں۔ تماشا کیا...... مگر آخر کار چپ ہو گیا۔ اسے ایبہا سے سروکار نہیں تھا بس ضد تھی کہ وہ اس سے شادی کر کے اس کا غرور مٹی میں ملائے گا۔ وہ اپنے منصوبے میں تو ناکام ہو ہی گیا تھا کامیاب ہوتے ہوئے۔ سارا غصہ سمیرا پر تھا جس نے

www.paksociety.com

علین وقت پر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس نے صاف طور پر اپنے چچازاد کو دھمکایا کہ اگر ایسا اسے نہ ملی تو وہ اس کی کہیں اور ہونے بھی نہیں دے گا اور یہی ضد تھی جب بھیا نے اس سے پوچھے بغیر دادی سے بات کر کے اور امی کو صرف اطلاع دے کر اپنی بیوی کو کہا کہ مراد کے لیے اپنی ماں کو آنے کا کہے۔ ان کی تو جیسے مراد برآئی تھی۔ مٹھائی کا ٹوکرا لیے وہ چند گھنٹوں میں آپہنچیں۔ امی گو ناراض سی تھیں مگر انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ عباس کے کرتوت تو وہ چند دنوں میں دیکھ چکی تھیں مراد زیادہ پسند نہیں تھا مگر عباس سے... بہرحال مناسب تھا یہ تو وہ سمجھتی تھیں۔

دادی دل سے خوش تھیں۔ پھپھو نے اس چھوٹی سی تقریب میں دل سے شرکت کی سمیرا پوری مخالفت کے باوجود بھی دروازہ پھلانگ کر آگئی اس کے نکاح میں شریک ہونے کے لیے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا مراد سے گو کہ بہت سے شکوے تھے مگر دل میں.... بہرحال اک جگہ تو تھی ہی اس کی۔

رخصتی عید سے ایک دن پہلے رکھی گئی تھی اب کچھ تیاریاں باقی تھیں۔ اس رشتے سے سب سے زیادہ خوش اس کی بھابی اور سہمی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی اپنی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی مگر سکون کا اک احساس تو بہرحال تھا جو اندر تک سرایت کر گیا تھا دل کے بہت اندر......

☆☆☆

"اظہار محبت کے پھولوں کو پانی دیتا ہے اور اظہار کے بغیر محبت کے پودے مرجھا مرجھا کر کُملا جاتے ہیں۔ تم نے کبھی اظہار ہی نہیں کیا تھا تو محبت کا پودا کیسے پروان چڑھتا۔" منڈیر پر دیا جلا کر اس نے شکایتی انداز میں مراد کا دمکتا ہوا چہرہ دیکھا۔ آنکھوں پر ہلکی سی روشنی پڑنے پر اس کے سارے احساسات کھل رہے تھے، وہ مسکرا رہا تھا اس کی بات پر۔

"تم نے کبھی محبت کی گلی میں قدم رکھنے کے لیے رستہ ہی نہیں دیا تھا۔ میں دیوانہ وار گھومتا رہا تمہارے پیچھے اور تم ہر دفعہ مجھے روند کر گزر جاتیں۔" ایک شکوہ اس جانب سے بھی تھا جو بہرحال جاندار تھا۔

"میں نے تمہیں کسی قید خانے میں تو بند نہیں کیا تھا جہاں سے تمہاری زبان بندی کی گئی ہو۔ محبت تو بہرحال آزاد ہی ہوتی ہے اگر سمجھو تو.........." اسے بہرحال اختلاف تھا۔

"مگر اب تو تم میری قید میں ہو نا!" ہلکے سے ہاتھ دبا کر کہا گیا۔

"محبت آزاد ہوتی ہے۔ اسے قبول نہیں ہے قید۔" ہاتھ ہلکے سے چھڑا لیا۔

"تم اور تمہاری فلاسفی......" وہ باتوں میں اس سے کبھی جیت نہ پاتا سو سر جھٹک دیا۔

"محبت بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے مراد، تھک مت جانا میرے خوابوں، خواہشوں نے اگر یہ ہاتھ تھاما ہے تو پوری ذمے داری کے ساتھ میرے خوابوں میں میرے ساتھ رہنا، گھبرا مت جانا، اور تنگ دل مت ہو جانا۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر درخواست کی، یہ ڈر اس کے اندر کہیں بیٹھا ہوا تھا۔

"مانا کہ منزل بہت کٹھن ہو یا راستہ طویل، پر میری محبت کبھی تمہارے خوابوں، خواہشوں کو قید نہیں کرے گی چونکہ محبت تو آزاد ہے نا۔" اب کی بار اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر وہ مسکرا دیا تو اس کے اندر گہرا یقین اُترتا چلا گیا...... اس یقین میں محبت کی روشنی جگمگائی تھی۔ جیسے عید کا چاند جگمگاتا ہے۔ ان دونوں نے چاند کو دیکھ کر دعا مانگی تھی اور وہ باقی کام مکمل کرنے... اندر بڑھی کہ عید کی تیاری ابھی باقی تھی۔ محبت کا چاند مسکرانے لگا۔ صبح کا سورج بہت اُجلا اور شفاف تھا، ان کی محبت کی طرح......!



# فریبِ محبت

شمیم فضلِ خالق

بارش تواتر سے ہو رہی تھی...... ساری رات میں بارش کا میوزک سنتی رہی تھی۔ بہت دھیمے دھیمے انداز میں بارش کی بوندیں برستی رہیں۔ صبح میں عجلت میں اٹھی کہ شاید دیر ہوگئی ہے۔ فجر کی نماز کے بعد میں دوبارہ سو جاتی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنی یہ عادت چھوڑ نہیں سکی۔ اس وقت بھی دیر ہوگئی تھی۔ ابا جی برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"سوری ابا جی۔" میں شرمندگی سے بولی۔

www.paksociety.com

"میں ابھی ناشتا بنا دیتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔" ابا جی اپنے مخصوص نرم اور میٹھے لہجے میں بولے۔ "میں بارش اور اخبار دونوں انجوائے کر رہا تھا۔ سنی اور رابعہ ابھی تک نہیں اٹھے کیا؟"

"نہیں ابا جی۔" میں کچن کی طرف جاتے جاتے بولی۔ "دونوں بہن بھائی رات کو بہت دیر سے سوئے تھے۔ ویسے بھی آج سنڈے ہے۔ آج تو وہ دوپہر سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔"

میں نے کچن میں جا کر ابا جی اور اپنا ناشتا تیار کیا۔ ابا جی ڈبل روٹی کے دو سلائس لیتے تھے ساتھ تھوڑا سا مکھن لے لیتے۔ میں البتہ مختلف ناشتا کرتی تھی، کبھی پراٹھا تو کبھی توس مکھن جیم کبھی انڈے لے لیتی پراٹھے کے ساتھ...... اس وقت میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس لے کر ساتھ انڈا فرائی کیا اور ابا جی کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گئی۔ بارش بڑے ہلکے پھلکے انداز میں برس رہی تھی۔ سردیوں کی بارش کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے یہ گرمیوں کے بارش کی طرح چھم چھم دھاڑ مچاتے ہوئے نہیں آتی۔ بڑے پُرسکون انداز میں جل تھل کر دیتی ہے لیکن محسوس نہیں ہونے دیتی۔

"ابا جی ساری رات بارش برستی رہی ہے اور لگتا ہے اب بھی رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ہاں......" ابا جی اخبار ایک طرف رکھ کر بولے۔ "بارش زمین کی آبادی ہے...... لیکن اس کی زیادتی سیلاب کی صورت میں بربادی بھی لے آتی ہے۔ بس...... خدا رحم کرے۔" میں نے ابا جی کے لیے سلائس پر مکھن لگا کر ان کی پلیٹ میں رکھا۔ ابا جی میری طرف دیکھ کر بولے۔

"زمان کا فون نہیں آیا...... دیر ہو گئی ہے ہمیشہ تو اس وقت فون کر لیتا ہے۔"

"موصوف سو رہے ہوں گے۔" میں نے ہنس کر بے پروائی سے کہا۔

"کتنی مدت گزر گئی ہے میرے لعل کو دیارِ غیر میں ملازمت کرتے ہوئے۔ ایک فون کا رابطہ رہ گیا ہے۔ جس دن اس کا فون نہیں آتا میں سارا دن ڈسٹرب رہتا ہوں۔" ابا جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"جی ابا جی...... لیکن وہ فون کرنے میں سستی نہیں کرتے ہر روز تو ان کا فون آ جاتا ہے۔" اسی دوران فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"لیجیے آگیا آپ کے لاڈلے کا فون۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"انعم بیٹا! جلدی جاؤ کہیں کٹ نہ جائے فون۔" ابا جی کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی، وہ جلدی سے بولے۔ ہر روز کہنے سننے کو کتنی باتیں ہوتی تھیں سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں نے سنی اور رابعہ کو فون دیا اس دوران وہ دونوں اٹھ چکے تھے اور باپ سے بات کرنے کو بے چین تھے۔ میں نے وہیں سے ابا جی کو آواز دی۔

"ابا جی...... آپ بات کریں گے؟"

"نہیں بیٹا...... بس میری دعائیں کہہ دو اسے۔" ابا جی نے وہیں سے جواب دیا...... میں اپنا ناشتا کرنے باہر آ گئی تو ابا جی بولے۔

"فون کال پر بہت پیسے آتے ہیں، بچوں سے کہو باپ سے مختصر بات کریں۔"

"میری کہاں مانتے ہیں ابا جی...... نہ باپ نہ بچے۔" میں نے اپنی چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

میری بات پر ابا جی ہنس دیے، ان کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا اور وہ بڑی رغبت سے ناشتا کرنے لگے تھے۔ میں نے انہیں مطمئن دیکھا تو میرے اندر تک آسودگی پھیل گئی۔ میں کچن میں جا کر اپنے کام نمٹانے لگی۔ بچوں کے لیے آج ان کی پسند کا ناشتا بھی بنانا تھا۔ میں نے سوچا وہ باپ سے بات کر کے فریش ہو جائیں گے تو زیادہ رغبت سے ناشتا کریں گے ورنہ تو روز انہیں زبردستی ہی ناشتا، کھانا وغیرہ کھلایا کرتی تھی۔ سات سالہ سنی اور پانچ سالہ رابعہ کھانے پینے کے معاملے میں بڑے سُست تھے۔ رابعہ کو تو میں چھوٹے بچوں کی طرح نوالے منہ میں دیا کرتی تھی تب کہیں جا کر وہ کھانا کھاتی۔

آج صبح صبح باپ سے بات کر کے وہ بہت زیادہ خوش تھے، ناشتے کے دوران بھی وہ دونوں اپنے باپ کی باتیں کر رہے تھے۔

"مما! میں نے پاپا سے ایروپلین کی فرمائش کی ہے، اُڑنے والا بہت بڑا ایروپلین۔" سنی اپنے ہاتھوں کو جہاز کی طرح حرکت دیتے ہوئے بولا...... میں اسے سمجھانے لگی۔

"سنی بیٹا...... آپ اب بڑے ہو گئے ہو۔ پاپا سے اسکول کی کوئی چیز مانگا کرو۔ کھلونے تو آپ کے پاس بے شمار ہیں۔" سنی نے منہ بنا لیا...... وہ ذہنی طور پر گویا اب بھی بچہ تھا۔ کھلونوں کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

"مما! میں نے پاپا سے باربی ڈول کی فرمائش کی ہے۔ پاپا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے باربی ڈول جلد بھجوا دیں گے۔" رابعہ بولی۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔" میں نے محبت سے اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "بس اس خوشی میں تم خوب اچھی طرح ناشتا کرنا تا کہ تم میں پاور آئے اور تمہارے پاپا خوش ہوں۔"

"اچھا مما۔" وہ سعادت مندی سے میرے قریب بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔

☆☆☆

کچھ دن بعد ہی پارسل آگیا...... اظہر بھائی لائے تھے...... ان کا کوئی دوست زمان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ پاکستان آ رہا تھا تو زمان نے بچوں کی فرمائشیں پوری کر دیں...... بچوں کے ساتھ ساتھ پارسل میں میرے لیے گرم کپڑے تھے۔ ابا جی کے لیے گرم شال تھی، ابا جی اظہر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ بچے اپنے کھلونے پا کر بہت خوش تھے۔ چائے بناتے ہوئے میرے آنسو کسی سیلاب کے مانند میری آنکھوں سے بہنے لگے۔ زمان کی یاد میرے دل کے اندر کسی نوکیلے تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔ کیسے میں نے خود کو قابو کیا...... یہ ایک الگ داستان ہے۔ اظہر بھائی نے ابا جی سے بات کرتے کرتے غور سے میری سرخ آنکھوں کو دیکھا اور ان کے چہرے پر یک بیک اداسی چھا گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ابا جی سے صحیح طرح بات کی نہ ہی ہمیشہ کی طرح میرے ہاتھ کی بنی چائے کی تعریف کی۔ وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئے تھے حالانکہ میں اپنے دل کا درد چھپا کر ان کے پاس بیٹھ کر کچھ نہ کچھ بول ہی رہی تھی اور ساتھ ہنس بھی رہی تھی لیکن ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا اور اسی اداس موڈ میں وہ رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

میری اور زمان کی لَو میرج نہیں تھی لیکن شادی کے بعد جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ نہ تو وہ میرے بغیر رہ سکتے تھے نہ میں ان سے دوری برداشت کر سکتی تھی۔ مجھے ابا جی نے پسند کیا تھا...... اُس دن میں اپنی کزن فریحہ کی شادی میں گئی تھی۔ رات کا فنکشن تھا۔ کافی بجے کے بعد کھانے کا دور چلا۔ جیسے ہی خوانوں سے ڈھکن اٹھائے گئے ایک ہجوم کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس ہجوم میں میں بھی تھی۔ کھانے کی خوشبو ہر کسی کی بھوک کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ کافی دقتوں سے ہجوم میں جگہ بناتے ہوئے میں نے ہر ڈش سے کچھ نہ کچھ اپنی پلیٹ


www.paksociety.com

میں ڈالا اور نسبتاً ایک پُرسکون جگہ پر کھڑی ہو کر اپنے کھانے کو انجوائے کرنے لگی کہ اچانک میری نظر ایک اسمارٹ سے بوڑھے آدمی پر پڑی۔ وہ کرسی پر اکیلے بیٹھے تھے۔ ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ اتنے ہجوم میں جا کر اپنے لیے کھانا لانا افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ سو لوگوں کے ہاتھوں میں کھانے سے بھری پلیٹیں دیکھ دیکھ کر اپنی بھوک کو بہلا رہے تھے۔ مجھے ان پر ترس بھی آیا اور میرا دل بھی نہیں چاہا کہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر کھانا کھاؤں، سو میں ان کی طرف جا کر بولی۔

''انکل! میں آپ کے لیے کھانا لاؤں؟'' وہ چونک گئے...... پھر نرم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولے۔

''نہیں بیٹا! جب کھانے پر رش کم ہوگا تو میں خود لے لوں گا۔''

''نہیں انکل! یہ رش تو تب ہی ختم ہوگا جب کھانا بھی ختم ہو جائے گا۔'' میں نے اصرار کیا اور اپنی بات کے خاتمے پر ہنس دی تو وہ بھی ہنس دیے اور قدرے شرارت سے بولے۔

''اب اتنا بھی کمزور نہ سمجھو...... جب شادی میں آسکتا ہوں تو کھانا بھی رش میں گھس کر لاسکتا ہوں۔'' وہ اپنی سیٹ سے اٹھنے لگے تو میں نے اپنی آدھی کھائی پلیٹ ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ پکڑیں، میں ابھی لاتی ہوں آپ کے لیے کھانا۔''

''لگتا ہے ہماری بیٹی جنگ لڑ کر آئی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد جب میں بڑی سی پلیٹ میں الم غلم ڈال کر لے کر آئی تو وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''اتنے ہجوم سے کھانا لانا کسی طرح بھی جنگ لڑنے سے کم نہیں ہے انکل۔'' اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے میں نے ہنس کر کہا۔

انکل میرا شکریہ ادا کر کے کھانا کھانے لگے۔ اس دوران میرے اور ان کے بیچ تعارف کا سلسلہ چلا اور لمحے بھر میں، میں ان کے بارے میں اور وہ میرے بارے میں سب کچھ جان گئے۔ میری کزن ملیحہ کا شوہر ان کے بیٹے زمان کا دوست تھا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سب دوستوں کو اپنے بیٹوں کی طرح مانتے تھے سو ان کی خوشی میں شریک ہونے آگئے تھے۔ یہاں زمان اپنے دوستوں میں مگن ہو کر انکل کو بھول گئے تھے۔ غالباً کھانا کھاتے ہوئے زمان کو یاد آگیا تھا کہ ان کے والدِ محترم بھی ان کے ساتھ آئے ہیں۔ جب وہ ہانپتے ہوئے آئے تو میں اور انکل اتنے شیر و شکر ہو کر بات چیت کر رہے تھے کہ انہیں حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

''ابا جی...... وہ، وہ......''

''ہماری بیٹی نے ہمیں بھوکا نہیں رہنے دیا۔'' انکل نے ہنس کر خالی پلیٹ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

زمان نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن میں ان کی طرف دھیان دیے بغیر انکل کو پانی کا گلاس دے رہی تھی۔ ایسے واقعے میری زندگی میں بے شمار تھے۔ مجھے بوڑھے لوگوں پر بہت رحم آتا اور میں حتی الامکان ان کی مدد کرتی...... کہیں کوئی بوڑھا فقیر نظر آتا تو میں جب تک اپنا پرس خالی نہ کر دیتی مجھے چین نہ آتا...... اس لیے یہ واقعہ بھی میں بھول بھال گئی تھی اور شاید کبھی یاد بھی نہ آتا اگر انکل اچانک ہمارے گھر نہ آجاتے۔

انکل کو میں اپنے گھر میں دیکھ کر بہت حیران ہوئی لیکن پھر مجھے یاد آگیا کہ جب ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے تو انکل نے تفصیل سے میرے متعلق پوچھا تھا اور میں سدا کی باتونی...... انہیں ایک ایک بات بتادی تھی کہ ہمارا چھوٹا سا بنگلا ڈیفنس میں ہے G.12 نمبر ہے اس کا۔ میرے ماں باپ ہیں ایک بھائی ہے اظہر بھائی، وہ مجھ سے بڑے ہیں لیکن ہم دونوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے چھوٹے سے گھر





میں بہت سکھ اور بہت شانتی ہے۔

''جس گھر میں تم جیسی بیٹی ہو وہاں سکھ اور شانتی ہی ہو سکتی ہے، دکھوں کا وہاں کیا کام۔'' انکل نے ہنس کر مجھے دیکھا اور محبت سے بولے تھے۔

''انکل...... کیا آپ کی بیٹی نہیں ہے؟'' میں نے جلدی سے ان سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' وہ نرم لہجے میں بولے تھے۔ ''زمان میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میری دنیا اسی سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہوتی ہے۔ میری جیون ساتھی یعنی زمان کی ماں نے زمان کو صرف چار سال کا چھوڑا اور دوسری زچگی میں اللہ کو پیاری ہوگئی اور اس کے بعد میری زندگی صرف زمان کے لیے وقف ہوگئی ہے۔'' انکل کو دیکھ کر مجھے اپنی کہی ساری باتیں یاد آگئیں...... انکل نے جو بتایا تھا وہ بھی سب یاد آگیا۔

''ہماری بیٹی ہمیں دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہوگئی ہے۔ کیا ہم اپنی بیٹی کے گھر نہیں آسکتے؟''

''کک...... کیوں نہیں انکل۔'' میں شرمندہ ہو کر جلدی سے بولی۔

''آپ بیٹھیے...... میں ابو کو بلا کر لاتی ہوں۔''

پل بھر میں میرے ابو اور انکل اتنے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے کہ ان کو دیکھ کر یہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ میری امی بھی انکل سے ملنے آگئیں۔ انکل کافی دیر ہمارے گھر میں رہے۔ ہم سب نے مل کر چائے پی...... اور جاتے جاتے انہوں نے زمان کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ ابو تو بوکھلا سے گئے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور امی کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ ابھی اس مسئلے پر سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

''انعم بہت محبت والی بچی ہے اور مجھے بہو کے روپ میں ایسی بیٹی کی ضرورت ہے جو میرے اجڑے گھر کو دوبارہ سے گھر بنائے اگرچہ میرے گھر میں اسے زیادہ آسودگی تو نہیں ملے گی کہ مالی طور پر ہم آپ کے برابر نہیں ہیں لیکن میں اسے بہت سارا پیار دوں گا اور میرا بیٹا زمان اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھے گا۔'' انکل نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''انعم ہماری اکلوتی بیٹی ہے اور اس کے متعلق ہم نے کبھی اس طرح سوچا نہیں ہے۔ پہلے تو ہمیں خود کو اس کے لیے آمادہ کرنا پڑے گا بعد میں ہم کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں۔'' ابو گڑبڑا کر بولے۔

''بیٹیاں پانچ ہوں یا ایک...... ان کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر کا کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہی والدین کی ذمے داری ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال میں آپ سے ابھی کے ابھی جواب نہیں چاہتا ہوں...... آپ اس سلسلے میں سوچیے میں ہفتہ دس دن بعد پھر...... آؤں گا۔'' انکل بردباری سے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے۔ اپنی بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں کچن سے کمرے میں آرہی تھی کہ ان کی باتوں نے مجھے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کیا اور میری نظروں کے سامنے زمان کو لا کھڑا کیا...... اونچا لمبا قد، گھنے اور کالے بال متناسب خدوخال، سانولا رنگ، وہ سچ مچ مردوں جیسا حسن رکھتے تھے اور جب تک انکل کمرے سے باہر نکلتے میں جھپاک سے کچن کے اندر گھس گئی۔

ابو اور امی کی خفیہ کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ کچھ اڑتی اڑتی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ امی زمان کے رشتے کے خلاف تھیں کہ ان کی مالی حالت مضبوط نہیں تھی۔ اظہر بھائی اور ابو کا کہنا تھا کہ دنیا میں شرافت بہت بڑی چیز ہے دولت تو ہاتھ کا میل ہے۔ اظہر بھائی بہ نفسِ نفیس زمان سے مل چکے تھے۔ اس دوران ابا جی دو تین بار اپنا جواب لینے آئے لیکن ان سے مزید وقت مانگا گیا۔ اظہر بھائی نے مجھ سے بھی تفصیلاً بات کی اور آخری حل یہ سمجھا گیا کہ اگر میں راضی ہوں گی تو ٹھیک ہے ورنہ بات ختم ہو جائے



www.paksociety.com

گی۔ میرے لیے دو تین رشتے اور بھی آئے تھے۔ اظہر بھائی نے لڑکوں کے فوٹوز کے ساتھ ان کی بھی ساری ہسٹری بتادی تھی لیکن میں جب بھی اس بارے میں سوچتی زمان کی شبیہہ نظروں کے سامنے آجاتی۔ آخر کار میں نے زمان کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس طرح میں زمان کی زندگی میں آگئی۔

☆☆☆

زمان تو مجھے پا کر خوش تھے ہی لیکن ابا جی کی خوشی کا تو ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بار بار کہتے کہ انہیں زمان کے لیے ایسی ہی لونگ، کیئرنگ اور محبت کرنے والی لڑکی چاہیے تھی جیسی کہ انعم ہے۔ زندگی بڑے ہلکے پھلکے انداز میں رواں دواں تھی۔ ابا جی اور زمان مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دے رہے تھے۔ زمان ایک پرائیوٹ کمپنی میں اچھے عہدے پر تھے۔ ہم تین افراد تھے، کم تنخواہ... میں بھی گزارہ ہو رہا تھا لیکن جب یکے بعد دیگرے سنان اور رابعہ ہماری زندگی میں شامل ہوگئے تو اخراجات بڑھ گئے۔ زمان پریشان رہنے لگے۔ اسی دوران مجھے یکے بعد دیگرے اپنے والدین سے جدائی کا دکھ سہنا پڑا۔ امی کو مسلسل بخار کی وجہ سے کھونا پڑا اور ابو کو ہارٹ اٹیک نے لمحے بھر کی مہلت نہیں دی۔ یہ دور مجھ پر بہت کٹھن تھا۔ میں خود سے اپنے گھر سے اور اپنے بچوں سے بے گانہ ہوگئی تھی۔ دن رات آنسو بہانا میرا مشغلہ بن گیا تھا۔ میں اب بھی سوچتی ہوں کہ اگر زمان کی بے پایاں محبت اور ابا جی کی خصوصی توجہ اور شفقت نہ ہوتی تو میں غم کی اس دلدل سے کبھی نہیں نکلتی...... وقت کے ساتھ ساتھ میں نے امی ابو کی جدائی قبول کرلی۔ اس میں اظہر بھائی کی محبتوں کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہر روز میری خبر گیری کے لیے آجاتے، حالانکہ ابو نے وفات سے 2 ماہ قبل اظہر بھائی کی شادی اپنی بھانجی سے کردی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ بھائیوں کی جب شادی ہوجاتی ہے تو وہ بہنوں کو بھول جاتے ہیں لیکن اظہر بھائی کے لیے یہ مقولہ غلط ثابت ہوگیا۔ میں بھی اظہر بھائی سے بہت محبت کرتی تھی کہ اب یہی میرا میکا تھا۔

بچے بڑے ہونے لگے تو زمان کا باہر جانے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا دراصل انہوں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ انہیں اچھی جاب مل سکے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان میں رہنا اب ان کے نصیب میں نہیں۔ میں زمان کے جانے کے بارے میں سوچتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میرا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ میں زمان کی محبتوں کے بنا کیسے جی پاؤں گی کہ میرے لیے تو زمان کی محبت ہوا اور پانی جیسی تھی۔ ابا جی جانے خوش تھے یا نہیں لیکن انہوں نے زمان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی کوئی کوشش تو میں نے بھی نہیں کی تھی لیکن میرے اندر شدید قسم کی کش مکش جاری تھی لیکن میں زمان کی تاویلوں کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ بچے اسکول کی ایج تک پہنچ چکے تھے لیکن ہماری استطاعت نہیں تھی کہ انہیں اچھے اسکول تو چھوڑ کسی درمیانے درجے کے اسکول میں داخلہ دلا سکیں جبکہ اپنے بچوں کے لیے ہمارے خواب بہت اونچے تھے۔ زمان جس دن جا رہے تھے وہ ساری رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ میری آنکھوں میں جیسے سمندر کا پانی جمع ہوگیا تھا، میں ساری رات آنسو بہاتی رہی اور زمان ڈھیروں تسلیوں اور دلاسوں سے میرے آنسو چنتے رہے۔ ان کا مڈل ایسٹ جانا جتنا کٹھن تھا...... ان کے بغیر خالی گھر میں رہنا اس سے کہیں زیادہ کٹھن تھا۔ ہر جگہ مجھے زمان کی شبیہہ نظر آتی تھی۔ ابا جی کئی کئی دن خاموش لیٹے رہتے۔ ان کی بھوک کم ہوتی جا رہی تھی۔ بچے بھی گم صم رہنے لگے تھے۔ آخر کار مجھے ہی خود کو سنبھالنا پڑا۔

''گھر کی روٹین واپس لانے کے لیے تمہیں





کوشش کرنی ہوگی...... کہ قربانی گھر کی مالکن ہی دیتی ہے۔'' اظہر بھائی روزانہ آتے اور مجھے سمجھاتے۔

سو خود کو سنبھال کر میں نے ایک بار پھر سے خود کو روٹین کے کاموں میں مصروف کرلیا اور وہی روٹین شروع کردی جو زمان کے یہاں ہوتے ہوئے تھی۔ میری کوششوں سے جلد ہی گھر کا ماحول سیٹ ہوگیا۔ ابا جی بھی ہنسنے بولنے لگے۔ بچے بھی اپنے کھیل کود اور پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ اس دوران جب زمان کا فون آجاتا تو گویا گھر کی خوشیاں دوبالا ہوجاتیں۔ بچے مجھے زمان کی بات سننے نہ دیتے۔ میرے ہاتھوں سے ریسیور چھینتے۔ ابا جی کو تو موقع ہی نہیں ملتا بیٹے سے بات کرنے کا۔ وہ فون پر بات کرنے کے زیادہ شوقین بھی نہیں تھے۔ شروع میں ایک دو بار انہوں نے زمان سے خود بات کی تھی۔ اس کے بعد ہماری باتیں سنتے اور مسکرا مسکرا کر ہماری باتوں سے ہی نتائج اخذ کرتے۔ بعد میں مجھ سے تفصیل پوچھتے رہتے...... میں ان کی پسند کے مطابق جوابات دیتی۔ مثلاً زمان وہاں بہت خوش ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کی ڈیوٹی بھی سخت نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہاں آکر میری نماز کی عادت بھی پختہ ہوگئی ہے۔ ان میں سے بہت سی باتیں میں خود سے کہہ دیتی لیکن ابا جی میری ان باتوں سے خوش ہوجاتے اور کئی کئی دنوں تک سرشار رہتے۔ حالانکہ زمان اپنے گھر کو، مجھے، ابا جی کو اور بچوں کو بہت مِس کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی بے تابیوں کی داستان سناتے ان کی آواز گلوگیر ہوجاتی۔ میرے آنسو میرے دل کے اندر گرتے رہتے لیکن میں اپنے لہجے کو بشاش بنا کر موضوع بدل دیتی... اور بچوں کی شرارتوں کے قصے سنا کر ان کی افسردگی کو دور کرتی۔

فون کی گھنٹی نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ دل اس قدر بجھ گیا تھا کہ کسی بات میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بس اکیلے رہنے اور رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ ہی میں فون سننے کمرے میں چلی گئی۔ اگر دو چار بار مزید بیل ہوتی تو ابا جی آوازیں دینے لگتے۔

''فون اٹھاؤ، کہیں زمان کا نہ ہو۔'' میں نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف اظہر بھائی تھے۔

''انعم! بہن کیسی ہو؟'' اظہر بھائی کی نرم اور میٹھی بات پر میرے دل کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ کوشش کے باوجود میرے منہ سے سسکی نکلی...... وہ تڑپ اٹھے۔

''انعم...... تم، تم رو رہی ہو؟'' ان کی آواز میں

## غزل

تارے گننے کے زمانے اب کہاں
عاشقی کے وہ ترانے اب کہاں

کون مرتا ہے کسی کے واسطے
لیلیٰ، مجنوں کے فسانے اب کہاں

وہ نہ دریا اور نہ گہری چاہتیں
سوہنی اور ماہی دوانے اب کہاں

کون چیرے گا پہاڑوں کے جگر
تیشۂ فرہاد جانے اب کہاں

آنکھوں آنکھوں میں جو ہوتے تھے کبھی
ہیر، رانجھے کے نشانے اب کہاں

سامنے آجائے یوسف اور بس
وہ زلیخا کے بہانے اب کہاں

جاؤ، جاؤ عاشقِ خانمؔ کہ وہ
بھولے پن کے سب زمانے اب کہاں

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

www.paksociety.com

آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''اظہر بھائی...... آپ کو پتا تو ہے۔ آپ میرے درد کو جانتے ہیں پھر بھی......'' میں سسکتے ہوئے بولی۔ اظہر بھائی کچھ نہ بولے۔ ایک سرد ......آہ ان کے ہونٹوں سے پھسل گئی۔ میں نے صحن کے کونے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ابا جی کو دیکھا۔ بچے بھی ان کے قریب بیٹھے کھیل رہے تھے اور ساتھ ساتھ شور مچا رہے تھے کہ میری آواز ان تک پہنچنی مشکل تھی۔ اظہر بھائی کہہ رہے تھے۔

''انعم! کیا مجھ سے بچوں کے سلسلے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے؟''

''نن...... نہیں اظہر بھائی۔'' میں سسکیوں کے درمیان رک رک کر بولی۔ ''آپ نہ ہوتے تو میں مرجاتی ......زندہ نہ رہتی لیکن اظہر بھائی یہ سب کب تک چلے گا۔ کب تک آخر کب تک ؟''

''کچھ پتا نہیں۔ میں خود سوچ سوچ کر پاگل ہورہا ہوں۔'' اظہر بھائی گلوگیر آواز میں بولے۔

میں مزید خود کو سنبھال نہیں سکتی تھی اگر اظہر بھائی سے مزید بات کرتی تو میری چیخیں نکل جاتیں اور وہ راز فاش ہوجاتا جو کسی انمول اور قیمتی شے کی طرح میں نے اپنے دل میں سنبھالا ہوا تھا۔ دوپہر کو ابا جی اور بچوں کو معمول کے مطابق کھانا کھلا کر میں اسٹڈی روم میں گئی۔ ابا جی اپنے کسی دوست سے ملنے چلے گئے تھے بچوں کو میں نے اپنے کمرے میں سلا دیا...... بچوں کو دوپہر کے وقت میں ضرور ایک دو گھنٹے کے لیے سلا دیا کرتی تھی۔ گھر خالی تھا۔ میں برآمدے میں بیٹھ کر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

''زمان آجائیں زمان...... پلیز...... آجائیں، میں مزید برداشت نہیں کرسکتی...... آپ نے جو وعدہ مجھ سے لیا ہے، میں اس کا بوجھ سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی ہوں۔ مجھے اس بوجھ سے آزاد کردیں زمان۔'' میں نے اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا تاکہ آواز زیادہ دور تک نہ جائے اگر زمان سچ مچ فون کرتے اور میری یہ آہ وبکا سنتے تو شاید وہ اگلی فلائٹ سے واپس آجاتے...... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس آجاتے لیکن وہ تھے کہاں وہ تو ایسی جگہ گئے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا...... مجھے زمان کی وہ آخری باتیں یاد آگئیں۔

زمان آج سے چند ماہ قبل ہی وفات پاگئے تھے۔ وہ دن بہت اداس سا تھا۔ جانے کیوں میرا دل صبح سے حد درجہ افسردہ تھا۔ خواہ مخواہ آنسو امڈنے کو بے قرار تھے۔ ابا جی گھر پر نہیں تھے، بچے اسکول گئے تھے، میں گھر میں اکیلی تھی۔ کل ہی زمان سے میری ڈھیروں باتیں ہوئی تھیں وہ سرشار انداز میں مستقبل کے ڈھیروں منصوبے بنا رہے تھے۔ میں بھی مسکرا مسکرا کر ان کی باتوں کی تائید کررہی تھی۔ اس کے باوجود کہ میں نے کل زمان سے بہت سی باتیں کی تھیں پھر بھی میرا دل اداس تھا اور اسی وقت وہ بدقسمت فون آگیا جس نے میری دنیا اندھیر کردی۔ کسی کا فون تھا، وہ عجلت میں کہہ رہا تھا۔

''آپ مسز زمان بول رہی ہیں نا؟''

''جی...... ہاں آپ کون؟''

''دیکھیں زمان کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے، اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ لیجیے بات کیجیے، میں نہ سمجھنے والی کیفیت میں ریسیور کو گھورتی رہی کہ زمان کی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی آواز سنائی دی۔

''سنو انعم...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں، تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بارے میں ابا جی کو اور بچوں کو نہیں بتاؤ گی۔ میں یہ وعدہ اظہر سے بھی لے چکا ہوں۔ بولو...... انعم...... وعدہ کرو۔'' مجھے ایسا لگا جیسے میرے اردگرد تیز آندھیاں چلنے لگی ہوں، میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے بولنا چاہا لیکن الفاظ میرے حلق میں گول مول سے ہوکر پھنسنے لگے۔ ریسیور میرے ہاتھ سے دور جاگرا۔ میں پورے قد سے فرش پر گر گئی اور پھر مجھے کچھ خبر نہیں رہی کہ میں کہاں ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ میرا ہاتھ اظہر بھائی کے ہاتھوں میں تھا۔ اظہر بھائی نرمی سے میرے ہاتھوں کو تھپتھپا رہے تھے ان کی آنکھیں سرخ انگارا ہورہی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بے قراری سے میرے اوپر جھک کر بولے۔

''انعم، میری جان! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے خالی خالی نظروں سے اظہر بھائی کا اداس چہرہ دیکھا۔ پہلے تو میں ناسمجھی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر جب مجھے سمجھ میں آگیا کہ میں کہاں ہوں اور کس طرح یہاں پہنچی ہوں تو ایک چیخ مار کر وحشت کے عالم میں اٹھ بیٹھی اور اظہر بھائی کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

''بتاؤ...... بولو...... کہاں ہیں میرے زمان...... جلدی سے مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔'' میں دیوانگی کے عالم میں بیڈ سے اترنے لگی۔ اظہر بھائی نے کسی ننھی بچی کی طرح مجھے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ میں اپنے آپ کو ان سے چھڑانے لگی۔ میری آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں۔ بال کھل کر چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اظہر بھائی میری وحشتوں سے گھبرا کر نرس کو بلا لائے جس نے اظہر بھائی کے ساتھ مل کر مجھے زبردستی دوبارہ بیڈ پر لٹایا...... نرس چلی گئی تو اظہر بھائی رو کر بولے۔

''انعم! ہم کو یہ حقیقت قبول کرنی ہوگی کہ زمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ آج اس کی تجہیز و تدفین بھی ہوئی ہوگی اگر تم بیمار نہ ہوتیں، اسپتال میں نہ ہوتیں تو میں آج وہاں ہوتا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''انعم اب ہمیں زمان کے اس راز کو راز رکھنا ہوگا۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ابا جی ابھی گھر گئے ہیں۔ میں نے ان کو زبردستی گھر بھیجا ہے ورنہ وہ تو تمہاری پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور بچے گھر میں اکیلے تھے اس لیے سمجھا بجھا کر انہیں میں نے گھر بھیج دیا۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے بعد میں گم صم ہوکر رہ گئی۔ ابا جی حیران تھے کہ میں اچانک اتنی زیادہ بیمار کیسے ہوگئی۔ وہ میرے لیے انتہائی افسردہ تھے اظہر بھائی کی بیگم رومانہ بھابی نے میرے اسپتال میں ہونے کے باعث میرا گھر اور بچے سنبھالے۔ کہتے ہیں کہ انسان بہت سخت جان ہوتا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ انسان کو اگر اتنا بڑا غم دیتا ہے تو اس کے سہنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔ سو آہستہ آہستہ میں حواسوں میں آنے لگی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی بڑی خبر کو بچوں اور ابا جی سے کیسے چھپا پاؤں گی لیکن یہ زمان کی وصیت تھی۔

میری شادی کے بعد اظہر بھائی اور زمان آپس میں اتنے گہرے دوست بن گئے تھے کہ اگر... دو چار دن ایک دوسرے سے نہ ملتے تو دونوں کا حال برا ہونے لگتا۔ زمان نے اسی دوستی کو آزمایا اور میرے بھائی نے ان سے وعدہ کرلیا کہ وہ ان کی موت کی خبر ان کے والد اور بچوں سے چھپائیں گے اور اب ہر روز زمان بن کر فون کرنا...... بچوں کی فرمائشیں پوری کرنا اور ہر ماہ ایک معقول رقم گھر لاکر دینا بھی ان کی ذمے داری بن چکی تھی اور یہی بات میرے ذہن پر بوجھ بن کر سوار تھی کہ آخر کب تک وہ ہمارے اخراجات برداشت کرتے رہیں گے ایسا نہ ہو کہ وہ اس اضافی ذمے داری سے اکتا جائیں۔

اظہر بھائی کی بیوی رومانہ بھابی بے پروا سی خاتون تھیں اور کسی بات کی کھوج میں نہیں رہتی تھیں۔ اظہر بھائی نے ان سے بھی بات چھپائی تھی۔ وہ ہمارے ساتھ جو بھی مالی مدد کرتے تھے یا بچوں کے لیے تحفے تحائف لاتے تھے... ابا جی اور بچوں کے ساتھ

www.paksociety.com

ساتھ بھابی بھی یہی سمجھتی تھیں کہ وہ سب زمان بھیجتے ہیں۔

میں اور اظہر بھائی دونوں پریشان تھے کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا اور ہم اسے کب تک جاری رکھ سکیں گے۔ اظہر بھائی نے بتایا کہ زمان نے کہا تھا۔

''جب تک ابا جی زندہ ہیں یہ بات ہمیں چھپانی ہوگی۔ ابا جی کے بعد بچوں کے ذہنوں کو اس کے لیے آمادہ کرنا ہوگا اور تب تک بچے میری جدائی سے تھوڑے بہت مانوس ہو چکے ہوں گے اس لیے شاید وہ...'' اظہر بھائی بات پوری نہ کر سکے اور رونے لگے اور آنسوؤں کے بیچ.... اٹک اٹک کر کہنے لگے۔

''زمان...... یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ماں باپ کی جدائی کسی بھی عمر میں قبول نہیں کی جا سکتی، ہمیں دیکھو تم اور میں کیا ممی اور پاپا کی جدائی کو ابھی تک ذہنی طور پر قبول کر پائے ہیں تو وہ بچے......'' میں کچھ نہ بولی۔ بس آنسو بہاتی رہی...... ہم دونوں جب بھی اکیلے ہوتے اسی ایشو پر بات کرتے اور کوئی نتیجہ نکالے بغیر رو دھو کر الگ ہو جاتے لیکن اس دن ... میں سیریسلی سوچنے لگی اور محسوس کرنے لگی کہ اب اس مسئلے کا حل سوچنا ہوگا۔

☆☆☆

اس دن میری آنکھ معمول سے دیر سے کھلی تھی۔ بچوں کا لنچ تیار کرنا تھا۔ ابا جی اور بچوں کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔ میں چھلانگ مار کر چارپائی سے نیچے اتر آئی اور کچن میں جا کر کام میں لگ گئی۔ کام میں ایسا بزی ہوئی کہ فون کی گھنٹی بھی کانوں کو سنائی نہیں دی۔ اور تب صحن میں ایزی چیئر پر بیٹھے ابا جی نے آ کر فون اٹھا لیا۔ میں نے جب باتیں سنیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ ابا جی کس کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور جب انہیں کانوں سے فون لگائے دیکھا تو میرا جی دھک سے رہ گیا۔ اس وقت چونکہ اظہر بھائی زمان بن کر فون کرتے تھے اور بچوں سے بات چیت کر لیتے تھے۔ میں اس وقت کسی کو فون اٹھانے نہیں دیتی تھی۔ سارے کام چھوڑ کر میں لپک کر فون اٹھا لیا کرتی تھی لیکن آج کچھ زیادہ مصروفیت اور برتنوں کی کھڑ پڑ میں گھنٹی کی آواز نہ سن سکی اور ابا جی نے شاید مجھے کچن میں مصروف دیکھ کر خود ہی فون اٹھا لیا ورنہ وہ تو مجھے ہی آواز دے کر فون اٹھانے کو کہتے۔ میں کچھ کنفیوز سی کھڑی ابا جی کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔

''زمان بیٹا...... تمہاری آواز کچھ بھاری سی لگ رہی ہے۔ کہیں نزلہ زکام تو نہیں ہو گیا تمہیں۔'' ابا جی کہہ رہے تھے۔ اس طرف سے اظہر بھائی نے یقیناً ان کی بات کی تائید کی ہوگی تبھی تو وہ کہہ رہے تھے۔

''اپنا خیال رکھا کرو بیٹا...... وہاں تو کوئی نہیں جو تمہارا خیال رکھ سکے۔'' پھر وہ بولے۔ ''زمان بیٹا...... تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی، وہ یہ کہ...'' اپنی آواز دبا کر وہ بولے۔ ''بیٹا انعم کے لیے کچھ زیور وغیرہ بھیجو...... تم جانتے نہیں کہ انعم کی شکل میں قدرت نے تمہیں کیسا نایاب تحفہ دیا ہے ... تم بچوں کے لیے اور میرے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہو انعم کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بھیجتے ہو لیکن یہ کپڑے وغیرہ...... مجھے یہ انعم کے لیے اچھا نہیں لگتا۔ اب اتنی نایاب بیوی ملی ہے تو اسے تم تحفہ بھی نایاب بھیجو کہ وہ خوش ہو جائے۔'' ابا جی بات کر رہے تھے اور میرا دل جیسے اندر ہی اندر پاتال میں گر رہا تھا۔ میں اگر بڑھ کر دیوار کو تھام نہ لیتی تو پورے قد سے گر جاتی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ یہ ابا جی نے کیا کہہ دیا...... سونے کا نرخ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا ایک انگوٹھی افورڈ کرنا مشکل لگ رہا تھا اور اب یقیناً اظہر بھائی اسے بھی ابا جی کا حکم سمجھ کر پورا کریں گے۔ اظہر بھائی اب بھی اپنی حیثیت سے زیادہ کر رہے ہیں چونکہ ان کے ابھی تک...... بچے نہیں تھے اس لیے وہ سب کچھ میرے بچوں کے لیے کر رہے تھے لیکن اب...... زمان کی دوستی کو میں ان کے لیے سزا





بنا دوں...... ہمیشہ اظہر بھائی کا فون مجھے افسردہ کر دیا کرتا لیکن آج تو میں ٹینشن میں آ گئی اور مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید اب یہ قصہ زیادہ دیر نہ چل سکے۔ اسی سوچ بچار میں تھی کہ اظہر بھائی کا فون آ گیا۔ انہیں فکر تھی کہ آج میں نے فون کیوں ریسیو نہیں کیا۔

''انعم! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' چھوٹتے ہی وہ بولے۔

''جی بھائی، ٹھیک ہوں۔'' میں بجھی بجھی دل گرفتہ سی آواز میں بولی۔ کوشش کے باوجود میں اپنی سسکی روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

''لیکن مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو انعم بیٹا...... کیا میں آ جاؤں۔ ابا جی کہاں ہیں؟'' دوسری طرف اظہر بھائی تڑپ اٹھے اور پریشان سے ہو کر بولے۔

''ابا جی آج گھر پر ہیں۔ کل وہ انکل حمید کی عیادت کے لیے جائیں گے، آپ کل آ جائیں۔'' میں اپنی حالت پر قابو پا کر دبی زبان میں بولی۔

''او کے...... میں کل آ جاؤں گا لیکن تم ٹینشن مت لو، رو رو کر اپنی صحت برباد مت کرو انعم، اپنے بچوں کی طرف دیکھو...... تم ان کی ماں بھی ہو اور باپ بھی پھر ابا جی کے لیے تم بہو سے زیادہ بیٹی ہو۔ تمہیں اپنے دکھ بھلا کر ان سب کے لیے پوری بہادری سے جینا ہے۔ اگر تم ہمت ہار بیٹھیں......'' اظہر بھائی محبت سے نرم آواز میں بولے۔ ہمیشہ کی طرح وہ نرم آواز میں مجھے تسلیاں اور دلاسا دیتے رہے لیکن میرے تو زخموں کے ٹانکے جیسے کھل گئے تھے اور زخم بے تحاشا تکلیف دینے لگے تھے اظہر بھائی کے فون کے بعد میں نے کھانا بنایا اور ابا جی سے کہہ کر نزدیکی مارکیٹ میں سنی کے لیے گھر کی چپل لینے چل دی۔ اس کی چپل کئی دن سے ٹوٹی ہوئی تھی اور مجھے ٹائم نہیں مل رہا تھا کہ اس کے لیے چپل خرید لوں، کچھ تھوڑی بہت گھر کی خریداری بھی کرنی تھی جو میں آج کل پر ٹالے جا رہی تھی۔ یہ سپر اسٹور ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا لیکن یہاں ہر چیز ایک ساتھ مل جاتی تھی۔ گروسری کا سامان، لیڈیز کی آرائش و زیبائش کی اشیا، بچوں کے کپڑے جوتے وغیرہ حتیٰ کہ کتابیں رسالے بھی اسی اسٹور سے مل جاتے تھے۔ میں نے پیسے اور چیزوں کی لسٹ پرس میں ٹھونسی۔ ابا جی سے اجازت لی اور گھر سے نکل آئی۔ قریب ہی خالی رکشا مل گیا۔ مارکیٹ نزدیک ضرورت تھی لیکن پیدل جانے میں بہت ٹائم لگتا تھا سو میں اکثر رکشے میں چلی جایا کرتی تھی جب میرے پاس وافر وقت ہوتا تو پیدل بھی چلی جایا کرتی تھی۔ پلک جھپکتے مارکیٹ آ گئی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بچوں کے جوتوں والے حصے میں چلی گئی اور سنی کے لیے چپل دیکھنے لگی۔ چپل خریدنے کے بعد میں نے لسٹ نکال کر باقی اشیا خرید لیں اور شاپ سے نکلنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رومانہ بھابی تھیں، ان کے ہاتھ میں کچھ لفافے تھے۔

''ارے رومانہ بھابی آپ؟'' انہیں اس طرح غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

''ہاں میں...... اچھا ہوا کہ تم سے یہاں ملاقات ہو گئی...... ورنہ... تم تو سچ مچ عید کا چاند بن گئی ہو۔'' میں شرمندہ ہو گئی۔ واقعی مصروفیت اتنی تھی کہ بھائی کے گھر جانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

''بھابی...... وہ آپ جانتی ہیں کہ کتنی ذمے داریاں مجھے نبھانی ہوتی ہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے آپ سے باتیں کرنے کو اور ملنے کو تو ہر وقت دل چاہتا ہے لیکن موقع ہی نہیں ملتا۔''

''چلو...... آج تو موقع مل گیا نا...... چلو بیٹھ کر ایک کپ کافی بھی پی لیں گے اور بات چیت بھی ہو جائے گی۔'' رومانہ بھابی پیار سے بولیں۔

www.paksociety.com

اگرچہ میرے پاس سچ مچ ٹائم نہیں تھا۔ بچوں کے اسکول سے گھر آنے کا ٹائم بھی نزدیک تھا اور ابا جی کو ٹائم پر کھانا بھی دینا تھا لیکن رومانہ بھابی کی پیار بھری آفر کو ٹھکرانا بھی میرے بس میں نہیں تھا‘ سو دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کے ساتھ اسی مارکیٹ میں قائم ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے لیکن جانے کیا بات تھی مجھے آج رومانہ بھابی کچھ بجھی بجھی سی لگیں۔ وہ بڑی باغ و بہار قسم کی خاتون تھیں‘ ہر بات کے شروع اور آخر میں وہ ایک چھوٹا سا قہقہہ ضرور لگاتیں لیکن آج میں نے ابھی تک ان کا وہ مخصوص قہقہہ نہیں سنا تھا۔

”بھابی! کیا بات ہے، آپ کسی بات کو لے کر افسردہ ہیں؟“ میں رہ نہ سکی اور ان سے پوچھ لیا۔

”اس کی وجہ تمہارے بھیا ہیں۔“ رومانہ بھابی کبھی کسی بات کو دل میں رکھنے والی نہیں تھیں۔ اس وقت بھی وہ اپنی حالت مجھ سے چُھپا نہ سکیں اور کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد بولیں۔

”کیا......؟“ میں شدت سے چونک پڑی۔ مجھے سچ مچ بڑے زور کا جھٹکا لگا کیونکہ اظہر بھائی اور رومانہ بھابی کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور دونوں میں شاذ و نادر ہی... ناراضی کا موقع آیا ہو پھر یہ انہونی کیوں ہوگئی تھی۔ میں سوالیہ انداز میں انہیں یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا انعم ...... کہ تمہارے بھائی کو کیا ہوتا جارہا ہے لیکن وہ بہت بدل گئے ہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہیں بھابی...... اظہر بھائی پر اتنا بڑا الزام آپ لگا رہی ہیں۔“ میں حیرت سے بولی۔

”یہ الزام نہیں انعم حقیقت ہے، وہ پہلے والے اظہر تو رہے نہیں...... معلوم نہیں وہ اتنے زیادہ پیسے کہاں خرچ کرتے ہیں اور اگر میں اپنے لیے ایک سوٹ بھی خریدوں تو مجھے کفایت شعاری پر لیکچر دینے لگتے ہیں۔“ میں ہکا بکا ان کا منہ تک رہی تھی جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”تمہارے بھائی کی اچھی خاصی کمائی ہے پھر ہمارے بچے بھی نہیں ہیں جن پر کوئی زیادہ خرچ ہوتا ہو اور مجھے بھی تم جانتی ہو کہ میں کوئی فضول خرچ عورت نہیں ہوں۔ ہم دو بندوں کا کتنا خرچ ہوتا ہوگا‘ جبکہ مہینے کے آخر میں تمہارے بھائی نے سارے پیسے ختم کرلیے ہوتے ہیں۔“ میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی اور وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

”تم نہیں مانو گی انعم ...... لیکن مجھے تو یہ کسی عورت کا ہاتھ لگتا ہے یوں لگتا ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ تبھی تو پیسا ان کے ہاتھوں کا میل بن گیا ہے۔“ میں گم صم کسی گہری سوچ میں گم ان کی باتیں سن رہی تھی جبکہ اپنے دل کا سارا بوجھ اتار کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور کافی کے پیسے پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولیں۔

”میں جانتی ہوں انعم ...... کہ تم اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی ہو اور ان کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتیں لیکن میری باتوں پر ضرور غور کرنا...... کیونکہ میں غلط نہیں کہہ رہی۔“

مجھے اپنے خیالات میں الجھا چھوڑ کر وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئیں جبکہ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پتھر کی بن کر رہ گئی ہوں۔ ہاں میرے بھائی کا پیسہ ایک عورت کے چکر میں برباد ہورہا تھا لیکن وہ عورت کوئی غیر نہیں ان کی بدنصیب بہن ہے۔ جس کے میاں نے ان سے اتنی بڑی قسم لے لی ہے کہ ان کا گھر بھی داؤ پر لگنے لگا ہے لیکن نہیں‘ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک عزم سے کہا اور شاپنگ بیگز اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

اظہر بھائی میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی چائے ٹھنڈی ہوچکی تھی لیکن انہوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر بولے۔

”انعم! تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو کہ میں زمان سے کیا ہوا وعدہ توڑ دوں گا۔“

”لیکن اظہر بھائی...... آپ کو یہ وعدہ توڑنا ہوگا یہ ہم سب کے مفاد میں ہے۔ ہم مزید اس راز کو نہیں چھپا سکتے۔“

”لیکن انعم! ہم اس لیے کو ابا جی سے چھپائیں گے جب تک وہ زندہ ہیں ہم یہ راز آشکار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتے ورنہ......“

”ورنہ کیا...... ابا جی اس غم کو سہار نہیں سکیں گے یہی سوچا تھا زمان نے اور آپ بھی یہ سوچ رہے ہیں۔ لیکن مجھے دیکھیں میری ساری زندگی پل بھر میں راکھ کا ڈھیر بن گئی لیکن میں پھر بھی زندہ ہوں، جی رہی ہوں، ابا جی بھی زندہ رہیں گے۔“

”لیکن انعم! تم اچانک ہی کیوں یہ راز آشکارا کرنے پر تُلی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟“

”بس بھیا...... میں آپ کا پیسا مزید خود پر اور اپنی فیملی پر خرچ نہیں ہونے دوں گی بس بہت ہوگیا۔ آپ کا پیسا خود پر...... رومانہ بھابی پر خرچ ہوگا۔ بہت خراج وصول کرلیا آپ سے آپ کی زمان سے دوستی کا...... اگر زمان زندہ ہوتے تو یقیناً وہ اپنے اس وعدے سے دستبردار ہوجاتے۔“ آخر میں میرا گلا رُندھ گیا۔ آواز بھرا گئی لیکن اچانک قدموں کی آہٹ پر میں نے اور اظہر بھائی نے چونک کر بیک وقت پیچھے دیکھا اور ابا جی کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ مجھے زبردست شاک لگا تھا ابا جی کو اچانک دیکھ کر...... جبکہ اظہر بھائی کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہم دونوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی کیونکہ ابا جی ہمارے قریب کھڑے برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ وہ اچانک بہت بوڑھے لگنے لگے تھے‘ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور وہ بہت بے بس‘ بڑے لاچار اور ٹوٹے ہوئے لگ رہے تھے۔

”ابا...... ابا جی۔“ میرے کانپتے ہونٹوں سے ان کا نام رک رک کر نکلا۔ اظہر بھائی کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جارہا تھا، وہ بات کرنے کے قابل نہیں تھے۔ بس ساکت بیٹھے ابا جی کو تک رہے تھے۔ کتنی دیر تو ہم تینوں کے بیچ بالکل خاموشی رہی۔ اتنی خاموشی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز آنا لازمی تھی لیکن اس خاموشی کو ابا جی کی سسکیوں نے توڑ ڈالا۔ میں نے تو کبھی ابا جی کی آنکھ میں آنسو تک نہیں دیکھے تھے کجا کہ انہیں بلک بلک کر روتے دیکھنا۔ میں تھر تھر کانپنے لگی جبکہ اظہر بھائی ابا جی کے ساتھ ساتھ رو رو کر بے حال ہورہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں مرگئی ہوں اور سانس لینے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ میری آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا اور میں پورے قد سے گرنے والی تھی کہ اچانک ہی ابا جی نے اپنے کمزور بازوؤں میں مجھے تھام کر کسی انمول شے کی طرح کرسی پر بٹھا دیا...... اور آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولے۔

”انعم! مجھے زمان کی موت کا آج علم نہیں ہوا۔ یہ تو مجھے کچھ دن قبل معلوم ہوگیا تھا۔ تمہاری اور اظہر کی باتوں سے مجھے پتا چل گیا تھا۔“ میں اپنی حالت بھول بھال شدید حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اظہر بھائی کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ جیسے سکتے کی حالت میں ابا جی کو دیکھ رہے تھے اور ان کی بات سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔

”ہاں۔“ ابا جی تھکی تھکی آواز میں بولے۔ ”یاد ہے میں حمید کے گھر اس کی عیادت اور دیکھ بھال کے

www.paksociety.com

بہانے چار دن اس کے گھر میں رہا۔ وہ دراصل میں وہاں اپنے بیٹے زمان کا غم منا رہا تھا۔ میں وہ چار دن روتا اور بلکتا رہا۔ حمید میرا راز دار تھا۔ وہ مجھے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ...۔" ابا جی رک کر ایک بار پھر رونے لگے۔ رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"زمان میری دنیا تھا۔ اس سے زیادہ میرے لیے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا لیکن......" وہ کچھ رک کے ......پھر آنسوؤں سے گندھی آواز میں بولے۔

"لیکن تم دونوں جو کر رہے تھے وہ بھی غلط تھا۔ اظہر بیٹے کی دوستی اپنی جگہ...... اس کے زمان سے کیے ہوئے وعدے کی اہمیت تو ہے لیکن حقیقت سے فرار بھی تو ممکن نہیں۔" اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ میرے سر پر رکھتے ہوئے وہ بولے۔ "خوابوں میں جینا بہت دلفریب ہوتا ہے لیکن میری بچی...... جب خواب ٹوٹتے ہیں تب درد ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ سوچو تو اگر کل تمہارے بچے تمہارے سامنے کھڑے ہو کر کہتے کہ جہاں سے مرضی ہو لیکن ہمارے باپ کو ہمارے سامنے لاؤ تو تم کیا کرتیں اگر میرا آخری وقت قریب آجاتا اور میں کہتا کہ زمان کو کہو کہ فوراً پہنچے مجھے اس کو دیکھنا ہے آخری بار تو تم کیا کرتیں۔" وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے لیکن اس بار وہ اکیلے نہیں رو رہے تھے بلکہ میری چیخیں اور کراہیں اور اظہر بھائی کا زور زور سے رونا بھی ان کی آوازِ میں شامل ہو گیا تھا۔ کتنی خواہش تھی میری کہ میں چیخ چیخ کر روؤں...... اتنے آنسو بہاؤں کہ جل تھل ہو جائے لیکن میں ہر بار آنسوؤں کو اپنے اندر گراتی رہتی۔ رات کو رضائی میں منہ دیے میں آنسوؤں کے دریا بہاتی رہتی لیکن منہ میں دوپٹا ٹھونسا ہوتا کہ بچوں کو آواز نہ سنائی دے۔ آج تو مجھے موقع ملا تھا کہ میں زمان کی موت کا کھل کر ماتم کروں۔ آج مجھے کوئی ڈر نہیں تھا۔ ابا جی آنسوؤں کے بیچ کہہ رہے تھے۔

"ہاں، میں نے جان بوجھ کر اظہر سے تمہارے لیے سونے کی چیز لانے کو کہا تھا کہ وہ اخراجات سے تنگ آکر اس تلخ حقیقت کو آشکار کر دے...... لیکن وہ تو دوست کی محبت میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا لیکن میری بچی تم عقلمند تھیں، تم نے اس غلطی کو محسوس کر لیا۔ تم سمجھ گئیں کہ فطرت کے قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ جو لوگ مر جائیں انہیں زندہ نہیں رکھا جا سکتا...... چاہے کچھ ہو جائے، چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے اور یہ بھی قدرت کا قانون ہے کہ وہ دکھے دل پر پٹیاں لگانے کا عمل کرتا ہے۔ میرے لیے میرے بیٹے کی نشانیاں موجود ہیں، تم میری بیٹی اور سنی اور رابعہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں سوچا زمان نے۔" اب کے وہ پھر سے ایک چھوٹے بچے کی طرح رونے اور بلکنے لگے۔ پاس پڑوس کے لوگ ہمارے آنگن میں جمع ہونے لگے۔ سب کو زمان کی جوان موت کا دکھ تھا۔ لمحے بھر میں گھر میں چاندنیاں بچھ گئیں۔ پاس پڑوس کے لوگ گٹھلیوں پر سوا لکھی ختم کرنے لگے۔ دونوں بچے اسکول سے آگئے تھے اور رو رو کر پاگل ہو رہے تھے۔

"مما! ہمارے لیے اب کھلونے کون بھیجے گا؟ ہم کس سے فرمائش کریں گے چیزیں لانے کی۔" میں انہیں جتنا سمیٹتی وہ اتنا ہی بکھرنے لگتے۔ وہ میرے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ گھر بھر میں ماتم برپا تھا۔ آج زمان سچ مچ میری زندگی سے نکل گئے تھے۔ ابھی تک جھوٹ موٹ کے سہی لیکن وہ میری زندگی میں موجود تھے لیکن میں دکھی اور غمزدہ ہوتے ہوئے بھی اندر سے مطمئن تھی کہ بقول ابا جی کے حقیقت کتنی بھی کڑوی کیوں نہ ہو لیکن اسے قبول کر لینا چاہیے کہ خوابوں میں ساری عمر رہا نہیں جاتا۔



# سرپرائز

رفاقت جاوید

"چند دنوں بعد رمضان اپنی تمام تر رعنائیوں اور رونقوں کے ساتھ تشریف فرما ہونے والا ہے مگر میرے گھر میں وہ بھی میری طرح اداس و مایوس حیرت میں ڈوبا ہوا گزر جائے گا اور اگلے سال ہمیں رمضان گزارنے میں کتنی سوچ بچار کرنا پڑے گی میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ ٹی دیکھتے ہوئے دکھ سے سوچے جا رہی تھیں۔

موبائل کی بیل پر چونک کر اپنے پژمردہ

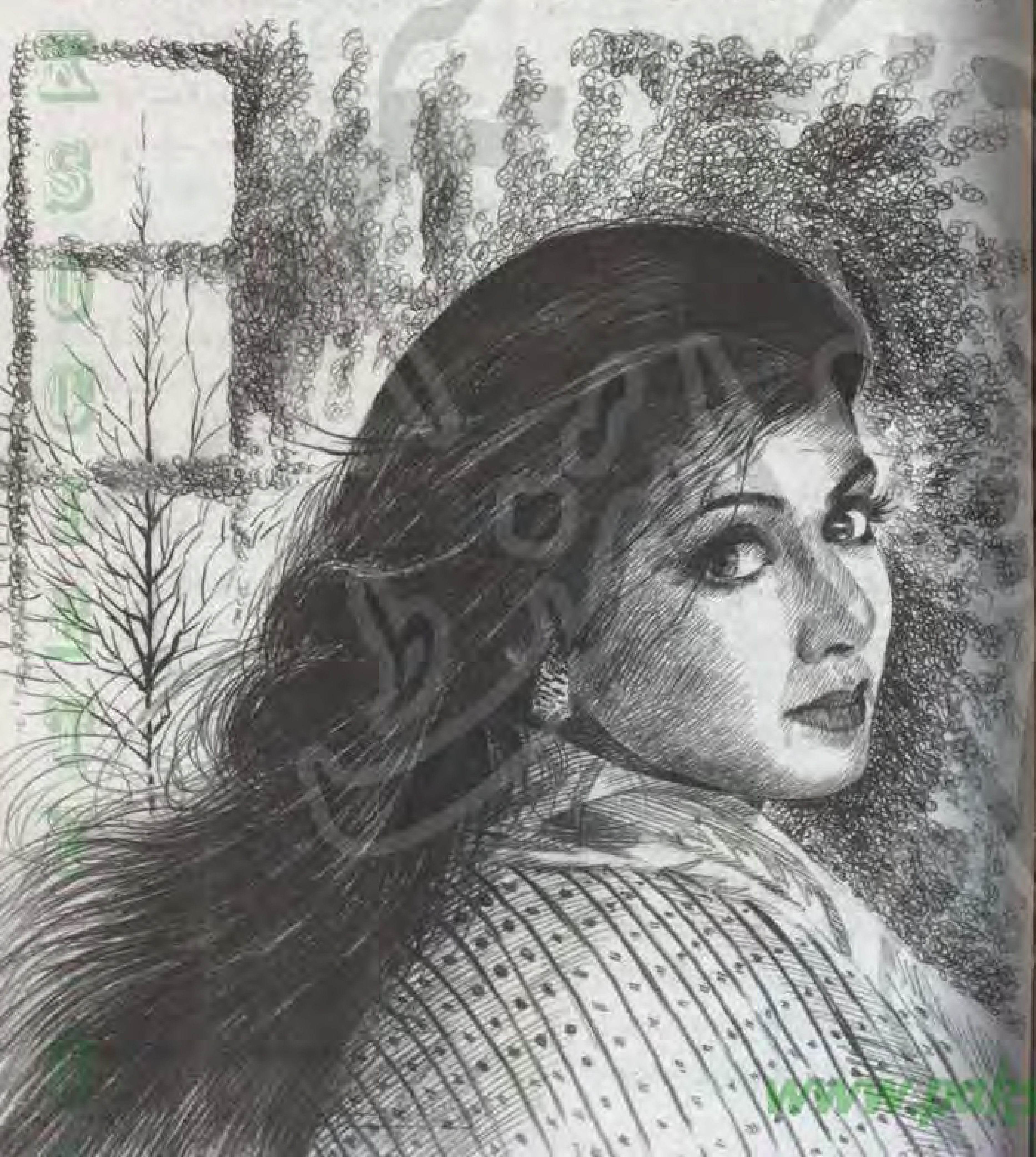

www.paksociety.com

خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔ بیٹی حریم کا فون نمبر دیکھ کر جیسے بدن میں خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ حریم کی آواز کی مٹھاس اور اس کے ہر لفظ کو سماعتوں میں محفوظ کر رہی تھیں۔

''ممی! آپ کچھ تو بولیں۔'' وہ بے چینی سے بولی۔ ''کیا میرا پروگرام پسند نہیں آیا؟ ممی خوب مزہ رہے گا، میں ڈیڈی سے بھی بات کروں گی۔ امید ہے وہ اس تبدیلی پر خوش ہو کر میری بات مان جائیں گے۔''

''حریم بیٹا! داماد کے گھر میں رہنا بہت معیوب لگتا ہے۔ کچھ ہتک سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ لوگ عید پر پاکستان آنے کا پروگرام بناؤ بیٹا، دبئی کون سا سات سمندر پار ہے۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

''ممی! ہمارا آنا بہت مشکل ہے، نہ تو وقاص کو چھٹی مل سکتی ہے نہ ہی مجھے۔'' وہ پھر خاموش ہو گئیں۔

''ممی! آپ اداس ہو گئیں۔ ویری بیڈ...... ممی اگر ڈیڈی میرے پاس نہیں آنا چاہتے تو انہیں ملازم کے حوالے کریں اور جلدی سے آپ میرے پاس آجائیں، عید پر ڈیڈی بھی دو دن کے لیے تو آ ہی سکتے ہیں نا۔'' وہ بھی پریشان سی ہو کر بولی۔

''بیٹا ہمیشہ سے بزرگ کہتے آئے ہیں۔ سچ ہی ہے کہ بیٹا اس جہان کی زینت ہے۔''

''ممی اپنے مراق سے باہر نکل کر تو دیکھیں۔ آپ دنیا کے ہجوم میں خود کو موجود پائیں گی۔''

''تم لوگوں کی مجبوریاں اور بہانے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے جبکہ میں نے تم لوگوں کی خاطر اپنے تمام رشتوں کو ختم کر کے اپنی زندگی تم لوگوں تک محدود کر دی تھی۔ اب کسی کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ ''بات ایسے کر رہی ہو جیسے سب میرا ساتھ دیتے دیتے اکتا گئے ہیں۔ تھک کر چُور ہو گئے ہیں۔ جاؤ اپنی اپنی زندگیوں میں خوش و خرم رہو۔ ماں کا کیا ہے؟ آج مرے کل دوسرا دن۔''

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں، بھلا آپ کو ہم سب مرنے دیں گے۔ میں تو آپ کو ان سوچوں سے باہر نکالنا چاہتی ہوں۔ ان ننھی منی کونپلوں کو کچل کر اپنے من میں ہمت و حوصلے کا بیج بو کر اس کی پرداخت کریں پھر آپ تنہائی محسوس نہیں کریں گی۔ ڈیڈی بھی آپ کو ٹائم دینے لگیں گے اور ہم سب بھی۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

''تم نے اپنا فرض ادا کر دیا، سو میں تمہاری باتوں میں بہل بھی گئی اور تمہارا کنسرن سمجھ گئی۔ بہت بہت شکریہ۔'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

''بڑے میاں آج رات واپس آؤ گے تو اس ناکارہ اور فالتو گھیاری اور پرانی بے جان شے کو ڈھونڈتے ہی رہ جاؤ گے۔'' وہ بڑبڑائیں۔ اپنے فیصلے پر احساسِ مظلومیت ایسا کافور ہوا کہ جسم میں بھی پھریری سی دوڑ گئی اور وہ تیزی سے اسٹور کھول کر اندر چلی گئیں۔ جب وہ باہر نکلیں تو میاں رخصت ہو چکے تھے۔ انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ بیڈ روم تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا بلکہ میدانِ کارزار کا سماں پیش کر رہا تھا۔ باتھ روم کی بھی یہی حالت تھی۔ انہوں نے اپنے میلے کپڑے باسکٹ سے نکالے اور وہ بھی کمرے ہی میں بکھیر کر مطمئن ہو گئیں اور ملازموں کو دو ماہ کی چھٹی دے کر ان کی لاتعداد دعائیں لیتے ہوئے گھر کی تمام لائٹس آن کر کے، تیار ہو کر پورچ سے نکل آئیں۔ اڑوس پڑوس کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اٹیچی اور بیگ سمیت سڑک کراس کرنے لگیں تو ٹیکسی پیچھے آ کر رکی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہنستی مسکراتی یہ جا وہ جا ہو گئیں۔

☆☆☆

آج وہ پانچ سال بعد بھائیوں کے گھر آئی تھیں۔ اپنی زندگی میں بچیوں اور شوہر کے ساتھ اس قدر مصروف رہیں کہ فاصلوں کی وجہ سے میکے آنا دوبھر ہو گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے یہ دن اپنی فیملی پر وار کر سرخروئی حاصل کی تھی۔ جب بیٹیاں ان کے دوار بیٹھی ہوئی تھیں ان کے شب و روز کا چین و سکون اور نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ جب یکے بعد دیگرے سب اپنے اپنے گھروں کی ہو کر ملک سے باہر چلی گئیں تو ان پر ڈپریشن نے غلبہ پا لیا۔ جلتی پر تیل کا کام میاں کی ریٹائرمنٹ نے کر دیا۔ وہ جو صبح کالج جاتے اور دوپہر تین بجے گھر پہنچ کر اپنا تمام وقت گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اب ہر وقت بیوی کی طرف سے تنہائی کا رونا، کبھی بیٹیوں کے سسرال سے گلے شکوے تو کبھی داماد کی باتوں کو مائنڈ کر جانا کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ انہوں نے اپنا دل بہلانے کی خاطر دوستوں میں ہی دل لگا لیا۔ رات کو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتے.

بیٹیاں اپنی فیملی میں اس حد تک بزی ہو چکی تھیں کہ فون پر بات بھی کبھی کبھار ہی ہو پاتی تھی۔ جس کا آغاز اور اختتام گلے شکوؤں پر ہوتا...... بیٹیاں ماں کے بدلے ہوئے مزاج کو سمجھ کر تسلی تشفی دینے کے بجائے چڑ جاتیں تو زارا ذہنی طور پر اور مفلوج ہو جاتیں۔ میاں کو اکیلے چھوڑ کر بھائیوں کے پاس چند دن گزارنا یا بیٹیوں کے گھر جانا انہیں بہت معیوب لگتا تھا۔ ایسی ہی توقع اپنے شوہر سے تھی جو پوری نہ ہوتی تو وہ ماندی پڑ جاتی تھیں لیکن آج اس طویل قیدِ تنہائی سے گھبرا کر وہ بھائیوں کے پاس رمضان اور عید گزارنے آ گئی تھیں۔

جب میاں دبے پاؤں مین ڈور کھول کر گھر کے اندر آئے تو چار سو پھیلی ہوئی خاموشی نے چونکا سا دیا۔ تیزی سے اپنے بیڈ روم کی طرف ہو لیے...... لاشعور میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں، دل نہ جانے کن

## بہت زیادہ ہے

(بھوجا ائر کریش کے مسافروں کے نام)

انسانوں کی جان کے سوداگرو
زندگی کا مول کچھ تو بڑھا دو
اس دکان سے
سیل کا بورڈ تو ہٹا دو
یہ جو زمین پہ
گوشت کے ٹکڑے بکھرے ہیں
یہ کل تک
کسی کے باپ، کسی کی ماں
بیٹا، شوہر اور بیوی تھی
یہ کل تک
کسی کا خواب، کسی کی خوشی
امید، دھڑکن اور زندگی تھی
پانچ، پانچ لاکھ زندگی کی قیمت
کچھ کم نہیں ہے؟
یہ عمر بھر کا درد ہے
خون کا بدلہ خون ہوگا
اس سے کم پہ نہ ختم یہ جنون ہوگا
یہ 127 مسافروں کی موت نہیں
یہ 127 خاندانوں کا
جنازہ ہے
ان کا مول
بہت زیادہ ہے

بشریٰ سعید احمد، لاہور



www.paksociety.com

وسوسوں اور خدشوں میں گھر گیا تھا۔ بیڈ روم کی لائٹس آن تھیں۔ کمرے کی ناگفتہ بہ حالت پر وہ بے ساختہ بیگم کو پکارنے لگے۔ جواب نہ ملنے پر بڑبڑاتے ہوئے کلازٹ کے اندر جا کر لاکر کو دیکھ کر تسلی سے باہر نکل آئے۔

”اف میں تو سمجھا تھا کہ ڈاکو حملہ کر کے جمع پونجی لے کر فرار ہوگئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہم اس ظلم سے بچ گئے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ بیگم کمرے میں اس وقت طوفانِ بدتمیزی مچا کر کہاں غائب ہیں۔ سر پر صفائی کا بھوت سوار ہوگیا ہوگا۔ نیند نہیں آرہی ہوگی۔ ہو نہ ہو کچن کی الماریاں سیٹ کر رہی ہوں گی۔“ وہ گھر کے تمام کمروں میں انہیں ڈھونڈنے لگے۔ ناکامی کی صورت میں اپنی اضطراری کیفیت سے نکلنے کے لیے سوچنے لگے۔

”ان بڑی بی کو کوئی اغوا تو کرنے سے رہا۔ اپنے قدموں سے چل کر کہیں گئی ہیں۔ ویسے بڑی بی کہنا تو زیادتی ہے مگر گئیں کہاں۔ نو گھنٹے کا سفر طے کر کے بھائیوں کے پاس تو جانے سے رہیں۔ بیٹیاں سب ملک سے باہر آباد ہیں، رسائی ناممکن ہے تو پھر گئیں کہاں...... ہائے ہائے کہیں خودکشی ہی نہ کر بیٹھی ہوں، ذہنی مریضہ تو تھیں ہی۔ اپنی زندگی کو ختم کر کے مجھے عبرت ناک سبق سکھانا...... ایسا ردِعمل ان سے بعید نہیں۔“ وہ بے تابی اور فکرمندی سے پورچ میں نکل گئے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ چاروں بیٹیوں کو فون کر ڈالا تو ان کے گھروں میں تہلکہ مچ گیا۔ سب ایک دوسرے کو الزام دیتی ہوئی آہ و بکا کرنے لگیں۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں چاروں بیٹیاں اپنے چھوٹے بڑے بچوں سمیت میکے پہنچ گئیں اور ڈیڈی پر چیلوں کی طرح حملہ آور ہو کر بولیں۔

”اگر ہماری ممی کو کچھ ہوگیا تو آپ کی بخشش نہ تو یہاں ہوگی نہ ہی اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کی شنوائی ہوگی۔ آپ کی ریٹائرمنٹ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اکیلے ہی زندگی کے مزے اُڑانے لگیں اور ممی کو سرے سے ہی بھلا دیں۔ دراصل آپ کی نظر میں وہ بے جان اور ہر طرح کے جذبات و احساسات سے عاری ایک ناکارہ غیر اہم...... چیز تھیں۔“ وہ سر جھکائے ان کی تمام لعن طعن کو شیر مادر کی طرح اس لیے پی رہے تھے کہ اس پریشانی کے قصوروار وہی ٹھہرائے جا رہے تھے۔

☆☆☆

پہلے روزے کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ سب کے گھروں میں رمضان کی برکت نمایاں طور پر نظر آرہی تھی لیکن ان کا گھر تمام افراد اور بچوں کے باوجود سوگواری اور نحوست میں گھرا ہوا لگ رہا تھا۔ ہونٹوں پر خامشی کی پٹی باندھے پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر تو درج کروادی تھی مگر زارا کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔ تنگی، اذیت، دکھ اور پچھتاوؤں میں روز روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ بیوی جنہیں بیکار، تنک چڑھی اور جنونی سمجھ کر بے دردی سے فار گرانٹیڈ لیا گیا تھا۔ گھر کے چپے چپے نے ان کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ ہر فرد ان کی کمی پر آہ و فغاں میں وقت گزار رہا تھا۔ اب تو میاں بھی اپنے دوستوں کی رفاقت کا سوچ کر اُوب سے گئے تھے۔ عاقبت نااندیش اور ناقابلِ فہم لوگ جوانی کے نشے میں سرمست اپنے گھروں کو جہنم بناتے تو ہزاروں دیکھے تھے مگر عمر کے اس حصے میں ناکام زندگی کی تمام کلفتیں صرف ان کے حصے میں لکھی گئی تھیں۔ مارے ندامت کے وہ اپنا درد اور غم کسی دوست سے بھی شیئر نہ کر سکے۔ ویسے بھی رمضان کی وجہ سے ان کی تمام محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ عزیزوں، رشتے داروں نے کریدنے کی کوشش تو کی مگر کنفرم کرنے پر ہی شک کو یقین ملتا۔ یہاں پریشانی کا دورہ تھا۔





وہاں زارا اپنے میکے میں گاؤں کے سادہ اور سہل ماحول میں خوب انجوائے کر رہی تھیں۔ بھائیوں نے بڑی بہن ہونے کے ناتے ہتھیلی کا چھالا ہی تو بنالیا۔ جو اُن کی بیگمات کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا لیکن اکلوتی نند کو کچوکے لگانے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔ زارا کے روزے اِک زمانے بعد شادمانیوں میں گزر رہے تھے۔ سحری اور افطاری کی رونقوں اور رحمتوں کا تو جواب نہیں تھا۔ اکیسویں روزے کو زارا خوشی میں جھومتے ہوئے اعتکاف میں بیٹھ گئیں تو بھائیوں کے سر فخر سے اور دل خوشی سے جھوم اٹھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس رمضان میں ان کے گھروں پر اپنے فضل و کرم اور رزق کے دروازے وا کردیے ہوں۔ آپا کے لیے بہترین سحری اور افطاری کا اہتمام کیا جاتا تو بھابیاں سر سے لے کر پاؤں تک آگ بگولا ہو جاتیں لیکن عید کے بعد ان کی واپسی کے انتظار میں صبر کا دامن تھامے دن گن گن کر گزار رہی تھیں۔ وہ شام زارا پر بہت بھاری تھی۔ جب ایک بھابی انہیں افطاری پکڑانے دروازے تک آئی تو دوسری نے ناک چڑھا کر کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ محترمہ عید پر بھی اپنے خاوند کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ بس اس دفعہ کی ہماری عید بھی خراب ہوئی کیونکہ ان کی خدمتوں میں عید گزر جائے گی۔ دل تو چاہتا ہے کہ ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں تاکہ دوبارہ اِدھر آنے کی تکلیف نہ کریں لیکن ہمارے میاں ہمیں کان پکڑ کر نکال دیں گے۔ عجیب عورت ہے کہ اس عمر میں میاں کو اکیلے چھوڑ کر یہاں کیسے سکون و اطمینان سے بیٹھی ہے۔ لعنت ہو ایسی عقل اور سمجھ پر، عمر کے ساتھ ماری ہی گئی۔“ زارا تمام باتیں سن کر چکرا گئیں۔ اپنا گھر اور میاں بے اختیار یاد آنے لگے۔ ان کا دل چاہا کہ روزہ کھول کر وہ رات کی گاڑی سے ہی واپس اپنی اس جنت میں چلی جائیں جسے انہوں نے جہنم سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ بے شک انہوں نے یہ وقتی اور جذباتی فیصلہ کر کے سب کو سبق سکھانے کا سوچا تھا لیکن اس وقت وہ اعتکاف کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے احتراماً ایسے ردِعمل کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتی تھیں۔ آہ بھر کر جانماز پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے ذہن و قلب کے مضبوط ہونے کی دعائیں کرنے لگیں۔ اعتکاف کے بقیہ دن عبادت کے باوجود خاصی پریشانی میں کٹے۔

مغرب کے بعد وہ کمرے میں روزہ افطار کرنے کے بعد چاند کے نظر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اعتکاف سے نکلتے ہی اپنے گھر کو سدھار جائیں اور عید اپنے میاں کے ساتھ دستور اور قاعدے کے مطابق منائیں۔ اپنی بیٹیوں سے اسکائپ پر ملاقات کریں۔ اپنے نواسے اور نواسیوں کو مبارک باد دیں اور انہیں عیدی ارسال کریں۔

اسی سمے پٹاخوں کی آوازوں سے انہیں چاند نظر آنے کا سندیسہ مل گیا۔ وہ خوشی سے جانماز سے اٹھ کر باہر نکلنے کو تھیں کہ دروازہ کھلا اور میاں شکیل صاحب آگے اور دائیں بائیں چاروں بیٹیاں ہنستے مسکراتے اندر داخل ہوئے۔ ننھے منے نواسے اور نواسیوں نے نانی پر دھاوا بول دیا۔ اس سرپرائز پر وہ اچنبھے سے سب کو دیکھنے لگیں۔ آج جیسی عید تو پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ سب کو سینے سے لگائے نہال ہوتی چلی گئیں۔ میاں نے سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر ان کے سر پر محبت کے جذبے سے بھرپور بوسہ دے ڈالا تو کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

www.paksociety.com

# میری عید تم سے ہے

عظمیٰ افتخار

''اس غزالِ ناز کو دیکھا تو یوں لگا
جلتا کوئی دیا ہو میرے انتظار میں
اس آہوئے دراز پلک کی ادا نہ پوچھ
چشمہ سا بہہ رہا ہو کوئی ریگزار میں''

عبداللہ نے نرمی سے دُرِ مکنون کے رخسار پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے خوب صورت سا قطعہ پڑھا۔ عبداللہ کی انگلیوں کی نرماہٹ اور خوب صورت لفظوں کے ردھم نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا تھا۔

''کیسی ہیں جانِ عبداللہ......؟ مجھے تو اب بخار محسوس نہیں ہورہا۔'' عبداللہ نے محبت سے پوچھتے ہوئے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''کافی بہتر محسوس کررہی ہوں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیہ پشت کے پیچھے کھڑا کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ ''میرا آج کا روزہ چھوٹ گیا.... عبداللہ۔'' درِمکنون نے منہ بسورا۔

''تو کل شام، آپ نے برستی بارش میں نہیں بھیگنا تھا ناں......'' وہ ابھی تک اس کے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''آپ کو پتا تو ہے، میں آپ کی طرح خود پر کنٹرول نہیں رکھ پاتی۔ بارش مجھے مسحور کردیتی ہے۔'' اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔

''اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔'' عبداللہ نے اس کی چھوٹی سی ناک کھینچی جو فلو کے باعث سرخ ہورہی تھی۔ ''ویسے بھی قرآن کریم کی سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو ان کی قضا کرلے پھر وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ لہٰذا آپ آگے کے دنوں میں شمار پورا کرسکتی ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، انشاء اللہ میں آگے کے دنوں میں قضا روزے کا شمار پورا کرلوں گی۔ یہ بتائیں آپ کو اور ماما کو سحری کے وقت دقت تو نہیں ہوئی۔'' دُرِمکنون جانتی تھی مسز سعدیہ جہانگیر اور عبداللہ اس کے کتنے عادی ہیں۔ عبداللہ ابھی کچھ جواب دینا چاہتا ہی تھا کہ سوہا دروازہ ناک کرتی اندر داخل ہوئی۔

''کیسی ہیں مما آپ؟'' وہ ماں کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔

''اپنی لاڈلی کو دیکھ لیا۔ اب ایک دم فٹ ہوں۔'' وہ بشاشت سے مسکرائی۔

''بابا! آپ نے مما کو بتایا نہیں کہ میں نے آپ کی سحری میں ہیلپ کی۔'' پانچ سالہ سوہا مد بر بنی پوچھ رہی تھی۔ ذہانت اور خوب صورتی اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔

''بالکل بھئی، سوہا نے مجھے وہ سب جگہیں دکھائیں جہاں اس کی مما اس کی فیورٹ چیزیں رکھتی ہیں اور سحری کے دوران پورا وقت باتیں کر کے مجھے اور اپنی دادی کو محظوظ کرتی رہی۔'' عبداللہ نے مزے سے بتایا تو دُرِمکنون نے اسے مسکرا کر گلے سے لگالیا۔

''لیکن آپ نے مجھے اتنی دیر سے کیوں

www.paksociety.com

اٹھایا......؟ میرا صبح کا سارا سہانا وقت مس ہوگیا۔'' دُرِمکنون نے افسردگی سے منہ لٹکالیا۔

''مما! آپ تو بالکل بچوں کی طرح کررہی ہیں۔'' سوہا نے غور سے ماں کی شکل دیکھی۔

''بیٹا جانی، فطرت ایک ایسی استاد ہے جس کے آگے تمہاری ماں ہمیشہ بچی رہے گی اور آج تو میرا اداس ہونا بنتا ہے ناں میرا لائیو ڈسکوری چینل جو مس ہوگیا۔''

''ہاں، آپ سے مس تو ہوا ہے مگر میں اس کی اپ ڈیٹ آپ کو ضرور دے سکتا ہوں۔'' عبداللہ نے شاہانہ انداز اختیار کیا۔

''اچھا......تو بتائیں۔'' دُرِمکنون جوش میں آگئی۔

''آپ کے آسٹریلوی طوطوں کے ناشتے پانی کا انتظام میں نے کردیا ہے۔ آپ کی پسندیدہ فاختاؤں کا جوڑا کچھ دیر قبل آپ کو سلامِ صبح کر کے گیا ہے اور جناب سب سے زبردست اطلاع یہ ہے کہ کوے کے بچے بھی اپنے گھونسلوں سے نکل آئے ہیں اور اس وقت ہمارے گلِ مہر کے درخت پر ہیں اور

اپنی ماں سے اڑنا سیکھ رہے ہیں۔''

''واؤ، ریئلی...... مجھے کتنی چاہ تھی کہ وہ ہمارے درخت پر گھونسلا بناتے۔'' دُرِ مکنون کے لہجے میں خوشی اور حسرت دونوں تھیں۔

''کوئی بات نہیں...... وہ اڑنا تو ہمارے ہی درخت سے سیکھ رہے ہیں نا......'' عبداللہ نے اسے چمکارا۔ وہ جانتا تھا کہ دُرِ مکنون کو پرندوں سے بڑا شغف تھا۔ جن دنوں کوے اپنا گھونسلا بنانے کی تیاری کے لیے تنکے جمع کر رہے تھے دُرِ مکنون سارا دن ٹیرس پر گزار دیتی تھی، وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ گھونسلا کس طرح بناتے ہیں مگر قدرت اپنے راز یوں آشکار نہیں کرتی...... اس لیے ان پرندوں نے بھی اپنا گھونسلا جانے کب برابر والوں کے گھر میں لگے درخت پر بنالیا اور وہ قدرت کی اس تخلیق سے لاعلم رہی۔

''اف، کافی ٹائم ہوگیا......'' عبداللہ نے گھڑی کی سمت نگاہ کی جو پونے نو بجا رہی تھی۔

''اوکے ڈیئر میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا، میں نے زبردست سا چائنیز سوپ آپ کے لیے تیار کیا ہے۔ حلیمہ نو بجے تک آجائے گی۔ اس سے گرم کروا کر ضرور بہ پی لینا۔'' وہ دُرِ مکنون کو ہدایت کرتا... بیٹی کو پیار کر کے باہر نکل آیا۔ دُرِ مکنون اسے جاتا دیکھتی رہی۔ ان کی شادی کو ساڑھے چھ سال ہوگئے تھے مگر عبداللہ آج بھی اسے بہت عزت اور مان دیتا تھا اور آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

☆☆☆

رمضان کا پُرنور مہینہ اپنے آخری عشرے میں داخل ہو چکا تھا۔ ماں سے دعا لے کر عبداللہ باہر نکل آیا۔ ماحول پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ بارش رات بھر برستی رہی تھی۔ اس وقت موسم کی خوب صورتی اپنے جوبن پر تھی۔

''دُرِ مکنون ٹھیک کہتی ہیں...... فطرت ایک ایسا استاد ہے جس کے سامنے ہم ہمیشہ چھوٹے ہی رہیں گے۔'' اس کا دل چاہا وہ پیدل ہی آفس کی سمت چل دے مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

نو سے بارہ کا وقت وہ اپنے بزنس کو دیتا تھا۔ ایک سے تین بجے تک وہ شہر کی دو معروف یونیورسٹیوں میں ایچ آر مینجمنٹ پڑھاتا تھا۔ چار سے چھ کا وقت وہ اپنے اور دُرِ مکنون کے شوق کے ساتھ منسلک ہو کر اپنے اینی میشن ہاؤس لائٹ اینڈ شیڈو میں گزارتا تھا۔ اس کے بعد کا سارا وقت وہ اپنی فیملی کو دیتا تھا مگر وقت کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہونا اس نے یونہی نہیں سیکھا تھا۔ قدرت نے اسے یہ راز سکھانے کے لیے ایک آزمائش سے گزارا تھا۔ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھا تو چند بوندیں ٹپ ٹپ کر کے ونڈ اسکرین پر گرنے لگیں اور پھسلتے ہوئے وائپر کی جڑ میں غائب ہوگئیں مگر اپنے نشان چھوڑ گئیں۔ بارش...... ایسی ہی بارش تھی جب دُرِ مکنون اسے ملی تھی، وہ سوچتے ہوئے بے ساختہ مسکرایا اور ماضی اس کے ہم قدم ہوگیا۔

☆☆☆

عبداللہ جہانگیر کو اپنے گرد ہجوم بڑا اچھا لگتا تھا۔ اسے نت نئے دوست بنانے کا بہت شوق تھا۔ ایسے دوست جن کے انداز توجہ کھینچنے والے ہوں اور دلچسپیاں منفرد...... اس نے کئی سوشل ویب سائٹس کی ممبر شپ لی ہوئی تھی اور باقاعدگی سے وہ انہیں وزٹ کرتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی وہ کنگسٹن یونی ورسٹی سے ایچ آر مینجمنٹ میں ماسٹرز کر کے آیا تھا۔ وہاں پر بھی اس کے گرد دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ کوئی سینما، میوزم، تھیٹر اور آرٹ گیلری ایسی نہ تھی جو اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر دریافت نہ کی ہو اور اب پاکستان آکر بھی اس کا یہی حال تھا۔ لیپ ٹاپ





ہر وقت آن رہتا۔ اسکائپ پر گفتگو چلتی رہتی اور موبائل کی بیل بجتی رہتی۔ اس کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹا لازمی اس کی منگیتر پلوشہ کا تھا، جو اس کی ماما کی کزن کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے بے تحاشا پسندیدگی رکھتا تھا اور یہ منگنی اسی محبت کا نتیجہ تھی۔ پلوشہ لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا فائنل ایئر تھا۔

''کیا عبداللہ، تم سے بات کرنے کے لیے تو لگتا ہے اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔ پاکستان آکر بھی یوں لگتا ہے کہ گویا اب تک تم پردیس میں ہی ہو۔'' مسز سعدیہ جہانگیر کبھی کبھی اس کی اس درجہ مصروفیت سے چڑ جاتیں اور پھر وہ اپنی ماما کا موڈ بحال کرنے کے لیے کچن میں گھس جاتا اور ان کی پسندیدہ چیز کریم براؤنیز بنانے لگتا۔ لندن میں وہ اپنے دوستوں کے لیے کوکنگ کر کر کے کافی ایکسپرٹ ہوگیا تھا۔ عبداللہ نے اپنے پاپا صمد جہانگیر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے صرف ایک مہینہ دے دیں۔ وہ یہ ایک مہینہ بالکل آزاد اور اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا تھا اس کے بعد وہ ان کے فرنیچر مینوفیکچرنگ اینڈ ڈیزائن کے بزنس اور ایس جے وڈ کمپنی کو جوائن کرلے گا۔

''آپ دیکھیے گا پاپا، صرف چند مہینوں میں، میں آپ کے بزنس پرافٹ میں کئی زیروز کا اضافہ کردوں گا۔''

''اچھا وہ کس طرح......'' پاپا نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا تھا۔

''ارے پاپا، کنگسٹن یونیورسٹی میں صرف دو سے چار کرنے کی بزنس اسٹریٹجی ہی نہیں سکھائی جاتی بلکہ ادارے اور ادارے کے لوگوں کے مابین تعلق کو کامیاب بنانے کے بھی گُر سکھائے جاتے ہیں اور ویسے بھی بقول میرے دوستوں کے میں تو مٹی میں بھی ہاتھ ڈالوں تو وہ بھی سونا بن جاتی ہے۔'' اس نے ادا سے فرضی کالر جھاڑے تھے۔ صمد جہانگیر نے فخر و محبت کے ملے جلے احساس کے ساتھ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔ اکلوتا ہونا بھی گویا اس خاندان کی روایت بن چکی تھی۔ وہ اور سعدیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور اب عبداللہ بھی ان کا قیمتی اور اکلوتا سرمایہ تھا۔ ان کی زندگی بھر کی جمع پونجی۔

عبداللہ کا دوسرا جنون فوٹو گرافی تھا۔ اس کے پاس جدید لینس سے مزین دو، تین کیمرے تھے۔ اب جبکہ وہ اپنے پاپا سے ایک مہینہ مستعار لے چکا تھا تو اس کے اندر کا متجسس آدمی پھر سے بیدار ہوگیا۔ وہ بھی ایک چمکیلا سا دن تھا جب وہ اپنی اسپورٹس بائیسکل لیے سکس پاکٹ ٹراؤزر اور سفید شرٹ پہنے، سر پر کیپ جمائے، کیمرا لیے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ ارد گرد کے ماحول کی خاص زاویوں سے تصاویر لیتے ہوئے وہ نزدیکی پارک آگیا تھا۔ یہ ڈیفنس (لاہور) کا علاقہ تھا۔ پارک میں وہ مختلف پھولوں کو فوکس کر کے ان کی تصاویر لینے لگا اور تب ہی جیسے بادل گھر کر آئے اور لمحوں میں برسنے لگے۔

''اف، ابھی تو اتنا بڑا چمکتا ہوا سورج تھا۔'' اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور کوفت سے سوچا۔ ''اوہ مائی گاڈ...... میرا کیمرا......'' کیمرے کا دھیان آتے ہی وہ بھاگ کر قریبی درخت کے سائے میں آگیا اور کیمرا سیفٹی بیگ میں رکھنے لگا۔

''کیا موسم ہے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے، برستی بوندوں کا تسلسل ہے، نہاتا ہوا سبزہ ہے اور جان بچاتا سورج۔'' بات کے اختتام پر ایک ننھا سا قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ عبداللہ چونک کر سیدھا ہوا۔ اس نے خود سے ذرا فاصلے پر کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ گلابی اسکرٹ اور سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ گلے میں سیاہ اسکارف ڈالے وہ کافی دلکش سی لڑکی تھی جو اپنی چھتری کھول رہی تھی۔ گویا اسے معلوم ہو کہ آج بارش

www.paksociety.com

ہو گی۔

''جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔'' عبداللہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ سے؟ نہیں تو......'' اس نے بڑی ادا سے اپنی ہرنی جیسی آنکھیں سکیڑیں۔ ''میں نے تو اپنی چھتری سے کہا۔'' بات کہنے کے ساتھ ہی اس نے پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ چھتری کھول چکی تھی۔ یہ ایک جاپانی طرز کی چھتری تھی جس پر ایک خوب صورت سی لڑکی کیمونو پہنے کھڑی تھی۔ وہ اپنی چھتری تان کر درخت کی پناہ سے باہر نکل آئی اور پارک میں واک کرنے لگی۔

''کبیرا سیپ سمندر کی رٹے پیاس
اور بوند کو ناں کہے بس آتی بوند کی آس''

لڑکی نے زیرِ لب کبیر کا شعر پڑھا اور چھتری ذرا سی سر سے پرے کر کے اپنا منہ بارش کی برستی بوندوں کی زد میں کر دیا۔ اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ عبداللہ کو خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ اس کے ہم قدم ہو چلا۔

''میرے پاس تو چھتری ہے۔ میں اس لیے واک کر رہی ہوں مگر آپ کس لیے بھیگ رہے ہیں۔'' وہ اپنی سابقہ پوزیشن میں واپس آ چکی تھی۔

''میں تو اس لڑکی کا ساتھ دینے کے لیے بھیگ رہا ہوں جو آپ کی چھتری پر کیمونو پہنے کھڑی ہے۔'' عبداللہ کا دل چاہا تھا کہ وہ کوئی ایسا جملہ کہہ دے کہ اس لڑکی کی بے نیازی غائب ہو جائے اور وہ چونک پڑے اور اس بار وہ واقعی چونک پڑی تھی۔ بات سمجھ آتے ہی اس نے پھر ایک ننھا سا قہقہہ لگایا۔ عبداللہ نے بہت کم لڑکیوں کو اس طرح قہقہے لگا کر ہنستے دیکھا تھا۔ اس کے قہقہوں کا جلترنگ واقعی جاندار تھا۔ مقابل کو اپنی سمت کھینچ لیتا تھا۔

''آپ یقیناً فوٹو گرافر ہیں۔''

''جی، ایسا ہی سمجھ لیں۔'' عبداللہ نے مختصراً کہا۔ کچھ آج اس کا حلیہ بھی رف اینڈ ٹف تھا اور خود کچھ وہ بھی اپنی ڈگری اور امارت کا رعب اس لڑکی پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''اور وہ اسپورٹس بائیسکل بھی یقیناً آپ کی ہی ہے جو رننگ ٹریک کے پاس پارک ہوئی ہے۔'' عبداللہ نے قدرے حیرانی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ لڑکی اتنی بھی بے نیاز نہیں تھی جتنی پہلی بار میں محسوس ہوئی تھی۔

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے یہ کیسے پتا چلا، ہے نا۔'' اب چونکنے کی باری عبداللہ کی تھی کیونکہ اس کے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا۔

''ایسے......'' لڑکی نے اپنے کاندھے پر لٹکے بڑے سے زنبیل نما لیدر بیگ میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور بارش کی بوندوں سے بچاتے ہوئے ایک صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔ عبداللہ کی نظروں کے سامنے اس کی اسپورٹس بائیسکل کا ہو بہو اسکیچ تھا اور ساتھ میں خود اس کا بھی پشت کی جانب سے اسکیچ تھا۔

''امیزنگ...... یہ کیسے کیا آپ نے؟ میرے خیال میں تو آپ سے کافی دور تھا۔'' عبداللہ کو اپنے ٹراؤزر کی جیب میں مسلسل موبائل کی وائبریشن محسوس ہو رہی تھی مگر اس کی توجہ صرف لڑکی پر مرکوز تھی۔

''اصل میں، میں ایک اینی میشن ہاؤس میں کانسپٹ آرٹسٹ ہوں اور خدا کے فضل سے میری یادداشت ویژول ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے احتیاط سے ڈائری بند کر کے اپنے بیگ میں واپس رکھ لی تھی کہ مبادا بارش سے بھیگ نہ جائے گو کہ بارش کی تیزی اب ماند پڑ چکی تھی۔

''میرا نام عبداللہ جہانگیر ہے۔ مجھ سے دوستی



www.paksociety.com



کریں گی؟'' عبداللہ نے تعارف کے ساتھ ہی ہاتھ اس کی سمت بڑھایا تھا۔

''دوستی! مگر مجھے تو دوستوں کی ضرورت نہیں۔ میں آپ اپنی دوست ہوں۔'' اس کی بے نیازی دوبارہ عود کر آ گئی۔

''لوگوں کو جاننے سے ہی تو انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔'' عبداللہ کا ہاتھ ہنوز اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

''عبداللہ صاحب! دوسروں کو جاننے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو جانے۔'' عبداللہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت اسے چھینک آئی اور پھر لگاتار آتی گئیں۔

''یہ موسم مجھے کبھی راس نہیں آتا۔ جب بھی بارش ہوتی ہے مجھے زبردست فلو ہو جاتا ہے۔'' دو سیکنڈ میں ہی اس کی ناک بہنے لگی تھی۔ وہ اپنی جیب میں دیکھنے لگا شاید کوئی ٹشو پیپر ہو۔

''یہ لیجیے!'' اس نے رومال عبداللہ کی سمت بڑھایا۔ ''میں اپنی چیزیں کسی کو نہیں دیتی مگر کیا کروں آپ کی یوں بہتی ناک نہیں دیکھ سکتی۔'' اس کا لہجہ قدرے مزاح لیے ہوئے تھا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر اپنی آستین سے ہی ناک صاف کر گیا تھا اور اس کے گلابی رنگ کے رومال کو جانے کیوں احتیاط سے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں رکھ لیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ کسی لڑکی کے سامنے یوں عیاں ہو گیا تھا اگر وہ اس وقت اس پارک میں اپنی ذاتی گاڑی میں آیا ہوتا تو ٹاول سے لے کر نائٹ ڈریس تک ہر شے اس میں موجود ہوتی۔

''میں ٹشو پیپر استعمال نہیں کرتی۔ ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ کاغذ کی تیاری میں کتنے ہی درخت کاٹے جاتے ہیں۔ میں یوں بے دردی سے انہیں ٹھکانے نہیں لگا

## کیا کریں

دل گیا تم نے لیا ہم کیا کریں
جانے والی چیز کا غم کیا کریں
معرکہ ہے آج حُسن و عشق میں
دیکھیے وہ کیا کریں ہم کیا کریں
بخش دینا پیار کی گستاخیاں
دل ہی قابو میں نہیں ہم کیا کریں
اپنے ہی غم سے نہیں ملتی نجات
اس بِنا پر فکرِ عالم کیا کریں
تند خو ہے کب سنے وہ دل کی بات
اور بھی برہم کو برہم کیا کریں

شاعر: قتیل شفائی

مرسلہ: زینب ظفر زریں، ملتان

سکتی۔'' اس کے لہجے میں تاسف کی رمق تھی۔

''اینی وے عبداللہ صاحب! میں چلتی ہوں۔''

بِنا نام، پتا بتائے وہ عبداللہ کو خدا حافظ کہہ کر باہر کی طرف چل دی اور عبداللہ الوداعی کلمات کہتے کہتے ہی رہ گیا۔ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اپنی بائیسکل کی سمت جب وہ آیا تو دیکھا وہ لڑکی پارک کے باہر ایک غبارے والے بچے سے غبارے خرید کر ہوا میں اُڑائے دے رہی تھی۔ ست رنگی غبارے آسمان کی طرف جاتے بڑے بھلے لگ رہے تھے مگر ایک بھیک مانگنے والے بچے کو اس نے پیسے دینے سے منع کر دیا تھا۔ عبداللہ خود کو روک نہ سکا اور اس کے قریب چلا آیا۔

''کیا آپ مجھے گھر تک چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' اس لڑکی نے مذاقاً پوچھا۔ ہلکا سا تبسم عبداللہ کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔

''نہیں، صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک بچے کے پھیلے ہوئے ہاتھ آپ نے رد کر دیے مگر دوسرے بچے سے بیکار میں غبارے خرید کر ہوا میں اڑا دیے؟'' وہ الجھن میں تھا۔

''عبداللہ صاحب! ہم میں سے ہر شخص کو غبارے والے بچے کی طرح اللہ کی رحمت اور محنت کی عظمت پر یقین رکھنا چاہیے مگر اس سے پہلے ہمیں اپنے اپنے کشکول توڑنے ہوں گے۔'' وہ سنجیدگی سے کہتی پلٹ گئی تھی۔ عبداللہ جانے کتنی دیر یونہی سکتے میں کھڑا رہتا اگر جو اس کا موبائل اسے اپنی سمت متوجہ نہ کر لیتا۔ چودہ مسڈ کالز اور کئی پیغامات تھے۔ سات مسڈ کالیں پلوشہ کی، چار ماما کی اور باقی اس کے دوستوں کی۔ وہ اپنی بے خودی پر خود ہی مسکرا دیا تھا۔

آفس آچکا تھا۔ عبداللہ نے گاڑی کے بریک لگائے اور ماضی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

ایم بی اے فائنل کی کلاس مکمل طور پر بھری ہوئی تھی۔ آج اسائنمنٹ جمع کروانے کا دن تھا۔ یہ ایک معروف یونیورسٹی تھی۔ سر عبداللہ جہانگیر کلاس میں داخل ہوئے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔ انہوں نے سی آر علی کو ایک گلاس پانی لینے بھیجا اور خود کلاس سے اسائنمنٹ جمع کرنے لگے۔ وہ ہر اسٹوڈنٹ کے پاس جاتے۔ اس کا نام پوچھتے، پھر اس کا اسائنمنٹ وصول کرتے۔ علی پانی کا گلاس لا کر ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔ اس نے سر کو متوجہ کیا۔ سر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر حنا کو مخاطب کیا کہ وہ جا کر اس گلاس میں سے آدھا پانی کسی پودے میں ڈال دے۔ حنا جب تک واپس آئی عبداللہ جہانگیر پوری کلاس سے اسائنمنٹ جمع کر چکے تھے۔ ہر پچھلے اسائنمنٹ کے جمع کرنے اور نیا لیکچر دینے سے قبل وہ اپنی کلاس کے ساتھ پندرہ منٹ کی گفت و شنید ضرور کرتے تھے۔ جسے وہ مائنڈ تھراپی کا نام دیتے تھے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی کلاس تھی۔

''سر کسی بھی انسان کی کامیابی کا راز کیا ہے؟''

محبت نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

''محبت یہ گلاس دیکھ رہے ہیں آپ، اس کو غور سے دیکھیں، آپ کو زندگی کا فلسفہ نظر آئے گا اور کامیابی کا راز بھی۔'' عبداللہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھے گیا۔

''میں سمجھا نہیں سر۔''

''ابھی سمجھاتا ہوں مگر اس سے پہلے آپ اس گلاس کو ایک جملے میں بیان کریں۔''

''سر، یہ گلاس آدھا پانی سے بھرا ہوا ہے۔'' محبت نے کہا۔ پھر سر نے حنا اور علی کو مخاطب کیا کہ اس گلاس کو describe کریں۔

''یہ شیشے کا گلاس آدھا خالی ہے۔'' حنا نے جواب دیا۔

''گلاس میں پانی ہے۔'' علی نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ عبداللہ نے ان تینوں کو اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر تمام اسٹوڈنٹس سے مخاطب ہوئے۔

''خدا نے ہر ایک کو کسی نہ کسی کام پر لگایا ہوا ہے۔ کسی کو گلاس بھرنے پر لگا دیا جیسا کہ میں نے علی سے کہا۔ کسی کو گلاس خالی کرنے پر لگا دیا، جیسا کہ حنا نے کیا اور پانی کا وہ حصہ جو اس گلاس سے الگ ہوا اس سے کوئی پودا سیراب ہوا۔'' انہوں نے گلاس کی سمت اشارہ کرتے ہوئے سب کو متوجہ کیا۔ کلاس میں گہری خاموشی تھی اور صرف عبداللہ کی آواز تھی جو پورے ماحول پر حاوی تھی۔

''دراصل اپنے فرائض کا صحیح ادراک ہی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ پھر میں نے محبت، حنا اور علی سے اس گلاس کے بارے میں رائے لی جو آپ سب نے سنی۔ ان میں بہترین جواب علی کا تھا۔ اہم یہ نہیں کہ گلاس آدھا بھرا ہے...... یا گلاس آدھا خالی ہے۔ اہم یہ ہے کہ گلاس میں پانی ہے۔ That's





Life...... یہ جو اندر کی چیز ہے نا بس یہی کام کی ہے۔'' عبداللہ نے گلاس میں موجود پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جو یہ راز جان لیتا ہے، وہ خدا کے کرم اور محنت کی عظمت کو پرکھ لیتا ہے پھر کامیابی خود آگے بڑھ کر اس شخص کے لیے اپنی بانہیں وا کر دیتی ہے۔'' عبداللہ جہانگیر کے لہجے کی گمبھیرتا سب کے دلوں پر چھاتی جا رہی تھی۔ پورا آڈیٹوریم مسحور تھا۔ ایک چھوٹی سی بات میں کتنا گہرا فلسفہ تھا۔ بات کے ختم ہونے کے بعد وہ واپس لیکچر پر آ گیا۔ پیریڈ کے ختم ہونے کے بعد جب اس نے باہر آ کر اپنا موبائل چیک کیا تو دُرِمکنون کا میسج آیا ہوا تھا۔

''آج پرل کانٹی نینٹل میں بزنس سیمینار اور افطار ڈنر ہے، بھولیے گا نہیں۔'' وہ میسج پڑھ کر مسکرا دیا۔ محبت نے اس سے کسی انسان کی کامیابی کا راز پوچھا تھا۔ اگر وہ کسی مرد کی کامیابی کا راز پوچھتا تو وہ بلاتوقف یہی جواب دیتا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے یہ ہاتھ اس کی بیوی دُرِمکنون کا تھا۔ مسکراہٹ ہنوز اس کے ہونٹوں پر تھی۔ دُرِمکنون کی شبیہہ دل میں بسائے وہ پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی۔'' کسی نسوانی آواز پر وہ مڑا مگر ایک دم ہی نظریں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ کشادہ گریبان کے ساتھ بہت خوب صورتی سے ساڑی لپیٹے ایک دلربا سا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ عبداللہ پہچان چکا تھا، وہ پلوشہ تھی۔ مگر اس نے چہرے پر پہچان کا تاثر نہ آنے دیا۔ بزنس سیمینار بہت شاندار تھا۔ عبداللہ جہانگیر کو ہمیشہ ہی ایسے سیمینارز سے کچھ اچھا سیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ یہ موقع کبھی مس نہیں کرتا تھا۔ پی سی کے وسیع ڈائننگ ہال میں افطار ڈنر کے بعد وہ عدنان قریشی سے اپنے نئے مقالے کی تعریف سن رہا تھا جو حال ہی میں ایک بین الاقوامی جریدے میں چھپا تھا۔ جب پلوشہ کے ایکسکیوزمی کہنے پر وہ مڑا اور ساکت رہ گیا۔

''آج بھی تم مجھے دیکھ کر نظریں جھکا لیتے ہو عبداللہ۔'' وہ دلکشی سے ہنسی تھی۔ آواز میں قدرے حیرانی کا عنصر تھا۔ وہ سات سال پہلے کا حوالہ دے رہی تھی جب عبداللہ واقعی پلوشہ کے احترام میں نظریں نیچی رکھتا تھا کیونکہ وہ اسے اپنی ہونے والی شریکِ حیات سمجھتا تھا مگر آج نظریں جھکانے کی وجہ احترام نہ تھا بلکہ پلوشہ کا لباس تھا جو ستر پوشی کے لیے ناکافی تھا۔ اسے دُرِمکنون کی پاکیزگی یاد آ گئی۔

''یقیناً تم نے پہچانا نہیں۔ پلوشہ ہوں ڈیئر، ہاں تھوڑی سی فربہ ہو گئی ہوں، پر تم تو آج بھی ویسے ہی ہینڈسم اور اسمارٹ ہو۔ گزرتے سالوں نے تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔'' وہ بہت پُرجوش تھی اسے اپنے سامنے دیکھ کر۔

''کیسی ہو؟'' عبداللہ کا لہجہ بہت سرسری تھا۔

''تمہیں کھو کر بہت خسارے میں ہوں...... اور آج تم سے مل کر یہ احساس اور بھی دوچند ہو گیا ہے۔ تم یہاں اکیلے نظر آ رہے ہو۔ لگتا ہے میری طرح تم بھی خسارے میں رہے ہو۔'' اس نے اپنے طور پر خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ اس لیے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''اکیلی تو تم بھی ہو۔'' وہ ابھی بھی اس کی سمت دیکھنے سے احتراز کر رہا تھا۔

''ارے نہیں، وہ کھڑے ہیں میرے ہزبینڈ طاہر عباس...... بزنس سرکل کے جھرمٹ میں۔'' اس نے کافی فاصلے پر کھڑے گروپ کی طرف اشارہ کیا۔ بہت دیر تک، بنا پلکیں جھپکائے وہ اس شخص کو دیکھتا رہا۔ پرانے زخم جیسے تازہ ہونے لگے تھے۔ وہ ایکسکیوزمی کہہ کر پلٹنے لگا۔



www.paksociety.com

''اونہوں، عبداللہ! یوں تو نہ جاؤ۔ کچھ اپنی کہو، کچھ میری سنو۔ اتنے دنوں بعد ملے ہیں۔ بہت خوشی ہورہی ہے تمہیں سامنے دیکھ کر۔ جلد بازی میں، میں نے تمہیں کھو دیا عبداللہ...... طاہر عباس سے یہ میری دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی جو اپنے کلاس میٹ اظہر سے کی تھی وہ نبھ نہ پائی......'' پلوشہ سمجھ رہی تھی وہ کچھ کہے گا، کوئی بیتی بات یا اظہارِ ہمدردی مگر وہ تو مہر بہ لب تھا۔ پلوشہ نے بات بدل دی۔

''آنٹی کیسی ہیں؟ اور...... اور مجھے اپنے گھر نہیں بلاؤ گے؟''

''ماما ٹھیک ہے...... اور گھر وہی ہے۔ ڈیفنس والا۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے گھر آنے کی دعوت نہیں دی تھی مگر گھر کا پتا ضرور دے دیا تھا۔

''اب میں چلتا ہوں، دیر ہورہی ہے۔ میری بیٹی میرا انتظار کررہی ہوگی۔'' اس نے پلوشہ کا جواب بھی نہ سنا اور اپنی بات کہہ کر لمبے لمبے قدم بڑھاتا باہر نکل آیا تھا۔

☆☆☆

عبداللہ نے اپنے پاپا سے بے فکری اور آزادی سے دن گزارنے کے لیے ایک مہینہ مستعار لیا تھا مگر اسے یہ پتا نہیں تھا کہ ایک مہینے بعد اسے یہ بے فکری اور آزادی پھر کبھی میسر نہ آئے گی۔

''عبداللہ اٹھو...... تمہارے پاپا کی بے حد طبیعت خراب ہے۔'' جانے رات کا کون سا پہر تھا ماما اسے جھنجوڑ رہی تھیں۔ بے حد برق رفتاری سے اپنے حواسوں کو بہ مشکل قابو میں رکھتے ہوئے وہ ماما کے ساتھ، پاپا کو اسپتال لے کر پہنچا تھا۔ ان کے سینے میں درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی حالت نازک تھی۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

''ماما...... یہ سب کیسے ہوا...... یوں دل کا دورہ...... پاپا کہاں کمزور پڑے ماما؟ دو دن قبل ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر شطرنج کی دو بازیاں کھیلی تھیں اور کل صبح ناشتے کی ٹیبل پر بھی وہ مجھے تو ٹھیک لگے تھے۔'' وہ آئی سی یو کے باہر کوریڈور میں لکڑی کی نشست پر اپنی ماں کے ساتھ لگا بیٹھا سوال پہ سوال کررہا تھا۔ جن کے آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح گرتے چلے جارہے تھے۔

''جب اعتبار کو ٹھیس لگتی ہے تو دل بہت کمزور پڑ جاتا ہے عبداللہ پھر لاکھ سنبھالو قرار نہیں آتا۔ صمد کی اپنے بزنس پارٹنر سے کافی دنوں سے کشیدگی چل رہی تھی۔''

''جمال انکل سے؟'' وہ حد درجہ شاکڈ تھا۔ ''مگر کیوں، وہ تو پاپا کے اچھے دوست تھے۔ پاپا کی شبانہ روز محنت اور جمال انکل کے سرمائے نے ہی ایس جے وڈ کو اتنا آگے بڑھایا تھا۔'' وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''ہاں! مگر جب انسان سود وزیاں کا حساب کرتا ہے تو تعلقات ماند پڑ جاتے ہیں۔ تمہارے آنے سے ایک مہینہ قبل بلال گنج میں ہمارے کارخانے میں آگ لگی تھی۔ کافی نقصان ہوا تھا۔ بس تب سے ہی جمال صاحب کے دل میں بال آگیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب صمد نے خود پوری فیکٹری کا دورہ کیا تھا اور ہر چیز کی جانچ پڑتال کی تھی تو آگ کیسے لگی۔ نوملین کی جوابدہی سر پر تھی، ڈیلرز اور سپلائرز کی رقوم بھی واجب الادا تھیں۔ ظاہر ہے جب نقصان تقسیم ہوئے تو نفع بھی تقسیم کی زد سے گزرا۔ جمال صاحب کے ستر فیصد شیئرز، ہیں اور تمہارے پاپا کے حصے میں تیس فیصد شیئرز آئے۔ رہی سہی کسر تب پوری ہوگئی جب تمہارے پاپا کے اعتماد کو دوسرا جھٹکا لگا۔ طاہر عباس، جسے تمہارے پاپا نے وڈ فنشنگ ڈیپارٹمنٹ سے اٹھا کر ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی پوسٹ تک پہنچایا تھا، وہ بھی جمال صاحب سے جا ملا اور جتنے بھی تمہارے پاپا کے قابلِ اعتماد ورکرز تھے، انہیں زیادہ سیلری اور دیگر مراعات کا لالچ دے کر اپنی طرف کرلیا۔ وہ تنہا رہ گئے تھے عبداللہ بالکل تنہا...... تنہا آدمی جلدی ٹوٹ جاتا ہے ہاں...... وہ بھی ٹوٹ گئے، ہار گئے۔'' وہ گنگ تھا اور لکڑی کی نشست پر جما بیٹھا اپنی ذہانت کو رو رہا تھا۔ لندن میں بھی اسے سب اچھا ہے کی رپورٹ ملتی رہتی تھی اور واپس آکر بھی وہ اپنے سوشل سرکل میں اتنا محو رہا تھا کہ ماما، پاپا کے بشاشت سے پُر چہرے کے پیچھے چھپے درد کی نوعیت نہ جان پایا۔

''یہ سب کیا ہے جمال انکل، آپ کا اور پاپا کا تو پچیس برس کا ساتھ تھا۔ آپ ایسا نہیں کرسکتے آپ کی وجہ سے وہ بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ فون پر چیخ پڑا تھا۔

''تم بزنس کے معاملات کو ذاتیات میں داخل کررہے ہو عبداللہ!'' ان کا سرد لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ ''حیرت ہے تم نے بزنس پڑھا ہے مگر بزنس کے داؤ پیچ نہیں جانتے۔ شیئرز کی یہ تقسیم اول روز سے ہمارے درمیان موجود تھی۔ تم چاہو تو قانونی چارہ جوئی بھی کرسکتے ہو مگر دھیان رکھنا کہ یہ تیس فیصد بھی ٹھکانے نہ لگ جائے۔'' وہ اسے جتا رہے تھے۔

''آپ نے تو صرف سرمایہ لگایا تھا مگر میرے پاپا کی تو پوری زندگی کی محنت اور قابلیت اس پر لگی ہوئی تھی۔ قابلیت کے بغیر آپ کا سرمایہ کیا ایس اینڈ جے کو اتنا آگے لے جاسکتا تھا؟'' ایک آگ تھی جو اُسے اندر سے خاکستر کررہی تھی۔

''اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو پھر بحث کس بات کی۔ تمہارے پاس قابلیت تو ہے ناں۔ جاؤ اپنے ڈوبتے ہوئے سرمائے کو بچالو۔ میرا وقت برباد مت کرو۔'' فون بند ہوچکا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رودیا۔

''آپ دیکھیے گا، میں آپ کے بزنس پرافٹ میں کئی زیروز کا اضافہ کردوں گا۔'' اضافہ تو بہت دور کی بات تھی حقیقتاً تو وہ سب زیرو پر آچکے تھے وہ اس وقت خود کو بے حد اکیلا اور تنہا محسوس کررہا تھا۔ اپنے ڈوبتے ہوئے بزنس کو بچانے کے لیے اس نے اپنے سارے دوستوں سے رابطے کیے تھے۔ سب کے پاس بہت مشورے تھے مگر کوئی بھی عملی طور پر اس کے شانے سے آکے نہ لگا۔ پلوشہ اور شائستہ خالہ بھی صرف دو بار پاپا کو دیکھنے آئی تھیں۔ انہیں بھی اس ہارٹ اٹیک کے پیچھے چھپی حقیقت کا پتا چل چکا تھا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔ ڈاکٹرز کی سرتوڑ کوششیں اور سب کی دعائیں بھی صمد جہانگیر کو زندگی کی طرف نہ لاسکی تھیں۔ بہت خاموشی سے وہ عدم کی راہ پر کوچ کرگئے۔ مسز سعدیہ جہانگیر اور عبداللہ کی زندگی میں کہرام بپا ہوگیا۔

''میں آپ کے بنا کچھ نہیں تھا پاپا اور نہ ہوں...... آپ کیوں چلے گئے...... ایک بار، صرف ایک بار تو اپنے دل کی بات کہی ہوتی۔'' وہ ان کے جنازے سے لپٹا شکوہ کناں تھا۔ آنکھیں شدتِ گریہ سے سرخ تھیں۔

صمد جہانگیر کے سوم سے اگلا دن تھا۔ جب ماں کے پاس آتے ہوئے اس نے غور سے اس لڑکی کو اور اس کی والدہ کو دیکھا جو چار دن سے سعدیہ کا سایہ بنی ہوئی تھیں۔ عبداللہ نے سوچنا چاہا کہ وہ اس لڑکی سے کہاں ملا ہے مگر دماغ جیسے کسی بھی مشقت سے انکاری تھا۔ سر جھٹک کر وہ اندر کی طرف آگیا جہاں شائستہ خالہ اور پلوشہ واپس جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ وہ لوگ صمد جہانگیر کے انتقال کے دن سے یہاں تھے۔ تنہائی میسر آتے ہی وہ پلوشہ کے




www.paksociety.com

نزدیک چلا آیا۔
''مت جاؤ پلوشہ پلیز! آئی ایم فیلنگ ویری لونلی۔'' اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ ماں کے سامنے وہ اپنے آنسو چھپالیتا تھا مگر پلوشہ...... وہ تو اس کی اپنی تھی۔ اس کی زندگی کی ساتھی بننے والی تھی۔
''میں آتی رہوں گی عبداللہ، تم سے اور آنٹی سے ملنے...... مگر فی الوقت میرا رکنا ممکن نہیں۔ پاپا بھی تو بیرون ملک کے ٹور سے واپس آنے والے ہیں پھر ان کے ساتھ آؤں گی۔'' پلوشہ کے لہجے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک تسلی تھی مگر اس وقت عبداللہ کا پلوشہ کے لہجے پر دھیان نہیں تھا۔ اس کے لیے تو یہی بہت تھا کہ پلوشہ اپنے ٹف شیڈول میں بھی اس کا خیال رکھتی ہے مگر یہ تسلی رسمی ہی رہی۔ وہ پھر کبھی وہاں پلٹ کر نہ آئی۔ وہ اس سے گریز برتنے لگی تھی۔ نہ فون پر بات کرتی اور نہ گھر پر ملتی۔ یہی پلوشہ تھی جو روز اس سے ایک گھنٹا بات کرنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ آخر ایک دن اسے پلوشہ کے گریز کی وجہ سمجھ آگئی جب اس نے اسے کسی لڑکے کے ساتھ اسی ریسٹورنٹ میں دیکھا جو اس کا اور پلوشہ کا فیورٹ ریسٹورنٹ تھا۔ آخر اس نے شائستہ خالہ کے موبائل پر فون کیا تاکہ پلوشہ سے بات ہوسکے۔
''پلوشہ تم مجھے کیوں اِگنور کر رہی ہو؟''
''میرے سیمسٹر چل رہے ہیں عبداللہ، میں آج کل بہت بزی ہوں۔''
''تم جھوٹ بولتی ہو، میں نے خود تمہیں کسی لڑکے کے ساتھ باہر گھومتے دیکھا ہے۔'' وہ جھنجلایا ہوا تھا۔
''اوکے...... اگر مجھے کسی کے ساتھ دیکھ چکے ہو تو صحیح سمجھے، میں واقعی تمہیں اگنور کر رہی ہوں کیونکہ جس عبداللہ جہانگیر کے ساتھ میں نے منگنی کی تھی اس کا ایک اسٹینڈرڈ تھا مگر تمہارے ساتھ شادی کرنے کا مطلب ہے میں اپنی زندگی کے کئی بہترین سال چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے ہوئے گزاردوں۔ اس وقت تمہارے پاس ایک بہتر ڈگری اور چند لکھے ہوئے مقالات پر ملے ہوئے سرٹیفکیٹس کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' فون عبداللہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ شاید وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر عبداللہ میں سننے کی تاب نہیں تھی۔
''جب اعتبار کو ٹھیس لگتی ہے تو دل بہت کمزور ہوجاتا ہے عبداللہ، پھر لاکھ سنبھالو، قرار نہیں آتا۔'' اسپتال کی نشست پر اس کے برابر میں بیٹھی ماں نے کہا تھا اور کتنا صحیح کہا تھا۔ اس پر یہ راز بھی ابھی کھلا تھا کہ پاپا نے اپنا سارا دکھ اس سے کیوں چھپایا تھا کیونکہ وہ اپنے جان سے عزیز بیٹے کو اس صدمے سے بچانا چاہتے تھے۔ اس نے بھی اپنا دکھ اپنے دل میں ہی اتار لیا تھا۔ ماں کے سامنے خود بُرا بن کے پلوشہ کو ہر الزام سے بری کردیا تھا اور منگنی کی انگوٹھی واپس بھجوادی تھی۔ سعدیہ جہانگیر نے لاکھ چاہا کہ عبداللہ یوں برسوں پرانا رشتہ نہ توڑے مگر عبداللہ نے سرد سے لہجے میں صاف کہہ دیا تھا کہ اسے اپنے بزنس کو واپس اسی مقام پر لانا ہے جو پاپا کی زندگی میں تھا۔ آگے زندگی جانے کیا کٹھنائیاں لائے وہ پلوشہ کو ان دکھوں اور تکلیفوں کا حصہ دار نہیں بنا سکتا اور یوں اس کی زندگی کا ایک اہم باب تمام ہوا تھا۔

☆☆☆

''جس کے پاس تین طلسماتی خوبیاں ہوں۔ اسے یوں سر جھکا کر ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔'' نسوانی آواز پر عبداللہ نے اپنا جھکا سر اٹھایا۔ وہ سنگی بینچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جو ایک بار پہلے اسے اسی پارک میں ملی تھی اور پھر پاپا کے انتقال کے بعد جس نے اس کی ماں کا بے حد خیال رکھا تھا۔





''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، نالج، ڈسپلن اور ہارڈ ورک، ان کو ساتھ لے کر چلنے سے ایک کے بعد ایک در کھلتا ہے۔'' بات کرتے ہوئے وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔
''یاد ہے آپ کو ہم پہلی مرتبہ اسی پارک میں ملے تھے۔ تب میں نے آپ سے کہا تھا دوسروں کو جاننے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان خود کو جانے مگر اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ صمد انکل اور سعدیہ آنٹی کے بیٹے ہیں اور ہمارے گھر سے تین گھر آگے رہتے ہیں۔ انکل جب بھی جوگنگ کے لیے ٹریک پر آتے اور مجھ سے ملاقات ہوتی تو وہ صرف آپ کی باتیں کرتے تھے اور سعدیہ آنٹی...... آنٹی ہمیشہ اپنے پرندوں سے صرف عبداللہ کی باتیں کرتی تھیں۔ ان دونوں کو آپ کے آنے کا بے حد انتظار رہتا تھا۔''
عبداللہ نے اس کی سمت غور سے دیکھا۔
''مجھے آنٹی نے بزنس کرائسس کا بتایا ہے۔ بزنس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں عبداللہ صاحب مگر آپ خالی ہاتھ نہیں ہیں۔ انکل نے مجھے آپ کے مقالے پڑھائے تھے۔ آپ میں علم کی شمع روشن کرنے کی اہلیت ہے اور ہمارے وطن کو آپ جیسے قابل اساتذہ کی ضرورت ہے...... اور آپ کی فوٹو گرافی کا شوق، وہ تو میں نے آپ کے گھر میں جابجا دیکھا ہے۔'' بات کرتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ عبداللہ کو اس کے قہقہوں کا جلترنگ یاد آیا۔
''ان دونوں چیزوں کو تھام کر آگے بڑھیں...... عبداللہ، روشن راہیں آپ کی منتظر ہیں۔'' اس نے صاحب کا لاحقہ ہٹا دیا تھا۔
''یہ میرے آفس کا کارڈ ہے۔'' اس نے اپنے اینی میشن ہاؤس کا کارڈ اس کے سامنے کیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ویسے مستقبل میں میرا ارادہ بھی ایک اینی میشن ہاؤس

عید کی گہما گہمیاں ستمبر دو ہزار بارہ کی دلچسپیاں
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مکڑجال
عالمی مفادات اور قوتوں کے زیرزمین تصادم پر ایک فکرانگیز اور ہولناک تحریر کاشف زبیر کے قلم سے
سرورق کی کہانیاں
محبت کی نرم گفتاریاں...... نفرت کی چنگاریاں......
دوستی کی دل فریبیاں...... اور دشمنوں کی عیاریاں...... دل پسند سرورق کی جھلکیاں
مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ
مغربی دنیا کے رسم واطوار...... معاشرت وتغیرات کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں
سحر انگیز سلسلے
للکار...... بدلتے ماحول اور گرجتے دشمنوں کی للکاریں
طاہر جاوید مغل کا معرکہ...... ایک نئی ڈگر
پرگامزن اسما قادری کا سلسلہ گرداب
چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے...... مشورے...... محبتیں......
شکایتیں...... اور نئی نئی دلچسپ باتیں...... آپ کے قلم سے
اور وہ سب جو جاسوسی کا خاصہ ہے



www.paksociety.com

کھولنے کا ہے۔" وہ اس بار کھل کر مسکرائی اور موتیوں کی طرح چمکتے دانت نظر آنے لگے۔
"اب میں چلتی ہوں مگر جاتے جاتے صرف اتنا ہی کہوں گی۔ جو عظیم شاعر اقبال نے کہا تھا۔
(میرے بعد میرے شعر پڑھ کر لوگ ان کے معنی سمجھیں گے اور یہ کہہ اٹھیں گے کہ ایک شخص جس نے خود کو پہچانا اس نے ایک دنیا کو بدل ڈالا) وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"سنیے، آپ نے آج بھی اپنا نام نہیں بتایا۔" پوری گفتگو میں وہ اب بولا تھا۔
"آپ نے شاید میرا وزیٹنگ کارڈ نہیں دیکھا۔" اس نے ننھا سا قہقہہ لگایا۔ "دُرِ مکنون نام ہے میرا۔" اس نے اپنا نام بتایا اور باہر جانے والے رستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عبداللہ اس کے قدموں کے نشان دیکھتا رہا۔ وہ جاتے جاتے یقین کا ننھا سا جگنو اس کے ہاتھ میں تھما گئی تھی اور اسی جگنو کو اپنی مٹھی میں دبائے وہ روشنی کے سفر پر نکل کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

آج اپنے آفس سے واپسی پر عبداللہ کا پورا ارادہ تھا کہ وہ دُرِ مکنون اور سوہا کو عید کی شاپنگ کے لیے ضرور لے جائے گا مگر بُرا ہو ٹریفک کا کہ رش میں پھنسے پھنسے کافی وقت نکل گیا اور جب وہ گھر پہنچا تو اذان ہونے میں صرف کچھ لمحے ہی رہتے تھے۔ جیسے ہی وہ لاؤنج سے ملحقہ ڈائننگ روم میں پہنچا اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ پلوشہ ٹیبل پر موجود تھی اور سعدیہ اس کی موجودگی سے بے حد خوش ہر چیز اس کے سامنے رکھتی جا رہی تھیں۔ افطاری میں کافی اہتمام تھا اور شاید سب کچھ پلوشہ کے اعزاز میں ہی تھا۔
"پاپا! دیکھیں آپ کی کزن آئی ہیں۔" سوہا عبداللہ کو دیکھ کر چہکی، اس نے کچھ نہ کہا اور ہاتھ دھو کر ٹیبل پر بیٹھ گیا اور آہستگی سے صرف سلام کیا۔
"دیکھو تم نے تو مجھے نہیں بلایا مگر میں خود ہی چلی آئی۔ آنٹی سے ملنے کا بہت دل کر رہا تھا اور باقی سب سے بھی۔" پلوشہ نے جوش سے کہا اور اسی وقت اللہ اکبر کی صدا گونجی اور سب افطار کی طرف متوجہ ہوگئے۔ عبداللہ کے چہرے پر بہت سنجیدگی تھی اس نے صرف کھجور کھائی اور شربت کا گلاس پی کر اٹھنے لگا۔
"کیا ہوا عبداللہ، لیں ناں۔ ابھی تو اذان ہو رہی ہے۔" دُرِ مکنون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"نہیں، سر میں درد ہے میرے۔" وہ سنجیدگی سے کہتا کرسی دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اسے نماز کے لیے مسجد جانا تھا۔
"شاید عبداللہ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔" پلوشہ سعدیہ جہانگیر سے مخاطب تھی۔ اس نے بھی ہاتھ روک لیا تھا۔
"ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔ واقعی اس کے سر میں درد ہوگا۔ تم نے کیوں ہاتھ روک لیا کھاؤ ناں......" وہ پھر سے اس کی پلیٹ بھر رہی تھیں۔ دُرِ مکنون کو بھی عبداللہ کا انداز کھٹکا تھا۔ عبداللہ ہرگز بھی اتنے اِل مینرڈ نہ تھے کہ کسی مہمان کے آنے پر یوں اوور ری ایکٹ کریں۔
"وہ کیوں آئی ہے یہاں۔" مسجد سے آکر وہ ماں کے کمرے میں موجود تھا۔ پلوشہ، دُرِ مکنون اور سوہا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ سعدیہ نے پلوشہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ڈنر کر کے جائے اور یہ ڈنر بھی پلوشہ کے اعزاز میں تھا۔ ورنہ رمضان میں ان کے گھر صرف سحری اور افطاری ہی بنتی تھی۔





"کیا ہوگیا ہے عبداللہ، کیوں ایسی بات کر رہے ہو، یہ اس کی خالہ کا گھر ہے۔ وہ آسکتی ہے۔ تعلق توڑ دینے سے رشتے ختم نہیں ہو جاتے اور ویسے بھی منگنی تم نے توڑی تھی اس نے نہیں۔" وہ آج بھی حقیقت سے لاعلم تھیں۔ وہ بہ مشکل خود کو ان کے سامنے سچ کہنے سے روک پایا تھا۔
"ویسے بھی وہ کرائسس میں ہے۔ پہلی شادی نبھ نہ سکی اور دوسرا شوہر بھی اچھا شریکِ زندگی نہیں ہے، اولاد بھی نہیں ہے اب تک کہ وہ بچوں میں لگ کر ہی بہل جائے۔" سعدیہ حقیقتاً اس کے لیے افسردہ تھیں۔
"ماما! آپ حقیقت نہیں جانتیں ورنہ شاید یوں نہ کہتیں۔" اس کے لہجے میں تاسف کی رمق تھی۔
"اگر حقیقت جانتی ہوتی عبداللہ تب بھی تم سے یہی کہتی کہ ہر پرانی بات بھول جاؤ اور صرف اتنا یاد رکھو کہ یہ اس کی خالہ کا گھر ہے اور وہ جب چاہے ملنے آسکتی ہے۔" ان کے حتمی لہجے میں کہی بات پر وہ چپ ہوگیا تھا۔
کھانے کے وقت بھی وہ ٹیبل پر موجود نہ تھا۔ اس نے دُرِ مکنون سے کہہ کر چائے کمرے میں ہی منگوالی تھی۔ کھانے کے بعد پلوشہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دُرِ مکنون، عبداللہ کے رویے پر بے حد شرمندہ تھی۔
"آئی ایم سوری پلوشہ...... عبداللہ آج آپ کو کمپنی نہ دے پائے۔ ان کے سر میں درد ہے۔"
"میں سمجھ سکتی ہوں دُرِ مکنون اور اس کا ناراض ہونا بھی جائز ہے۔ میں اس کی منگیتر تھی۔ اسے مجھ سے بے حد محبت تھی مگر ہماری شادی نہ ہو پائی۔ سات سال بعد سامنے دیکھ کر شاید وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پایا ہو۔ اس لیے کچھ وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوگا۔" پلوشہ اپنی دانست میں اسے حقیقت سے آگاہ کر رہی تھی اور دُرِ مکنون کی ساری وضاحت دم توڑ چکی تھی۔ کتنا مشکل تھا بیوی ہوتے ہوئے کسی غیر عورت سے یہ سننا کہ وہ اس کے شوہر کو اس سے زیادہ جانتی ہے۔ عبداللہ کی کوئی منگیتر تھی۔ دُرِ مکنون یہ بات جانتی تھی مگر محبت...... اس لفظ کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ اسی وقت بیڈروم کا دروازہ کھلا اور عبداللہ باہر آیا۔
"چلو آؤ پلوشہ...... میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" اس کا لہجہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔
"دیکھا، میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اسے صرف وقت چاہیے۔ مجھے پتا تھا عبداللہ آج بھی میری کیئر کرتا ہے۔" پلوشہ نے تفاخر سے مسکراتے ہوئے دُرِ مکنون کی سمت دیکھا اور وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اس نے عبداللہ کی طرف نگاہ کی وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر کی ہی بات تھی پھر وہ پلوشہ کو باہر آنے کا کہہ کر پورچ کی طرف مڑ گیا۔ سارا سفر خاموشی سے کٹا۔ عبداللہ نے سوائے گھر کا پتا پوچھنے کے پلوشہ سے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔
"تمہارا گھر آگیا ہے۔" اس نے گاڑی پلوشہ کے گھر کے سامنے روکی۔
"تھینک یو عبداللہ!"
"تھینکس کہنے کی ضرورت نہیں...... میں نے تمہیں اس لیے گھر ڈراپ نہیں کیا کہ مجھے تمہاری آج بھی پروا ہے بلکہ مجھے ایسا کرنے کے لیے میری ماما نے کہا تھا۔"
"کیا ہم ساری پرانی باتیں بھول کر پھر سے اچھے دوست نہیں بن سکتے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہیں کھو کر سب کچھ کھو دیا ہے۔" احساسِ زیاں اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔
"اور میں نے تمہیں کھو کر وہ بھی پالیا جس کا شاید میں حقدار نہیں تھا مگر تم واقعی خسارے میں رہی

www.paksociety.com

ہو کہ تمہیں طاہر عباس جیسا دھوکے باز شخص ملا۔ جس نے پہلے میرے پاپا کو دھوکا دیا اور اب وہ تمہیں یعنی ڈاکٹر پلوشہ اور اس کی خوب صورتی کو اپنے بزنس سرکل میں کیش کرواتا ہے۔'' وہ اسے آئینہ دکھا کر گاڑی زن سے بڑھالے گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب پلوشہ کبھی اس کی زندگی میں نہ آئے گی اور نہ اس کے گھر آئے گی۔

ایک مشہور شاپنگ مال سے اس نے دُرِ مکنون کے لیے دو تین سوٹ خریدے اور ساتھ میچنگ کی چوڑیاں اور جیولری بھی۔ بارہ بجے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو بے حد خاموشی تھی۔ ماما اور سوہا کا پتا تھا کہ وہ دونوں سو چکی ہوں گی مگر دُرِ مکنون وہ عبد اللہ کے بنا کبھی نہیں سوتی تھی۔ جب تک ایک ہاتھ عبداللہ کے سینے پر نہ رکھ لے اسے نیند نہیں آتی تھی۔ بقول اس کے جب تک آپ کے دل کی دھڑکن محسوس نہ کروں میری پلکوں پر نیند کی دیوی مہربان نہیں ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ دُرِ مکنون اس وقت کہاں ہوگی۔ شاپنگ بیگز اٹھائے وہ آہستہ روی سے چلتا ہوا ٹیرس پر آ گیا۔ وہ بڑے سے جھولے پر پیر سمیٹ کر بیٹھی تھی اور چہرہ گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

''ابھی تک جاگ رہی ہیں؟'' عبد اللہ اس کے برابر میں آ بیٹھا۔

''آپ کے بنا نیند کب آتی ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ عبد اللہ نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا وہاں اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

''پلوشہ نے جو باتیں کیں آپ ان سے پریشان ہیں نا؟'' اس کے پوچھنے پر دُرِ مکنون کا سر بے ساختہ اثبات میں ہل گیا۔

''دُرِ مکنون! بعض اوقات ہم غلط لوگوں کو اپنا مرکز مان کر ان کا محیط بن جاتے ہیں پھر زندگی.... ہاتھ پکڑ کر ہمیں اس غلط دائرے سے نکالتی ہے اور ہمارا صحیح مرکز ہمیں دکھاتی ہے۔ اور میرا مرکز آپ ہیں۔ یہ گھر ہے' ماما ہیں اور سوہا ہے...... ہاں، وہ میری منگیتر تھی اور منگیتر سے انسیت ہو جانا ایک فطری بات ہے مگر وہ میرا ماضی بھی تو تھی اور ماضی نہ آپ کا حال ہوتا اور نہ مستقبل۔ ماضی صرف گزرا ہوا وقت ہوتا ہے جو کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامے کہتا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی اور آنکھوں میں صرف دُرِ مکنون کا عکس تھا۔

''مما، بابا...... یہ آپ لوگ اتنی رات کو کیا کر رہے ہیں؟'' سوہا آنکھیں مسلتی ٹیرس پر چلی آئی۔ شاید وہ نیند سے جاگ گئی تھی۔

''وہ بیٹا ہم چاند تلاش کر رہے ہیں۔'' عبداللہ گڑبڑایا اور دُرِ مکنون کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''کیا...... چاند......؟'' اس کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔ ''بابا آپ کیسے بزنس مین ہو۔ یہ بھی نہیں پتا کہ 28th کو چاند نظر نہیں آتا۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا گویا عبداللہ کی عقل پر ماتم کیا ہو۔

''اوہ! سو...... سوری، میں تو بھول گیا۔'' عبداللہ نے جھٹ کان پکڑے۔ ''پر آپ کیوں اٹھ گئیں، چلو میں آپ کو سلاؤں۔'' وہ اسے گود میں اٹھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

دُرِ مکنون دونوں کو اندر جاتا دیکھتی رہی۔ سوہا باپ کے شانے سے لگی ان سے چاند رات پر چوڑیوں اور مہندی کے لیے باہر جانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ وہ مسکرا دی اور پاس رکھے شاپنگ بیگز کھول کر دیکھنے لگی۔ ساری شاپنگ لاجواب تھی۔ وہ عبداللہ کی اتنی گہری محبت اور احترام پر دل ہی دل میں خدا کے حضور شکر بجالائی۔ چاند بے شک آج نہیں نکلا تھا مگر اسے حقیقتاً یہی لگ رہا تھا کہ آج ہی اس کی عید ہے۔

# عید کہتے ہیں جسے

شیریں حیدر

رمضان شروع ہونے سے بھی پہلے میری ساس کو عید کی فکر لاحق ہو گئی تھی، ہر سال ایسا ہوتا تھا، کوئی نئی بات نہ تھی، میں ان کا انداز اور اس کے پیچھے چھپی فکر کو بھی جانتی تھی اور ہر سال وہی ہوتا آ رہا تھا جو وہ چاہتی تھیں۔

''عید پر کیا کیا ہوگا بھئی......!''

''سب کچھ ہو جائے گا امی جان......'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ ہر سال کی طرح آخری دن

www.paksociety.com

تک بازاروں میں چکر لگانے کے بجائے رمضان شروع ہونے سے قبل ہی تمام خریداری کرلیتیں تو.......“

”اس سال تو خریداری کے لیے کوئی حالات نہیں ہیں امی جان......“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”آپ سے کون سی بات چھپی ہے، مہنگائی بھی ہے اور پھر آپ کے دل کی بیماری نے تو اس سال سارا بجٹ متاثر کردیا ہے، ایک کامل کمانے والے ہیں اور ہزاروں خرچے......“

”بس کرو ہما......“ امی جان نے چڑ کر کہا۔ ”تمہیں تو رونے کی عادت سی ہوگئی ہے، ارے کون سی کمی ہے ہمارے پاس...... کامل کی تنخواہ کے علاوہ زمینوں کی اچھی خاصی آمدنی بھی تو ہوتی ہے......“

اب میں ان سے کیا کہتی کہ زمین کی آمدنی ان کے اکاؤنٹ میں جاتی تھی جہاں پر رقم صرف جمع ہوتی تھی کبھی نکالی نہیں جاتی تھی۔ کامل نے بتایا کہ پہلے پہل ان کی بہنوں کے لیے اماں اس اکاؤنٹ میں سے رقم نکال کر ہی استعمال کرتی تھیں مگر مجھے اس گھر میں آئے چھ سال ہو چلے تھے، امی جان پہلے کامل اور ابا کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھیں، میرے آنے سے ایک فرد کا اضافہ ہوا اور پھر آنے والے چار سالوں میں دو مزید افراد کا۔

میرا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں بیٹیوں کی تربیت میں ایک بات مدِنظر رکھی جاتی ہے کہ جہاں ان کا نصیب لکھا ہو، اس گھر کے حالات کے مطابق اپنی خواہشات کے گھوڑے کو روک کر رکھیں۔ میرے اندر طمع تھی نہ بھوک...... کبھی کامل سے مانگ کر کوئی چیز نہ لی، اگرچہ دل بھی چاہتا مگر کبھی اپنا آپ ہلکا نہ کیا۔ کامل کبھی کبھار مجھے کچھ رقم دے دیتے تو میں اپنی انتہائی ضرورت کی کوئی چیز لے لیتی، کبھی اپنی کسی خواہش کو پورا کرلیتی مگر اسراف نہ کرتی۔ جانتی تھی کہ کامل پر اماں اور ابا کے علاوہ اپنی بہنوں کی ذمے داریاں بھی تھیں اور اماں جو بقول کامل میری شادی سے پہلے اپنی رقم خرچ کرلیتی تھیں لیکن میں نے اس کا مظاہرہ بالکل نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ جان بوجھ کر امی جان ایسے ایسے اخراجات نکال لیتیں کہ میں نے کبھی سنے بھی نہ ہوتے۔ کامل سے حیرت کا اظہار کرتی تو وہ اپنے بہنوئیوں کا قصور گردانتے کہ کس طرح وہ بے غیرتی سے ہمیشہ وصولی کو تیار رہتے تھے۔

مثلاً میری نند کی بیٹی کے ہاں چوتھے بچے کی ولادت پر بھی ہمیں نند کی طرف سے پیغام آیا کہ اس کی مبارکباد دینے کے لیے آئیں چونکہ اس کی شادی ایک امیر خاندان میں ہوئی ہے اس لیے اس کی حیثیت کے مطابق تحائف بھی لائیں۔ ایک نند کے شوہر کا بازو فریکچر ہوگیا تو ان نند صاحبہ کا حکم آیا کہ ان کو اسپتال کا بل ادا کرنے کی پیش کش کی جائے، کامل نے کہا کہ ان کی اتنی گنجائش نہیں۔ تب وہ نند بھائی سے بددل ہوگئی اور کافی عرصہ سیدھے منہ بات نہ کی، جب تک کہ اسے کسی موقع پر خوش نہ کیا۔ ایسی کئی باتیں تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ ان بہنوں کو بھائی کا احساس تھا اور نہ ہی امی جان انہیں منع کرتیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ امی کی حمایت انہیں حاصل تھی۔

میرے میکے کی طرف سے حالات بہت اچھے تھے اور اس پر کامل کی اچھی عادات نے سب کو ان کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ میری شادی کے بعد رمضان شروع ہوتے ہی امی جان نے بتا دیا تھا کہ میں عید پر اپنے میکے نہ جاسکوں گی کیونکہ ان کی ساری بیٹیاں اپنے میکے آتی تھیں۔ ان کی کئی کئی برس سے بیاہی بیٹیوں کا میکے آنا ہر سال ضروری ہوتا تھا مگر میرے لیے انہوں نے شروع سے ہی مختلف معیار سیٹ کردیا تھا۔ دل تو بہت برا ہوا مگر کامل نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے عید کے دن میرے میکے ضرور لے کر جائیں گے۔ میں نے اپنی امی کو بتادیا تھا اسی لیے وہ رمضان شروع ہوتے ہی میرے ہاں رمضان اور عید کا سامان لے کر آئیں۔

امی جان تو یہ سب دیکھ کر بہت خوش تھیں کیونکہ امی گھی، چینی، سویاں، ڈبے کے دودھ کے پیکٹ، خشک میوے اور پھلوں کے علاوہ مٹھائی اور گھر بھر کے عید





کے جوڑے لائی تھیں۔ کامل نے یہ سب کچھ ناگواری سے دیکھا اور امی سے احترام کے ساتھ کہہ دیا کہ انہیں یہ سب کچھ بہت برا لگا ہے۔

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہم ہما کو یہ سب کچھ مہیا نہیں کرسکتے؟“ امی تو گڑبڑا گئیں مگر کامل کی امی نے بات کو سنبھال دیا۔

”ارے بیٹا...... یہ ریت رواج ہیں۔ دنیا کے سبھی ماں باپ کرتے ہیں، اور ہوتا کس لیے ہے سب کچھ ماں باپ کے پاس، اولاد کے لیے ہی نا!“

”میں ایسے کسی ریت رواج کو نہیں مانتا اور نہ ہی میں سکت رکھتا ہوں اس طرح کے تحائف کو لوٹانے کی!“

”لو بھلا تم کیوں پریشان ہوتے ہو...... یہ تحفے تحائف تمہیں کیوں لوٹانا ہوں گے؟“ امی جان نے ابرو اُچکا کر کہا۔ ”ارے تحفے دینا تو سنت ہے، ساری بیٹیوں کے ماں باپ دیتے ہیں!“

”کیوں؟“ کامل نے بحث کی تھی۔ ”بیٹیوں کے ماں باپ کو سزا ہے کیا اس بات کی؟ اور اگر تحفے دینا سنت ہے تو مجھے یقین ہے کہ تحفے لینا اور دینا دونوں سنت ہوں گے......“

”ہاں ہاں......“ امی جان گڑبڑا گئیں۔ ”وہ تو ہے......“ انہوں نے اپنا شیفون کا گلابی سوٹ اپنی گود میں بچھا رکھا تھا۔

”بس آنٹی ہم اس میں سے کچھ تحائف رکھ لیتے ہیں مگر یہ جو آپ راشن وغیرہ لائی ہیں، یہ آپ کو واپس لے کر جانا ہوگا!“ کامل کا لہجہ اٹل تھا۔

”مگر بیٹا کامل......“ امی پریشان ہوگئیں۔ ”یہ تو اچھا نہیں لگتا۔“

”مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا۔“ انہوں نے پورے کمرے میں پھیلے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹا...... میرے گھر میں بہوئیں ہیں، کس طرح یہ سامان واپس لے کر جاؤں گی، سو سو قیافے لگائیں گی وہ۔“



خدارا ◉ خدارا
شوگر کے مریض
ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کردیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کردیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہوکر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کرلیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.paksociety.com

''آپ یوں کریں آنٹی کہ ہما کو بھی ساتھ ہی لے جائیں اور انہیں بتا دیں کہ ہما ساتھ آ گئی ہے اس لیے اس کی سحر و افطار اور عید کا سامان وہاں نہیں چاہیے تھا۔'' کامل کا لہجہ ایسا اٹل تھا جو واضح بھی تھا اور چھپا ہوا بھی۔ امی پریشان سی ہو گئیں۔

''اچھا امی...... آئندہ آپ اس طرح......''

''آئندہ نہیں......'' کامل نے میری بات کاٹی۔

''میں خود کو عجیب گھٹیا سا محسوس کروں گا ہما اگر تم نے یہ سامان رکھا تو......'' میں نے بے بسی سے امی کو دیکھا اور سامان سمیٹنے لگی۔

''کامل پاگل ہو گئے ہو تم......'' امی جان بولیں۔

''ارے...... وہ یہ سامان گھر لے کر جائیں گی تو ان کی بہوئیں سو سو باتیں کریں گی!''

''امی جان......'' کامل نے قطعیت سے کہا۔

''آپ بھی عورت ہیں، آنٹی بھی، ہما بھی، میری بہنیں بھی اور ہما کی بھابیاں بھی......'' ہم کامل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''اگر آپ عورتیں ایک مرد کے مثبت اقدام کو نہیں سراہیں گی تو میں کہوں گا کہ سارے بگاڑ کی ذمے دار آپ عورتیں ہیں نہ کہ مرد...... مجھے اتنا یقین ہے کہ کسی اور کا نہیں تو کم از کم میں آج آنٹی کا ذہن تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور ان کے توسط سے ان کے چار بیٹوں کا جو اس کے بعد اس طرح کے رسوم و رواج کے نام پر اپنی بیویوں کے میکے والوں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے۔''

لحاظ آڑے تھا، ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کامل کے گلے لگ جاؤں۔

''ہما تم اپنا اور امی کا سوٹ رکھ لو اور ہاں مٹھائی بھی اور ذرا چائے بنا لو تا کہ ہم سب مل کر اس موقع پر مٹھائی بھی کھائیں، میں تب تک یہ سامان آنٹی کی گاڑی میں رکھوا دوں......'' میرا چھوٹا بھائی جو امی کے ساتھ آیا تھا، اٹھ کر بے ساختہ کامل کے گلے لگ گیا۔

''کامل بھائی...... آپ گریٹ ہیں!'' کامل نے اسے گلے لگا کر تھپکا۔

''شکر ہے یار کسی نے تو میری سوچ کو سراہا، ان خواتین میں سے تو کسی نے میرے لیے تالی بھی نہیں بجائی!'' کامل کے کہنے پر سب ہنس دیے۔ اس وقت نہ سہی مگر بعد میں تنہائی میں، میں نے کامل کو جی بھر کر شاباش دی کہ وہ خوش ہو گئے۔

☆☆☆

صرف یہیں پر اکتفا نہیں تھا...... دو روز کے بعد کامل گھر لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، وہ لفافہ انہوں نے وہیں میز پر رکھ دیا، میرے استفسار پر کہنے لگے کہ امی جان کے آنے پر بتائیں گے۔ جتنی دیر میں، میں نے چائے بنائی، امی جان بھی نماز پڑھ کر آ گئیں۔ چائے پی کر کامل نے لفافہ کھولا، اس میں ایک زنانہ اور دو مردانہ جوڑے تھے۔ ہم دونوں سوالیہ نظروں سے کامل کو دیکھ رہے تھے۔

''رمضان شروع ہونے سے پہلے تم اور امی جان جا کر یہ تحفے آنٹی، انکل اور اعزاز کو دے آنا۔'' انہوں نے کہا تو امی جان بالکل خاموش رہیں۔

''اس کی کیا ضرورت تھی کامل؟'' میں نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''کوئی بھی یہ تحائف قبول نہیں کرے گا کامل بلکہ ابو تو الٹا ناراض ہوں گے......''

''کیوں، ان کے بیٹے ان کو کوئی تحفہ دیں تو وہ خوش ہونے کے بجائے ناراض ہوتے ہیں؟ یا پھر میں ان کا بیٹا نہیں؟''

''ایسی بات نہیں ہے کامل......'' میں سٹپٹا کر امی جان کی طرف دیکھنے لگی۔

''مگر ہم نے تو ان کے ہاں سے آئے ہوئے صرف دو جوڑے رکھے تھے؟'' امی جان بولیں۔

''کیا تحفے حساب کتاب کر کے دیے جاتے ہیں یا پھر سود کا کاروبار ہے یہ بھی؟'' کامل نے کہا۔ ''اس روز اعزاز آیا تھا، وہ میرے لیے بھائی جیسا ہے، اس لیے میں اسے تحفہ دینا چاہتا ہوں اور یوں بھی وہ واحد شخص ہے جس نے میرے جذبے کی قدر کی تھی...... ورنہ تو یہاں کسی میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ کوئی میرے لیے تالیاں ہی بجا دیتا......'' کامل نے کہا تو میں چور نظروں سے امی جان کو دیکھنے لگی کہ کہیں وہ کامل کی بات کا مطلب نہ سمجھ گئی ہوں۔ ''کاش کوئی میرے بہنوئیوں کو بھی غیرت کا درس دے دے۔''

''نہ دو تم کچھ بھی بیٹا اپنی بہنوں کو......'' امی جان نے غصے سے کہا۔ ''ابھی تو میں زندہ ہوں، خود دے سکتی ہوں انہیں سب کچھ۔''

''معلوم ہے مجھے۔'' کامل نے ہنس کر اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ''سچ امی جان، اب میرے بس کی بات بھی نہیں رہی یہ سب...... آپ نکالیں نا اپنی پٹاری میں سے اپنا زیور اور اپنے اکاؤنٹ میں سے بھی کچھ خرچ کر لیا کریں!''

''زیور کتنا ہے میرے پاس؟'' امی جان نے کہا۔ ''اور اکاؤنٹ میں رقم اپنے کفن دفن، قل، دسویں اور چالیسویں کے لیے جوڑ رکھی ہے۔''

''یہ سب کچھ تو میں نہیں کرنے والا۔'' کامل نے ہنس کر کہا۔

''تم کون ہو میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔ ''میں نے سب بیٹیوں کو بتا رکھا ہے اور ویسا ہی ہو گا جیسا میں چاہتی ہوں!''

''کاش آپ نے اس رقم کے استعمال کا کوئی مثبت مصرف بتایا ہوتا۔'' کامل کہہ کر اٹھ گئے اور امی جان تنقیدی نظروں سے ان جوڑوں کا جائزہ لینے لگیں۔

☆☆☆

امی جان اور نندوں کی رنگ برنگی باتیں سنتے اور برداشت کرتے ہوئے کامل کی سنگت میں زندگی کے کئی سنہرے برس بیت گئے اور میری گود میں حرا اور اکمل کے تحائف آ گئے۔ میں ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے اڑا دیتی تھی کیونکہ کامل کہتے ہیں کہ لوگوں کا کام ہی یہ ہے کہ تمہیں پریشان رکھیں اور ان کی ساری توانائیاں اس بات پر ہی صرف ہوتی ہیں، تم پروا کرنا چھوڑ دو...... اور ہوا بھی یہی کہ جب میں نے ان کی باتوں پر دھیان دینا اور کڑھنا چھوڑ دیا اور ہنس کر ٹال جاتی تو ان کے پاس ایسی منفی باتوں کا جواز کوئی نہ رہا۔

امی جان کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور کامل انہیں لے کر اسپتال بھاگے، میں بچوں کی وجہ سے رک گئی اور بعد میں امی کو بلا کر بچوں کے پاس چھوڑا اور اپنی نند کشور کے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔ وہ اب بہتر حالت میں تھیں اور ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ دو ایک دن اسپتال میں رکھ کر ان کا باقاعدگی سے چیک اپ ہو گا، فی الحال آپریشن کی ضرورت نہ تھی، دوائیں دے کر انہیں دو دن کے بعد رخصت کیا جانا تھا۔ اچانک ہی اتنا بڑا خرچہ آن پڑا تھا، اسپتال کا ایک لمبا چوڑا بل!

اس روز امی جان کو اسپتال سے فارغ کیا جانا تھا اور میری ساری نندوں نے ہمارے ہاں آنے کا ارادہ کر رکھا تھا، انہیں تو تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے ہوتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوئی تو سوچا کہ نہانے سے پہلے امی جان کے بستر کی چادر تبدیل کر دوں، سو ان کے کمرے کی صفائی کی اور چادر تبدیل کرنے کے لیے ان کے کمرے کی الماری کھولی، یہ الماری عموماً لاک ہوتی تھی مگر اس روز اس میں تالا لٹک رہا تھا، غالباً امی جان نے کھولی ہو گی اور بند کرنا بھول گئیں۔ میں نے گلابی پھولوں والی ایک چادر نکالی جو باقی چادروں کے عقب میں پڑی تھی، یہ چادر میں نے اتنے سالوں میں کبھی بچھی ہوئی نہیں دیکھی تھی، جو چادر امی جان نکال کر دیتی تھیں، میں وہی بچھا دیتی تھی۔ اس چادر کو کھینچا تو کوئی بھاری سی چیز اس میں سے نیچے گری۔

پوٹلی نما کوئی چیز تھی، میں نے تجسس سے مجبور ہو کر اسے کھولا تو وہ بھاری زیورات سے بھری ہوئی پوٹلی تھی! میں خوف سے لرزنے لگی، اس پوٹلی کا وزن کم از کم ڈیڑھ کلو تو ہو گا۔ کیا وہ سب اصلی سونے کے زیورات تھے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ ممکن ہے کہ ساری بیٹیوں کا زیور اپنے پاس رکھا ہوا ہو۔ مگر اتنا زیور







www.paksociety.com

گھر پر رکھنا کوئی عقلمندی تو نہ تھی اور اتنے سالوں میں مجھے کبھی علم ہی نہیں ہوا تھا کہ ان کے پاس اتنا سونا ہے اور وہ بھی گھر میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس پوٹلی کو واپس اسی چادر میں لپیٹا اور چادر وہیں رکھ دی، پھر اسی چادر کو جھاڑ پونچھ کر بچھایا اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

لاؤنج میں سب بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا اور ہر دوسرے تیسرے دن امی جان کی مزاج پرسی کا بہانہ کر کے ساری بہنیں ہمارے ہاں افطاری پر جمع ہو جاتیں۔ اس دفعہ تو کامل نے کمال ہی کر دیا۔ انہوں نے امی جان سے کہا کہ وہ اپنے اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکال کر دیں کیونکہ ان کے پاس گنجائش نہ تھی۔ امی جان نے ابرو اُچکا کر کامل کو دیکھا، کامل نے کہا کہ یہ جو ہر تیسرے دن ساری بہنیں آ جاتی ہیں، اس پر اتنا خرچہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے عید کے کپڑے بھی نہیں بنوا سکے، بہنوں اور ان کے بچوں کے لیے بھی انہوں نے اس سال جوڑے بنانے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ میں کامل سے اتنی بڑی بات چھپا ہی نہ سکی تھی، اور کامل نے امی جان سے رقم اور زیور نکلوانے کے لیے منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ کامل کا کہنا تھا کہ یہ زیور اب انہیں کبھی بھی استعمال تو کرنا نہیں تھے اور میری سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ امی جان نے کبھی اس زیور پر زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی، کم از کم میرے علم میں نہیں تھا، کامل نے اپنا پورا منصوبہ مجھے بتا دیا تھا۔

''کشور باجی، آپ کے محلے میں کوئی بیوہ عورت تھی نا جسے میں ہر سال زکوٰۃ دیتی تھی۔'' میں نے اپنی بڑی نند سے پوچھا۔

''ہاں وہ تو ان سردیوں میں فوت ہو گئی تھی۔ اس کی ایک بیٹی ہے۔ لوگوں کے کپڑے وغیرہ سی کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔''

''اسے زکوٰۃ تو دے سکتی ہوں نا میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں، ہاں......'' انہوں نے کہا۔

''یہ اسے دے دیجیے گا!'' میں نے ایک چھوٹا سا ڈبا ان کی طرف بڑھایا۔

''اس میں کیا ہے ہما؟'' انہوں نے ڈبا کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''ارے یہ تو ٹیکا ہے تمہارا...... ہمارے گھر کا!'' ان کے کہنے پر سب کے کان کھڑے ہو گئے بالخصوص امی جان کے۔

''ہما......'' انہوں نے فوراً پوچھا۔ ''یہ کیوں دے رہی ہو اسے، کوئی مصنوعی تو نہیں یہ۔''

''امی جان! میں زکوٰۃ میں کوئی مصنوعی چیز کیونکر دوں گی؟'' میں نے فوراً کہا۔ ''میرے پاس اس سال رقم نہیں ہے تو زکوٰۃ کے لیے میں نے تخمینہ لگوا کر یہ ٹیکا نکال دیا ہے، کون سا مجھے یہ ٹیکا پہننا ہے۔''

''پہننا یا نہ پہننا...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے، مگر یوں تھوڑی.... اپنے زیور تم ایک، ایک کر کے ہر سال زکوٰۃ میں دینا شروع کر دو گی۔'' امی جان نے مجھے سمجھایا۔ ''پیسے نہیں ہیں تو نہ دو زکوٰۃ، یہ تو کہیں نہیں لکھا ہوا کہ زکوٰۃ دینے کے لیے اپنے زیور بیچنا شروع کر دو!''

''یہی حکم ہے امی جان!''

''کس کا حکم ہے؟'' امی جان نے غصے سے استفسار کیا۔

''میرے اللہ اور رسول کا......''

''ہم نے تو ایسا کچھ سنا نہ دیکھا......''

''مگر میں نے یہی سنا اور دیکھا ہے اور ہمیشہ اس پر عمل ہوتے دیکھا ہے اپنے گھر میں۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''کیوں آپی...... آپ لوگ بھی تو دیتی ہوں گی نا اپنے زیور وغیرہ کی زکوٰۃ؟'' میں نے مڑ کر اپنی نندوں سے سوال کیا تو ان کے جوابات امی جان کے جوابات سے کافی مشابہ تھے۔ مثلاً اتنے پیسے ہوتے ہی کہاں ہیں، زیور تو بیٹیوں کی نیت سے سنبھال رکھا ہے، اب تو خریدنے کی سکت نہیں، ہم کون سا اس زیور کو پہنتے ہیں جو زکوٰۃ واجب ہو...... میں نے کافی دلیل اور تاویل دی مگر امی جان نے یہ کہہ کر اس موضوع کو بند کرنے کا حکم دیا کہ مجھے زیادہ ملانی بننے اور ان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے خاموشی مناسب سمجھی کہ مجھے ان کو قائل تو بالآخر کرنا تھا مگر پہلے دن اتنا کافی تھا۔

''کامل یہ پرائز بانڈ بیچ کر آپ قربانی کے لیے بکرا ابھی لے آئیں۔'' میں نے ایک لفافہ انہیں تھمایا، اس میں پرائز بانڈ نہ تھے، یونہی ہم نے اس طرح پلان کر رکھا تھا کیونکہ پرائز بانڈ کی انعامی رقم کو بھی ہمارے ہاں جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

''مگر قربانی تو اس عید پر نہیں ہوتی؟'' ایک نند نے حیرت سے کہا۔

''ہاں مگر ایک تو عید کے بعد قربانی کے جانور مہنگے ہو جاتے ہیں اور دوسرے کچھ عرصے قربانی کے جانور کو گھر رکھ کر پالنے سے اس سے اُنسیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کو قربان کرتے وقت ہم کچھ نہ کچھ تو تکلیف محسوس کرتے ہیں جو کہ قربانی کی اصل روح ہے۔''

''ہم تو اس سال قربانی نہیں کر رہے بھئی......'' ایک نند نے کندھے اچکا کر کہا۔

''مگر کیوں؟'' کامل نے پوچھا۔

''بھئی لوڈ شیڈنگ اس قدر ہے، فریزر وغیرہ کام ہی نہیں کرتے تو قربانی کا گوشت کیسے سنبھالیں گے؟''

''تو بانٹ دیجیے گا سارا گوشت، جتنا پکا کر کھا سکیں وہ رکھ لیں۔'' میں نے انہیں حل بتایا۔

''مگر سنت کے مطابق تو تیسرا حصہ اپنے ہاں رکھنا فرض ہے نا۔'' انہوں نے بحث کی۔

''فرض نہیں...... وہ تو طریقہ بتایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اتنا گوشت آپ اپنے ہاں رکھ سکتے ہیں۔''

''اچھا چلو بحث کا کیا فائدہ، قربانی کون سا فرض ہے۔'' انہوں نے بحث ہی ختم کر دی۔



''میری ساس نے تو کہا ہے کہ ہم قربانی کے بجائے تیسرے حصے کی رقم غریبوں میں بانٹ دیں گے، اس مہنگائی کے دور میں کون پندرہ بیس ہزار کا جانور لے، ہمارے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ اس طرح تیسرے حصے کی رقم غریبوں کو دے دینے سے ہمیں قربانی کا ثواب مل جائے گا۔'' انہوں نے عجیب سی بات کی۔ کون سا مولوی اس طرح کے گناہ و ثواب کے احکامات دے سکتا ہے۔'' مگر ان سب سے بحث کس طرح کرتی کہ مذہب کے بارے میں پڑھنے لکھنے کے بعد بھی ان کی معلومات وہی تھیں جو امی جان نے ان کی تربیت میں اپنے انداز سے شامل کی تھیں۔

بصد کوشش بھی امی جان نے وہ ٹیکا زکوٰۃ میں نہیں دینے دیا کہ لوگ کیا کہیں گے، اور کامل سے کہا کہ جیسے بھی ہو وہ رقم کا بندوبست کریں کہ زکوٰۃ دی جا سکے۔

''مگر امی جان، میں نے تو مشکل سے رقم اکٹھی کی ہے کہ بہنوں کی عیدیاں جانی ہیں۔'' کامل نے کہا تو امی جان نے کہا کہ وہ رقم زکوٰۃ کے لیے استعمال کر لیں، بہنوں کی عیدی کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کر لیں گی۔

☆☆☆

''آپ نے اپنی زکوٰۃ دے دی ہے امی جان؟'' کامل نے چھٹی کے دن لاؤنج میں بیٹھ کر تلاوت کرتی امی جان سے سوال کیا۔

انہوں نے جواب میں قرآن پاک سے نظر اٹھا کر کامل کو عینک کے عقب سے دیکھا۔ کامل نے اپنا سوال دُہرایا۔

''کون سے زیور کی؟''

''جو آپ کے پاس ہے اپنا۔'' کامل نے کہا۔ ''بہت پہلے میں نے ایک دفعہ ایک پوٹلی سی دیکھی تھی!'' کامل نے ہوا میں تیر چلایا۔

''وہ پوٹلی......'' وہ گڑبڑا کر سنبھلیں۔ ''اس میں سے میں نے ان چار کو زیور نہیں دیا اور ہما کو زیور نہیں

www.paksociety.com

ڈالا کیا؟"

"ہما کو تو آپ نے فقط ایک سیٹ دیا تھا امی جان، باقی تو اس کے اپنے گھر کا تھا...... اور مجھے یاد ہے کہ وہ پوٹلی کافی بڑی تھی، اس میں کم از کم دو کلو سونا تو ہوگا۔"

"ارے باؤلے ہوئے ہو کیا......" انہوں نے قرآن پاک کو بند کر دیا۔ "یوں بھی اس زیور پر تو زکوٰۃ نہیں بنتی، میں نے کون سا وہ خود خریدا ہے، وہ تو میری بری اور جہیز کا تھا یا پھر تمہارے ابا نے کبھی کبھار جو تحفتاً کوئی چیز دی ہو تو......"

"جو بھی ہے اور جیسے بھی ہے امی جان، وہ زیور آپ کا ہے اور اس پر زکوٰۃ دینا آپ پر فرض ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم تو......" ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ "میں کون سا کماتی ہوں جو زکوٰۃ دوں؟"

"امی جان......" کامل نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر دبایا۔ "جذباتی نہ ہوں اور نہ ہی غصہ کریں...... اگر آپ زکوٰۃ نہیں دینا چاہتیں تو میں آپ کی زکوٰۃ دینے کو تیار ہوں مگر میں نہیں چاہوں گا کہ قیامت کے دن آپ اس بات پر نادم ہوں کہ لاعلمی میں آپ سے کتنا بڑا گناہ ہو گیا ہے۔ آپ کی ساری عبادتیں اور ریاضتیں...بیکار ہیں اگر احکاماتِ الٰہی میں سے صرف ان پر عمل کر لیا جائے جو ہمیں آسان لگتے ہیں اور جہاں قربانی اور مشقت آتی ہے وہاں ہم سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔"

"کامل...... میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ زکوٰۃ کی اتنی سختی ہے۔ یہی سنا ہے کہ سب سے پہلا سوال نماز کا ہو گا اور بے نمازی پہلی منزل پر ہی سزا میں مبتلا ہو جائے گا۔"

"صرف اللہ جانتا ہے امی جان کہ کسی بے نمازی کے نامۂ اعمال میں وہ کون سا عمل ہو گا جو اس کا پلڑا ہم جیسوں سے بھاری کر دے گا جو چاہے نمازیں تو پڑھتے ہیں مگر جانے کون کون سی کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں!"

"مگر بیٹا......" امی جان متذبذب تھیں۔ "میں نے تو کبھی زکوٰۃ دی ہی نہیں، اب کیسے علم ہو گا کہ کس طرح اور کتنی زکوٰۃ دینا ہو گی۔"

"آپ فکر نہ کریں...... مجھے زیور دکھا دیں، میں کسی سے آپ کی زکوٰۃ کا تخمینہ لگوا لیتا ہوں!" بڑی شدّومد کے بعد وہ راضی ہوئیں۔

ایک دن کامل ہمیں ساتھ لے کر ایک سنار کی دکان پر گئے جہاں انہوں نے پہلے سے بات کر رکھی تھی۔ سنار نے وہ زیور کی پوٹلی ہاتھ میں اٹھائی اور بتایا کہ اس کا وزن ڈیڑھ کلو سے بھی زیادہ تھا۔ تاہم اس نے تفصیل سے سارا سامان ہمارے سامنے کھول کر اس میں سے موتیوں اور ملاوٹ کا اندازاً وزن منفی کیا اور بتایا کہ اس میں سے ایک سو بیس تولے خالص سونا تھا۔ میری تو حیرت سے بری حالت تھی اور کامل کی بھی مگر امی جان اطمینان سے بیٹھی تھیں۔ کامل نے سنار سے چالیس سال کے سونے کے نرخ چیک کرنے کا کہہ رکھا تھا جو کہ اس نے چیک کر کے ایک کاغذ پر لکھ رکھے تھے، وہ کاغذ ہم نے اس سے لیا اور سارے زیورات کو سنبھال کر پوٹلی میں ڈالا، سنار نچلی منزل پر جا چکا تھا، کامل نے وہ پوٹلی میرے بیگ میں پڑے ہوئے ڈائپرز کے لفافے کو خالی کر کے اس میں رکھی اور ڈائپرز وہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیے۔ جس لفافے میں پوٹلی آتے وقت تھی اس میں چند اور چیزیں ڈال کر وہ کامل نے خود پکڑ لی اور ہم روانہ ہوئے۔ واپسی کے سفر میں کامل مڑ مڑ کر دیکھتے رہے کہ کہیں ہمارا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔

اس طریقے سے ہم نے بہت بڑا رسک لیا تھا اور اب کامل کا ارادہ تھا کہ اس زیور کو گھر پر نہ رکھا جائے۔ کامل نے لاکر پہلے سے لے رکھا تھا، واپسی پر اس میں سارا زیور رکھوا کر ہم گھر لوٹے۔ اب امی جان کو تھوڑی سی پریشانی لگ گئی کہ کتنی زکوٰۃ دینا ہو گی، ان کا ارادہ تھا کہ جو گزر گیا اسے بھول جائیں مگر کامل ٹلنے والے نہ تھے۔ وہ بہت کٹر مذہبی تو نہ تھے مگر

www.paksociety.com





ان کی معلومات اور عمل کافی حد تک انہیں دوسروں سے ممتاز کرتے تھے۔

☆☆☆

"آپ کو معلوم ہے امی جان کہ جو سونا آپ کی ملکیت ہے اس کی اندازاً لاگت بہتر لاکھ ہے......" کامل کا یہ کہنا تھا کہ امی جان اور میرے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ "اور امید ہے کہ آپ کا بینک بیلنس بھی اتنا تو ہو گا کہ آپ اس میں سے ایک لاکھ اسی ہزار اس دفعہ کا اور باقی سترہ لاکھ پچھلی زکوٰۃ کی مد میں دے سکیں۔" کامل کا کہنا تھا کہ امی جان کا چہرہ پیلا ہو گیا۔

"کک...... کیا کہہ رہے ہو تم؟ مجھے اس طرح کے مذاق پسند نہیں......" انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔

"اگر اتنا کیش نہیں ہے تو اس میں سے تینتیس تولے سونا دے دیں۔" کامل نے انہیں دوسرا آپشن بتایا تو وہ اور بھی ناراض ہو گئیں۔

"جو میں مروں تو بیٹیوں کو کیا ملے گا؟"

"آپ نے اس زیور کو تو پہننا نہیں ہے، تو بیٹیوں کو دینے کے لیے مرنے کا انتظار کرنا ضروری نہیں امی جان، آپ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کو یہ سارا زیور دے دیں تو بہتر ہے۔"

"ہاں اپنے ہاتھوں سے دے دوں تاکہ لوگ کہیں کہ بہو کو کچھ نہ دیا اور بیٹیوں کو دے گئی۔" انہوں نے دلیل دی۔ "بس میں بہو کو بتا دوں گی کہ کون سا زیور کس کو دینا ہے۔"

"اور اگر آپ کی بہو نے اس پر عمل نہ کیا تو......" کامل نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں نہ کرے گی، مرنے والے کی وصیت پر عمل کرنا تو لازم ہے نا......"

"امی جان اگر کوئی مرنے والا اپنی زندگی میں کوئی چیز کسی کو تحفتاً دے جائے تو اس کو کسی قانون کی رو سے نہیں لیا جا سکتا مگر اس کے بغیر مرنے والے کی ملکیت کو شرعی طور پر تقسیم کیا جائے گا...... یعنی آپ کی زکوٰۃ ادا کر کے جو لگ بھگ نوے تولے سونا بچے گا اس میں سے تیس تولے مجھے اور پندرہ پندرہ تولے ساری بہنوں کو ملے گا...... جانے کون پہلے مرتا ہے امی جان، میں تو یونہی آپ کو بتا رہا تھا۔" کامل نے ترپ کی چال چلی۔

"ائے ہئے...... ایسی باتیں کیوں کرتے ہو بیٹا!" ان کا دل پسیجا۔ "اگر اتنا سونا زکوٰۃ میں نکال دوں تو ان نمانیوں کو کیا ملے گا، سوچا تھا کہ انہیں تیس تیس تولے مل جاتا تو......"

"چلیں ٹھیک ہے، میں اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہوں، آپ زکوٰۃ کے بعد باقی بچنے والا سارا سونا ان چاروں کو دے دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اچھا تو اگر مرنے والا اپنی زندگی میں کچھ دیے بغیر مر جائے تو وراثت کی تقسیم کیسے ہوتی ہے؟" امی جان نے پوچھا۔ کامل نے انہیں تفصیل سے سب بتایا، وہ ہولے ہولے سر ہلا کر سنتی رہیں۔

"کامل بیٹا، تم ذرا کسی سے اس گھر کا تخمینہ تو لگواؤ۔"

امی جان کے اس حکم نے ہماری رات کی نیند اڑا دی تھی، ہمیں لگا کہ ہمیں کسی نے اچانک سڑک پر کھڑا کر دیا ہو۔ یہ گھر امی جان کے نام تھا اور اگر وہ اسے بیچ دیتیں تو ہم کیا کرتے۔ کامل تو کہتے تھے کہ امی جان کے بعد وہ اس گھر کا تخمینہ لگوا کر بہنوں کا حصہ ان کو کسی نہ کسی طرح دے دیں گے اور ہم یہیں ٹکے رہیں گے مگر اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے ہمیں سونے نہ دیا یہاں تک کہ سحری کا وقت ہو گیا۔

"کیا بات ہے ہما...... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر انہوں نے سوال کیا۔

"جی بس نیند نہیں آئی، ویسے تو ٹھیک ہوں!" میں نے نظر چرا کر کہا اور سحری بنانے چل دی۔

"تم دونوں ہی نہیں سوئے رات؟" سحری کھاتے ہوئے امی جان نے کہا۔ "کہیں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تم دونوں کے بیچ؟" انہوں نے کامل سے پوچھا۔

"ارے نہیں امی جان...... اللہ نہ کرے، بس یونہی ذرا طبیعت بوجھل سی تھی!" کامل نے کہا۔ سحری ختم ہوئی تو امی جان کامل کو یاد کروانا نہ بھولیں کہ انہوں نے گھر کا تخمینہ لگوانا تھا، انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ایک دفعہ تو میرے دماغ میں آئی بھی کہ کیوں ہم نے انہیں زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا تھا، الٹا ہم مسئلے میں الجھ گئے تھے مگر دن کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے دل کو تسلی ہوئی کہ جو اللہ کی رضا پر راضی ہوتے ہیں انہیں اللہ کبھی مایوس نہیں کرتا...... تو ہمیں کیوں کرے گا، میں نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆

"پچپن لاکھ......" کامل نے امی جان کو بتایا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

"کیوں بیچنا چاہتی ہیں آپ گھر کو؟" کامل نے ہولے سے پوچھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں گھر کو بیچنا چاہتی ہوں؟" انہوں نے حیرت سے کامل کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"جب کوئی بندہ کسی جائیداد کا تخمینہ لگوا رہا ہو تو اس کا مقصد بیچنا ہی ہوتا ہے نا۔" کامل نے جواب دیا۔ "مگر مجھ سے تو کچھ پراپرٹی ڈیلروں نے رابطہ بھی کیا ہے...... ان کو تو بس علم ہونا چاہیے اس کے بعد جان نہیں چھوڑتے!"

"جو بھی پوچھے، تم بتا دو کہ ہم نہیں بیچ رہے اپنے گھر کو، یہ گھر تو تمہارے ابا نے میرے لیے بڑے ارمانوں سے بنوایا تھا۔ میں گاؤں سے شہر نہیں آنا چاہتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے شہر کے اسکولوں میں پڑھیں، بس مجھے خوش کرنے کو انہوں نے یہ گھر بنوایا اور پچیس سال ہونے کو آئے ہیں، دیکھ لو اس عمارت کی مضبوطی کو۔" انہوں نے آہ بھری۔ "خود انسان کی کوئی گارنٹی نہیں مگر اس گھر کو بنانے والے کاریگر کہتے تھے کہ سو سال تک اس گھر کو کچھ نہیں ہونے والا۔" واقعی ان کا کہنا درست تھا، گھر بہت کشادہ اور آرام دہ تھا، ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ان کا اس گھر کو بیچنے کا ارادہ بدل گیا تھا۔

☆☆☆

امی جان کامل کے ساتھ بینک جاکر اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوا لائی تھیں۔ دس لاکھ کی رقم رکھ کر باقی انہوں نے نکلوا لی تھی، انیس لاکھ کی رقم انہوں نے کامل کو دی تھی اور کامل نے وہیں سے وہ رقم مختلف اداروں کے زکوٰۃ فنڈ میں دے دی تھی۔ بیس تولے کے لگ بھگ زیور تھا جو انہوں نے میرے حوالے کیا کہ اسے زکوٰۃ میں دے دوں، میں نے بے ساختہ ان کا ہاتھ چوم لیا اور وہ زیور اپنے خاندان میں ہی ان بچیوں کے لیے دے دیا جن کی شادیاں جلد متوقع تھیں۔

"امی جان، اللہ آپ کو اس دنیا میں بھی اس کا صلہ دے گا، آپ دیکھیے گا!" میں نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"میرا دل آج اندر سے مطمئن ہے بیٹا...... میں نے مذہب کو اتنا ہی جانا جتنا ہمیں بتایا گیا تھا، کامل کے ابا تو پڑھے لکھے تھے مگر انہوں نے بھی کبھی اس انداز سے نہ سوچا تھا جس طرح کامل سوچتا ہے...... جو انہوں نے سوچا ہوتا تو آج اکٹھا میرا اتنا بڑا نقصان تو نہ ہوتا......" وہ سسکیں۔

"یہ نقصان نہیں امی جان، یہ تو آپ نے اللہ کی راہ میں دیا ہے۔"

"توبہ استغفار!" وہ اپنے گال پیٹنے لگیں۔ "مجھے معاف کر دینا میرے مولا...... جانے کیا اول فول بک گئی!" مجھے ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ "اور ہاں فون کر کے سب کو عید کی دعوت دے دینا تم!"





انہوں نے مجھ پر ایک اور خرچہ ڈالا" اور ہاں!" انہوں نے مجھے اٹھتے ہوئے پکارا۔ "یہ پکڑو......" انہوں نے ایک خاکی لفافہ میری طرف بڑھایا۔ "یہ کل ہمایوں دے گیا تھا، گاؤں کی زمینوں کی آمدنی ہے۔ اڑھائی لاکھ ہیں، رمضان، عید، میرے دوا دارو اور بکرے کی خریداری کے لیے کافی ہوں گے۔" میں ششدر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مگر یہ تو آپ کے ہیں......" میں ہکلائی۔

"مجھے کون سا قبر میں ساتھ لے کر جانا ہیں یہ...... آج بھی تمہارا حق ہے اور کل بھی!" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہاں...... ذرا احتیاط سے خرچ کرنا، اس دفعہ ذرا فصل اچھی نہیں ہوئی تو کافی کم رقم آئی ہے ورنہ ہر سال چار پانچ لاکھ تو آ ہی جاتے ہیں......" میں حیرت میں بری طرح غوطہ زن تھی۔

"اپنا عید کا جوڑا بھی اس دفعہ میری طرف سے بنا لینا......" انہوں نے مجھے ایک اور ڈبکی دی۔

"لیکن وہ مم...... میں؟" میں ممنائی۔

"کیا میں، میں......" انہوں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ "صرف کہتی ہو امی جان...... سمجھتی نہیں ہو نا، ورنہ یوں نہ کہتیں!"

"یہ بات نہیں ہے امی جان!" میں نے کہا۔ "میرے پاس تو بہت سے جوڑے پڑے ہیں ان میں سے کوئی بھی پہن لوں گی۔"

"میرے پاس بھی تو بہت سے جوڑے تھے، پھر تم نے میرے لیے کیوں بنایا؟"

"اچھا بنا لوں گی......" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس روز مجھے ٹوٹ کر ان پر پیار آ رہا تھا، میں نے تو کبھی اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی تھی مگر ان کا رویہ مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا...... شاید ساری ماؤں کی طرح ان سے بیٹے کی محبت میں شراکت برداشت نہ ہوتی تھی اور اس روز پہلی دفعہ انہوں نے دل سے مجھے بیٹی سمجھا تھا۔

## غزل

آسماں تسخیر کر کے دیکھنا ہے
آپ کو تقدیر کر کے دیکھنا ہے

چاند تارے سب ہمارے ہی ہیں لیکن
ان کو اب زنجیر کر کے دیکھنا ہے

رائگاں ہوں کیوں مرے جذبات آخر
عشق پُرتاثیر کر کے دیکھنا ہے

مجھ کو اب اپنے خیالوں کی چمک سے
چارہ گر تصویر کر کے دیکھنا ہے

سحر کرتا ہے نگہ سے اس طرح اب
زہر کو اکسیر کر کے دیکھنا ہے

جس قدر بھی خواب دیکھے میں نے خانمؔ
سب کو اب تعبیر کر کے دیکھنا ہے

فریدہ خانمؔ، لاہور

☆☆☆

"بتائیں نا امی...... کیا سرپرائز رکھا ہے آپ نے ہمارے لیے عید کے دن کا؟" میری چھوٹی نند نے پوچھا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ امی جان نے ان سے ایسا کچھ کہہ رکھا تھا، میں اٹھ کر ان کے تحائف نکال لائی کہ یہی سرپرائز ہوگا۔

"پہلے تم سب لوگ بتاؤ کہ اپنی بھاوج اور بھتیجے بھتیجی کے لیے کیا تحفے لائی ہو؟" مجھ سمیت سب حیرت سے امی جان کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"تحفے...... ہم؟" دوسری نند نے حیرت سے



www.paksociety.com

پوچھا۔ ”ہم نے کیوں تحفے لانے تھے؟“

”تم لوگوں کو صرف تحفے لینے آتے ہیں۔“ امی جان کا کہنا تھا کہ سب کے منہ بن گئے، وہ اپنے تحفے کھولنا بھی بھول گئیں۔

”زیادہ منہ پھلانے کی ضرورت نہیں...... تحفے دینا اور لینا دونوں سنت ہیں۔“ انہوں نے کامل کی کئی برس پہلی کی کہی ہوئی بات دُہرائی۔ ”آپس میں چاروں بھی تو تحفے تحائف لیتی دیتی ہو، اب اسے بھی اپنی بہن جیسی سمجھو، اسے بھی پیار سے رکھو ورنہ میرے بعد اس گھر کے دروازے بھی تم پر بند ہو سکتے ہیں۔“

”ارے نہیں امی جان......“ میں نے فوراً کہا۔

”تم چپ بیٹھو ہما......“ میں نے تو ساری بہنوں کو اپنے شوہروں کے سامنے خفت سے بچانے کو کہا تھا۔

”ہاں تو سنو...... کان کھول کر تم لوگ!“ امی جان نے کہا۔ ”اس عید کا خاص الخاص تحفہ تم لوگوں کے لیے ہے، کہ......“ وہ رکیں تو سب کو بے تابی ہونے لگی۔

”جلدی بولیں امی...... اختلاج ہونے لگا ہے اب تو!“ کشور باجی نے بے تابی سے کہا۔

”ہاں بھئی یہ رہے تم لوگوں کے تحائف......“ انہوں نے چار ڈبے نکالے اور ان کے ہاتھوں میں بند کے بند پکڑا دیے...... ”اب جس کا جو نصیب۔“ انہوں نے ساری بہنوں کو زیورات کے ڈبے پکڑا دیے۔ وہ سب کھول کھول کر دیکھنے لگیں، ان کے شوہروں کی آنکھیں کھل گئیں، انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مصنوعی زیورات نہ تھے۔

”یہ کیوں دے رہی ہیں ہمیں......“ منجھلی نند نے پوچھا۔

”میرے زیور ہیں میری ملکیت...... جسے چاہے دوں!“ انہوں نے اترا کر کہا۔ ”جہیز بھی تم لوگوں کو اچھے دیے تھے اور اب یہ تمہارا باقی ماندہ حصہ ہے، ہر حصے کی مالیت اتنی ہے کہ اس سے دگنی مالیت اس گھر کی ہے جو میں کامل کو اس کے حصے کے طور پر ہبہ کر رہی ہوں!“ انہوں نے کہا تو میرے دل پر ٹھنڈی سی پھوار پڑی، واقعی میرے اللہ سے زیادہ کوئی ہمارے دلوں کا حال اور ہماری ضرورتیں نہیں جانتا۔

”اس سارے کی لکھت پڑھت ہو چکی ہے اور کاغذات کامل کے پاس ہیں۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ رقم رکھی ہے جو میرے مرنے کے اخراجات کے بعد کامل شرعی حصے کر کے تم لوگوں کو دے گا اور اپنا حصہ اپنے پاس رکھے گا...... ہاں گاؤں کی زمین اس کے ابا اپنی زندگی میں ہی اس کے نام کر گئے تھے اور اس کی آمدنی کامل ہی کی ہو گی، مگر جب بھی وہ اس زمین کو بیچنے کا سوچے تو اس کی مرضی ہے کہ تم لوگوں کو بھی اس میں سے کچھ حصہ دے دے۔“

ساری بہنیں غور سے سن رہی تھیں اور زیورات نے جیسے ان کے شوہروں کی نظر میں ان کا وزن بڑھا دیا تھا۔

”اور ایک اہم بات......“ وہ ذرا سا رکیں تو سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ”اپنے زیورات کی زکوٰۃ ضرور دینا...... اس سے تمہارا مال طاہر ہوتا ہے اور کسی غریب کی مدد بھی ہو جاتی ہے۔“ ان کے منہ سے وہی الفاظ ادا ہو رہے تھے جو کامل نے انہیں قائل کرنے کو کہے تھے۔

”تھینک یو امی......“ کشور باجی نے اٹھ کر امی کا بوسہ لیا تو باقی بہنیں بھی نیند سے جاگیں اور امی سے لپٹ گئیں۔

”کسی کو میرے فیصلوں پر کوئی اعتراض تو نہیں......“ امی جان نے پوچھا تو سب کے سر نفی میں ہلے۔ ”تم لوگ بھی میرے بیٹوں جیسے ہو اور کامل کے عمل سے ضرور سیکھو کہ بیٹیوں کے ماں باپ کو بیٹیاں پیدا کرنے پر سزا تو نہیں کہ وہ عمر بھر اُن کی ذمے داری اٹھائے رکھیں...... اپنی زندگی میں ہی میں نے ہر طرح اپنے فرائض نبھائے ہیں مگر میرے بعد اس بات کا خیال رکھنا کہ جتنا یہ ہما کا خیال رکھیں گی، وہ بھی اتنا ہی ان کا خیال رکھے گی۔“ وہ سب تابعداری سے سر جھکائے ہوئے سن رہے تھے۔

بڑے نندوئی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے دو نوٹ نکالے اور میرے بچوں کو عیدی دی۔ ان کی تقلید میں باقی سب نے بھی۔

”حرا...... میری جان...... مجھ سے عیدی نہیں لو گی؟“ امی جان نے اسے پکارا۔

وہ لپک کر دادو کی گود میں جا بیٹھی...... اور اپنے ہاتھ میں پکڑے سارے نوٹ دادی کی گود میں ڈال دیے۔ ”یہ ہم دونوں کی عیدی ہے دادو......“ انہوں نے چٹ پٹ اس کی بلائیں لیں اور ایک چھوٹا سا ڈبا نکال کر اس کو دیا، حرا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”اگر میں زندہ رہی تو خود دوں گی ورنہ جب میری حرا دلہن بنے تو اسے یہ تحفہ میری طرف سے دینا، یہ میری دادی نے مجھے دیا تھا۔“ میں جانتی تھی کہ اس ڈبے میں دس تولے کے دو کنگن تھے، سارے زیورات میں نے ہی ان کی ہدایت پر پیک کیے تھے۔

”اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے امی جان۔“ میں ملول ہو گئی اور ان کا ہاتھ تھام لیا جو کہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”کھانا کھایا جائے بھئی......“ کامل نے ماحول کو اداس ہوتے دیکھ کر کہا تو ہم سب اٹھ کر کھانا لگانے لگے۔

☆☆☆

”کتنے چالاک ہیں آپ۔“ میں نے اس رات کامل کے کندھے پر سر ٹکا کر کہا۔ ”آپ کو سب علم تھا کہ امی جان کیا کر رہی ہیں اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں، معلوم ہے کہ میں کتنی پریشان ہو جاتی تھی بسا اوقات۔“

”ہیں...... تم نے ہی تو مجھے تسلی دی تھی کہ اللہ ہمارے لیے بہتر ہی کرے گا۔“ کامل نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اور خود پریشان ہوتی رہیں۔“

مجھے کچھ جواب نہ سوجھا۔

”یہ لو......“ کامل نے میری طرف ایک لفافہ بڑھایا، میں نے وہ لفافہ پکڑا اور حیرت سے انہیں دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”گھر کے کاغذات......“ انہوں نے کہا۔ ”تمہارا عید کا تحفہ...... یہ گھر میں نے تمہارے نام پر رجسٹری کروایا ہے۔“

”لیکن!“ میں نے حیرت سے پوچھنا چاہا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں...... امی جان نے کہا تھا ایسا کرنے کو۔“ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں اسی وقت اٹھی، امی جان کے لیے میرے پاس شکریے کے الفاظ بھی نہ تھے اور صبح تک انتظار کرنے کی ہمت بھی نہیں۔

”تم اس کی سب سے زیادہ مستحق ہو ہما...... میں جانتی ہوں کہ کامل مذہب کو جانتا اور سمجھتا تو ہے مگر تم جیسی سمجھدار بہو نے اپنے عمل سے ثابت کیا ہے کہ تمہیں اپنی اور اس گھر کے ہر مکین کی دنیا اور آخرت کا احساس ہے اور تمہارے اس عمل نے جانے مجھے روز قیامت کس کس شرمندگی سے بچایا ہے۔“ میں ان کے گلے سے لگی بیٹھی تھی۔ ”اللہ تمہیں سلامتی اور زندگی دے اور اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“

”اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے امی جان......“ میں نے دل سے انہیں دعا دی۔

میں نے زندگی میں ایسی خوب صورت عید کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد آنے والی ہر عید پر میں نے اپنی ساری نندوں کو بھی اس بات پر قائل کر لیا کہ عید اپنی خوشیوں کا نہیں بلکہ دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹیں اور قہقہے بکھیرنے کا نام ہے۔





www.paksociety.com

# خوشیوں سے بھرپور یادگار عید

شائستہ زریں

عید کا چاند اُبھرا تیری یاد کے ساتھ
چاندنی میں تیری یاد کی خوشبو پھیلی

عید خوشی کا دوسرا نام ہے اور کیوں نہ ہو اللہ کی طرف سے ہم مسلمانوں کی مہینہ بھر کی بے ریا عبادت کا انعام بھی تو ہے۔ عید کے تصور ہی سے دل میں خوشی کے دیپ جلنے لگتے ہیں اور اس کی روشنی سے ہر سمت چراغاں ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عید تو بچوں کی ہی ہوتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر عمر میں عید کی خوشیوں کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ ماضی کی عید قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔ صرف ان کی یاد رہ جاتی ہے۔ عید کا آغاز عید کا چاند دیکھ کر ہوتا ہے تو عید سے وابستہ یادیں بھی اسی وقت ذہن و دل کے افق پر جگمگانے لگتی ہیں اور اگر ان یادوں میں بھرپور خوشی کے رنگ ہوں تو جہاں ماضی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے وہاں ان لمحوں کی یادوں سے عجب قسم کی روحانی مسرت ملتی ہے۔ ان کا خیال بھی دل میں پھول کھلا دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ آج ہی کی بات ہو۔

عید پر ماضی کی خوشگوار یادوں کے حوالے سے ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور شریک خواتین سے معلوم کیا کہ آپ کی خوشیوں سے بھرپور یادگار عید کون سی تھی؟

## صفیہ خیری

## ٹی وی آرٹسٹ

آپ کو یہ جان کر شدید حیرت ہوگی کہ روایتی جوش و خروش سے عید کا اہتمام کرنے والی کی خوشیوں سے بھرپور یادگار عید وہ تھی جب عید کسی بھی اہتمام کے بغیر منائی گئی۔ ہمارے گھرانے میں عید کی تیاری روایتی جوش و خروش سے ہوتی اور ایسی عید منائی جاتی کہ سال بھر اس کا انتظار رہتا صرف ہمیں ہی نہیں ہمارے ملازمین کو بھی اور اس کی بڑی وجہ مساوات تھی جیسے ہمارے کپڑے بنتے ویسے ہی ملازمین کے بنتے۔ جس عید کے جوڑے کا ہم انتظار کرتے وہ کیا ہوتا؟ سفید لٹھے کی شلوار، رنگین قمیص، چنری کا دوپٹا اس پر جھوٹا گوٹا لگا ہوتا۔ منہارنیں چاند رات کو ڈیوڑھی پہ آ کر چوڑیاں پہنا جاتیں، مہندی پہلے ہی گھول کر رکھ دی جاتی، رات کو لگائی جاتی شب بھر لگی رہنے والی

صفیہ خیری

مہندی خوب رچتی۔ صبح ہتھیلیوں پر نظر پڑتی تو دل خوش ہو جاتا۔ گھر کے مرد نماز پڑھ کر آتے تو عیدی ملتی عید کے روایتی پکوان اور مہمانداری عید کی خوشیاں دوبالا کر دیتے۔ 27 رمضان کو پاکستان قائم ہوا اور ہم اس کے فوری بعد پاکستان آ گئے۔ جب ہم پاکستان آنے کے لیے گھر سے نکلے تو دو گاڑیوں میں بھر کر ائرپورٹ گئے تھے لیکن پاکستان پہنچے صرف تن کے کپڑوں میں کیونکہ مسلمانوں کا سامان لوٹا اور انہیں نقصان پہنچایا جا رہا تھا اس لیے جس مال گاڑی میں ہمارا سامان آ رہا تھا وہ سارا کا سارا جل گیا اس لیے اس عید پر ہمارا روایتی اہتمام نہ ہو سکا۔ نہ ہم نے عید پر نئے کپڑے پہنے، نہ چوڑیوں کی کھنک نہ حنا کی مہک اس کے باوجود آزاد وطن میں منائی جانے والی ہماری یہ عید خوشیوں سے بھرپور اور یادگار تھی کہ ہم نے آزادی کے احساس اور جذبے کے ساتھ عید منائی تھی۔

## جہاں آرا حئی

## ٹی وی آرٹسٹ

ہمیشہ عید کا اہتمام جوش و خروش سے کیا اس لیے ہر عید خوشیوں سے بھرپور اور یادگار رہی لیکن ایک عید ایسی بھی تھی جس نے خوشی کے رنگوں میں اور کئی خوشگوار رنگ بھر دیے تھے کہ اس عید کے فوری بعد ہماری شادی تھی۔ وہ میکے میں ہماری آخری عید تھی۔ میں مائیوں بیٹھی تھی۔ گھر والوں کی توجہ اور محبت میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ہماری حیثیت مہمان خصوصی کی تھی۔ ہم نے بھی خوب ناز نخرے اٹھوائے۔ چاند رات کو ہم نے فلک پر چاند دیکھا اور عید کے روز ہمارے گھر کے آنگن میں مستقبل قریب کے جیون ساتھی چاند بن کر نمودار ہوئے۔ جی ہاں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ جو ہماری عیدی لائے تھے خود بھی بنفس نفیس تشریف لائے۔ ہم ان کے سامنے نہیں آئے تھے۔ سسرال سے تو شاندار عیدی آئی ہی تھی وہ بھی ہمارے لیے خط، عید کارڈ اور پھولوں کی

جہاں آرا حئی

سوغات لائے تھے، جو ہماری بہن کے توسط سے ہم تک پہنچی اور ہماری عید کا لطف دوبالا کر گئی۔ ہم کیوں پیچھے رہتے جوابی کارروائی کے طور پر ہم نے بھی بہن کے ذریعے پھول بھجوا دیے۔ اس عید پر عجیب سے احساسات تھے اگر میکے کی آخری عید کا ملال تھا تو ایک نئی دنیا بسانے کے سپنے بھی آنکھوں میں بسے تھے ساتھ ہی نیا گھر بسانے کے لیے امی کی نصیحتیں اور ان پر عمل کی تاکید۔ ہم نے بھی سسرال جا کر ان پر خوب عمل کیا جس سے زندگی بہت شادمان گزری۔

## پروفیسر شیریں شہزاد

## نعت خواں، قاریہ، استاد

عید کی شاپنگ میں ہمیشہ بہت ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے۔ لیکن جب پہلی مرتبہ ماں بننے کے بعد عید آئی تو جوش و خروش کا عجب عالم تھا کہ میں نے اپنے سات آٹھ ماہ کے بیٹے کے لیے بھی شاپنگ کی تھی خوشی کی انتہا تھی کہ فرخ کو خوش ہو کر اس کی شاپنگ کی ایک ایک چیز دکھا رہی تھی جب وہ ہمکتا تو میری خوشی دیدنی تھی گویا فرخ میری ساری باتیں سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ

www.paksociety.com

پروفیسر شیریں شہزاد

یہ میری نادانی تھی لیکن ممتا کے جذبات بھی عجب ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ فرخ کے ددھیال اور ننھیال والوں نے بھی اس کی عید کے لیے بہت تیاریاں کی تھیں۔ جب میں نے فرخ کو عید کے کپڑے اور جوتے پہنائے تو وہ بہت پیارا لگ رہا تھا اور میری عید کی خوشیاں بھی دوبالا ہو رہی تھیں۔ میرے دوست احباب بھی میری خوشی میں شریک تھے۔ عید پر سب نے فرخ کو بہت اچھے اچھے تحائف دیے سب میرے ساتھ میرے بیٹے کی پہلی عید کی خوشی منا رہے تھے۔ اور میں بار بار اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ خوشی کی یہ انمول گھڑیاں اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے طفیل مجھے نصیب ہوئی تھیں۔

## ثوبیہ ندیم

## منیجر کارپوریٹ ریلیشنز

مجھے اپنے بچپن کی ایک عید یاد آگئی جب امی نے رمضان سے پہلے ہی ہماری عید کی شاپنگ کر لی لیکن مہندی اور چوڑیاں رہ گئی تھیں، اسکول میں سب بچے عید کی شاپنگ کی باتیں کرتے تو مجھے اور میری دونوں بڑی بہنوں کو بھی عید کی باقی شاپنگ کا خیال آجاتا۔ بھائی بہت چھوٹا تھا امی اس کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ گھر میں پینٹ ہو رہا تھا، ابی گھر اور دفتر دونوں جگہ مصروف تھے ہمارا فرمائشی پروگرام ہر روز نشر ہوتا، بالآخر عید سے دو دن پہلے ابی بڑا سا پیکٹ لیے گھر میں داخل ہوئے جسے دیکھ کر ہم بہنیں بہت خوش ہوئیں کہ ہماری چوڑیاں اور مہندی آگئی۔ لیکن جب ابی نے پیکٹ کھولا تو اس میں سے ڈھیر سارے وضع وضع کے رنگ برنگے خوشنما کلپ اور ہیر بینڈز دیکھ کر ہم تینوں دم بخود بیٹھی رہ گئیں کہ اس میں چوڑیاں اور مہندی تو تھیں ہی نہیں۔ جب ہم نے ابی سے پوچھا کہ ہماری چوڑیاں اور مہندی کیوں نہیں

ثوبیہ ندیم

لائے تو ابی نے کہا چوڑیوں اور مہندی کا کیا کرنا ہے؟ ابی کی بات سن کر ہم حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ چونکہ ان دنوں ہم لاہور میں تھے اور سارا خاندان کراچی میں اس لیے عید پر رشتے دار تو آجا نہیں سکتے تھے لیکن امی اور ابی کے دوست احباب



نے ہمیں خوب عیدیاں دیں اور ابی نے اتنی تفریح کروائی کہ عید پر مہندی نہ لگوانے اور چوڑیاں نہ پہننے کا غم بھلا دیا۔

## غزالہ جاوید

## آرٹسٹ

آج سے دس سال پہلے میں نے اپنے پیرنٹس کے ساتھ لندن میں عید منائی۔ اچانک عید سے دو تین

غزالہ جاوید

روز پہلے پہنچ کر انہیں انتیس کے چاند کی سی مسرت دی تھی۔ ان کی خوشی قابل دید تھی۔ کافی عرصے کے بعد تمام گھر والے عید پر یکجا ہوئے تھے۔ حالانکہ عید کی شاپنگ میں نے یہاں سے کر لی تھی لیکن امی نے میری، میرے میاں اور بچوں کی بھرپور شاپنگ کروائی۔ اکلوتی بیٹی اور بہن ہونے کا بھی میں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ امی ابو اور دونوں بھائیوں کے ساتھ ابو کے دوستوں نے بھی تحائف دیے جو زیادہ تر گولڈ کی شکل میں تھے اور ان سب سے بڑھ کر قیمتی ان کی محبت اور اخلاص بھرے رویوں نے اس عید کو میرے لیے بہت یادگار بنا دیا۔ ان لمحوں کی سنہری یادیں آج بھی میرے اندر اجالے بکھیر دیتی ہیں۔ وہ واقعی خوشیوں سے بھرپور یادگار عید تھی۔

## مشی خان

## ٹی وی آرٹسٹ

عید تو ساری ہی خوشیوں بھری گزری ہیں۔ ہاں 2005ء میں جب میں عید کے موقع پر دبئی میں تھی وہ عید اس لیے بھی خوشیوں سے بھرپور تھی کہ کسی بھی قسم کے فسادات کے خوف اور غم کے بغیر نہایت پرامن اور خوشگوار ماحول میں گزری تھی۔ چاند رات کو میں نے سپر مارکیٹ سے شاپنگ کی تھی، چوڑیاں پہنیں، مہندی لگوائی اور اگلے دن عید پر

مشی خان

دوستوں کے ساتھ ڈنر پر گئی، وہاں پر لیڈیز کے بہت اچھے ڈسکوز ہیں صاف ستھرا ماحول ہے، میں دوستوں کے ساتھ ڈسکو گئی اور جی بھر کر انجوائے کیا۔ بہت ہی بے فکر اور خوشیوں سے بھرپور عید تھی جو بھلائے نہیں بھولتی۔



www.paksociety.com

## شگفتہ یاسمین

### ہوسٹ

گزشتہ برس کی عید اس لحاظ سے خوشیوں سے بھرپور تھی کہ رمضان سے دو دن قبل میری منگنی ہوئی تھی اور عید کے فوراً بعد نکاح۔ میں نے اپنے منگیتر ڈاکٹر شاہد کے ساتھ چاند دیکھا اس کے بعد عید اور

شگفتہ یاسمین

نکاح کی شاپنگ بھی ہم نے اکٹھے ہی کی اور جی بھر کر انجوائے کیا۔ شاہد نے عیدی چاندرات ہی کو دے دی تھی۔ ایک بہت ہی پیارا سا سوٹ اس کی میچنگ کی جیولری، چوڑیاں، شوز، پرس وغیرہ دیے ان میں سب سے منفرد اور اچھا تحفہ اصلی پھولوں کی انگوٹھی تھی جس کی خوشبو سے میں آج بھی مہک رہی ہوں۔ عید والے دن شاہد نے ایک اور منفرد تحفہ مجھے دیا یعنی بہت سی چڑیوں کو میرے ہاتھ سے آزاد کرایا، ہم نے ڈنر بھی ساتھ کیا۔ نکاح کے دوسرے دن ٹرانسمیشن کے لیے گئی تو میرے ہاتھوں میں مہندی لگی دیکھ کر (بلیک، گرین اور ریڈ جیل) ایک کالر نے سوال کیا کہ کیا آپ کی منگنی ہوئی ہے تب میں نے انکشاف کیا کہ منگنی نہیں نکاح ہوا ہے۔ اس کے بعد تو کالرز کی دعاؤں کی بھرمار ہو گئی عید کا ہفتہ چل رہا تھا اور میں عید اور نکاح کی مبارکباد ساتھ ساتھ وصول کر رہی تھی۔ بلا شبہ یہ عید میرے لیے خوشیوں سے بھرپور تھی۔

## عنبر ارشد

### ٹی وی آرٹسٹ

اللہ کا شکر ہے کہ میری ہر عید بہت اچھی گزری ہے لیکن بچپن کی عیدیں بہت یاد آتی ہیں۔ بے فکری کے دن کوئی ذمے داری نہیں ہر عید اتنی بھرپور تھی کہ کسی ایک کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ بچپن کی وہ عیدیں جب میرے والد حیات تھے ہم بڑی شدت سے انتظار کرتے کہ نماز کے بعد وہ ہمارے لیے بہت

عنبر ارشد

سارے رنگ برنگے غبارے لائیں گے اس کے بعد عیدی کا مرحلہ آتا جو اس وقت ہمیں صرف دو روپے ملتی تھی اور وہ دو روپے ہمارے لیے بہت اہم تھے جو ہماری عید کا لطف دوبالا کر دیتے تھے اور پھر ہماری

www.paksociety.com





ترقی ہو گئی جی ہاں اب ہمیں پانچ کا نوٹ عیدی میں ملنے لگا ہاہا...... جو ہمارے لیے بہت بڑا نوٹ ہوتا تھا عیدی کی وصولیابی کے بعد اس کو کیسے خرچ کیا جائے اور کہاں؟ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہوتا۔ ہم بڑی فکرمندی سے سوچتے اور بے فکری سے خرچ کر ڈالتے۔ سب دوستوں کے ساتھ مل کر باہر لنچ کھانے جاتے اور جب ساری عیدی ختم ہو جاتی تو ہم دوسرے بچوں کو بیوقوف بنا کر ان کے پیسے لوٹتے تھے ہا ہا...... یار بچپن کے دن بہت حسین تھے کاش وہ دن لوٹ آئیں اور بچپن کی خوشیوں سے بھرپور عیدیں بھی جو اب یادگار بن گئی ہیں۔

## کرن خان

### ہوسٹ

میری تمام عیدیں بہت پُرمسرت گزریں لیکن اپنے بچپن کی ایک عید میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ایسی یادگار

کرن خان

خوشیوں سے بھرپور عید جس کا خیال بھی میرے اندر خوشیوں کے بے شمار رنگ بھر دیتا ہے۔ میرا بچپن دبئی میں گزرا اس لیے کئی عیدیں ہم نے دبئی ہی میں منائیں۔ ایک مرتبہ میری نانی نے دبئی میں عید ہمارے ساتھ منائی۔ امی ابو نے تو ہماری عید کی تیاری کی ہی تھی لیکن نانی کے خاص الخاص اہتمام نے عید کی خوشیوں میں اضافہ کر دیا۔ نانی میرے لیے پاکستان سے خاص طور پر چٹاپٹی کا غرارہ اس کے ساتھ میچنگ کی چوڑیاں، ہار وغیرہ بھی لائی تھیں جب میری عمر محض چھ برس تھی۔ چاندرات کو نانی نے میرے ہاتھوں میں مچھلی والی مہندی لگائی تھی جو ساری رات لگی رہی صبح جب ہتھیلیوں پر نظر پڑی تو اتنا پیارا رنگ چڑھا تھا کہ میں حیرت اور مسرت سے دیکھتی رہ گئی۔ پھر میں نے نہ صرف گھر والوں بلکہ آنے والے مہمانوں کو بھی اپنی مہندی دکھائی۔ نانی کے ساتھ عید کا سارا دن ہم نے خوب انجوائے کیا۔

قارئین:: عیدالفطر عطائے ربی ہے اور عید سے وابستہ یادیں ہمارا قیمتی اثاثہ۔ بلاشبہ بچپن کی عیدیں واقعی یادگار ہوا کرتی ہیں۔ عید سے وابستہ معصومانہ آرزوئیں، شرارتیں، بے فکری، ہلا گلا، کھلونوں اور تفریح کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ عید کی خریداری اور ان اشیا کو برتنے کے لیے عید کی صبح کا انتظار عید کی خوشیوں میں عجب رنگ بھر دیتا ہے۔ زمانے نے کئی رنگ بدلے اگر نہ بدلے تو عید کے حوالے سے بچوں کی خواہشات اور ارمانوں کے رنگ اور بچپن ہی پر کیا موقوف ہے عید تو اپنے بچوں کے ساتھ منائی جانے والی بالخصوص ان کی پہلی عید بہت یادگار ہوتی ہے، زمانۂ طالبعلمی کی عید کی کیا بات ہے اس کے علاوہ بھی بعض عیدیں ایسے یادگار لمحات سے وابستہ ہوتی ہیں کہ ہر نئی آنے والی عید ان عیدوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ سروے رپورٹ پڑھ کر پاکیزہ کے قارئین کو بھی ایسی کئی عیدیں یاد آ گئی ہوں گی۔ میری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے دلی عید مبارک

ہنسی خوشی تیرے جیون کا ہر سفر گزرے
میری دعا ہے تیری عید خوب تر گزرے
(آمین)

# آہ......... لبنیٰ عروج

انجم انصار

ہماری پیاری مصنفہ لبنیٰ عروج چل بسیں۔ لبنیٰ عروج پاکیزہ کی سینئر رائٹر تھیں۔ ان کے لکھنے میں کبھی وقفہ بھی آجاتا تھا مگر پھر سے وہ لکھنا شروع کردیتی تھیں۔ معاشرتی موضوعات پر لکھنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ عموماً سچی کہانیوں پر قلم اٹھایا کرتی تھیں۔ ہنستی مسکراتی بات بات پر قہقہے لگانے والی لبنیٰ کو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی دنیا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

گزشتہ ماہ مجھے مصنفہ صبیحہ شاہ نے لبنیٰ عروج کی بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے لاتعداد فون لبنیٰ کو کیے مگر اس کا موبائل بند ہی رہا اور آج مجھے لبنیٰ کی پڑوسن عاشی محسن نے گلوگیر لہجے میں لبنیٰ کی موت کی اطلاع دی تو میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ عائشہ سے بات کروں تو کیا کروں۔ خود عاشی کی حالت بھی خاصی غمزدہ سی تھی۔ میں نے فون سن کر کہا پلیز آپ مجھے کل فون کر کے مزید تفصیلات بتائیں۔ اُس وقت میں کہاں جارہی تھی اور کیوں جارہی تھی یہ سب باتیں میرے ذہن سے نکل چکی تھیں اور یاد تھا تو صرف یہ کہ جب لبنیٰ عروج کراچی میں ہوتی تھیں تو باہم ملنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیا کرتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ بحریہ کی بس میرے گھر آجاتی تھی اور میرے گھر پر صبیحہ شاہ، افسر سلطانہ، تسنیم اسلم اور دیگر رائٹرز جمع ہوجاتی تھیں۔ کسی کو راستے سے پک کرتے ہوئے ہم بحریہ ٹاؤن پہنچ جاتے تھے۔ اور وہاں کے ہال میں ایک ادبی تقریب ہوتی تھی۔ بحریہ کا ہال وہاں رہائش پذیر خواتین سے بھرا ہوتا تھا۔ اس وقت کی بحریہ کے سب سے بڑے افسر کی بیگم مسز سعید مہمان خصوصی تو ضرور ہوتی تھیں مگر ایک، ایک رائٹر کا اتنا خیال رکھا کرتیں کہ وہ لمحات آج بھی یاد آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایسی ہی ایک تقریب میں ایک مرتبہ عنیزہ سید بھی شامل تھیں۔ اس وقت عنیزہ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماموں کے گھر کراچی آئی ہوئی تھیں۔ اس دور میں ملنا ملانا بھی کچھ زیادہ ہوتا تھا مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لبنیٰ عروج خود بہت اچھی میزبان تھیں۔ تمام رائٹرز کے ساتھ ان کے بڑے محبت بھرے تعلقات تھے۔ پاکیزہ ان کا پسندیدہ ماہنامہ تھا اور مجھ سے انہیں خصوصی انسیت تھی مگر اس کے باوجود بھی تم نے مجھے اپنی بیماری کے بارے میں نہیں بتایا۔ ابھی تو اگست کا پرچا میری بہنوں کے ہاتھوں میں بھی نہیں پہنچا ہوگا کہ تمہارے

آج سے اٹھارہ سال پہلے کی تصویر۔ دائیں سے لبنیٰ عروج، عنیزہ سید، عظمیٰ، صبیحہ شاہ، انجم انصار، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور بحریہ کے اعلیٰ افسران کی بیگمات

جانے کی اطلاع آگئی۔ میں لبنیٰ عروج کے بارے میں اپنے قارئین کو بتانا چاہوں گی کہ ان کا میکا اور سسرال سرگودھا میں ہے اسی لیے ان کی تدفین بھی سرگودھا میں ہوئی۔ لبنیٰ کے شوہر جناب ظفر ملک لیفٹیننٹ کمانڈر ہیں اور لبنیٰ کا بے حد خیال رکھنے والے۔ اس کا ہر افسانہ پوسٹ کروانے کی ذمّے داری ان ہی کی رہی۔ ایک مرتبہ میرا غلط ایڈریس لکھ دینے کی وجہ سے لبنیٰ کا افسانہ ان کے گھر واپس چلا گیا تھا اور ظفر بھائی لبنیٰ سے کہیں زیادہ پریشان ہوگئے تھے۔ لبنیٰ عروج کے ماشاءاللہ تین بچے ہیں دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا اطیب چھبیس سال کا ہے، فلائٹ لیفٹیننٹ ہے اور آج کل اس کی شورکوٹ میں پوسٹنگ ہے۔ بیٹی بائیس سال کی ہے جو ہولی فیملی اسپتال میں ہاؤس جاب کررہی ہے۔ بیٹی کا رشتہ طے کردیا تھا مگر بیٹی سے بے حد محبت کرنے والی ماں اس کی شادی دیکھنے سے محروم ہی رہی۔ سب سے چھوٹا بیٹا اسامہ انجینئرنگ کے فائنل ائیر میں ہے۔ لبنیٰ کے تینوں بچے پڑھائی میں ٹاپ پر رہے اور وہ ان سب کا ذکر بڑی چاہت اور فخر کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ ایک ایسی دوست جو بارہ تیرہ سال قبل کراچی سے اسلام آباد جا بسی تھی مگر کبھی دل سے دور نہیں رہی۔ مہینے میں کم از کم دو بار تو ضرور اس سے بات ہوتی تھی۔ اس کی عادت تھی افسانہ لکھنے سے پہلے ڈسکشن کیا جائے اور کبھی اگر میں نے اس کے افسانے کا اختتام تبدیل کردیا ہو تو وہ برا نہیں مانتی تھی اور یہ ایک بڑے رائٹر کی خوبی ہوتی ہے جو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور ایسے لوگ بہت آگے بڑھتے ہیں اور وہ اسی لیے شاید بہت بہت آگے بڑھ گئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف فرمائے، اس کی مغفرت فرمائے اور اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین ثم آمین۔ میں اور میرا ادارہ لبنیٰ عروج کی فیملی اس کے عزیز و اقارب اور اس کے تمام چاہنے والوں سے دلی تعزیت کرتے ہیں۔



www.paksociety.com

# بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

☆حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد ﷺ پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆پیاری بہنو! آپ سب کو دلی عید مبارک۔ مسلمانوں کے لیے عید ایک تہوار ہی نہیں بلکہ ایک عبادت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نمازِ عید ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لا رہے تھے کہ راہ میں آپ نے ایک بچے کو غمگین پایا۔ آپ نے اس سے غم کی وجہ دریافت کی تو بچے نے کہا، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ نے بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور اپنے گھر لے آئے اور اس اہم دن کی مسرت وخوشی میں اس کو شامل فرمایا۔ یہ واقعہ ہمیں عید کی خوشیوں میں ایثار اور اجتماعی اظہارِ مسرت کی دعوت دیتا ہے نیز یہ بھی کہ عید کی حقیقی مسرت تب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ ہم معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال طبقے کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کریں۔

صاحبِ استطاعت بہنوں نے یقیناً...... اپنے آس پاس ضرورت مندوں کا ضرور خیال رکھا ہوگا اور رکھ رہی ہوں گی، ہے ناں!

* * *

☆لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر نے دل ودماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور میں ان دنوں ایسی کیفیت میں ہوں کہ مجھے ہمہ وقت لبنیٰ کا خیال آرہا ہے۔ برسوں کے تعلقات ایک فلم بن کر میری نظروں میں گھوم رہے ہیں۔ اس کی زندگی سے بھرپور ہنسی، اس کی شخصیت کا بڑا حصہ تھی۔ وہ بات چیت میں بے حد بھولی بھالی سی عورت تھی جو لوگوں کی تکلیف دہ باتیں سن کر بھی ان کو پی لیا کرتی تھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اسے کبھی غصہ آتا ہو یا وہ کسی سے لڑ سکتی ہو۔ ایسی پیاری سی رائٹر جس سے جب میں باتیں کرتی تھی تو کبھی وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ ہم سے بہت دور جاچکی ہے، کبھی نہ آنے کے لیے...... اپنی مایہ ناز مصنفہ لبنیٰ عروج کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکتوبر کا پاکیزہ جو دلہن نمبر ہوگا...... وہ ہمارے افسانوں کی دلہن لبنیٰ عروج کے نام ہوگا اس خصوصی شمارے کے ایک گوشے میں لبنیٰ عروج کے عزیز واقارب، مصنفات، شاعرات کی تحریریں شامل ہوں گی اگر آپ بھی لبنیٰ عروج کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں مگر مختصر تاکہ زیادہ سے زیادہ بہنوں کے تاثرات شامل ہوسکیں۔

آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ (ابھی پڑھ لیں)

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔

* * *

## مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆شاعرہ اور محترمہ عذرا رسول کی چھوٹی بہن سیدہ آصف نقوی کے ہاں پیارا سا بیٹا ہوا ہے۔ جس کا نام احسن





نقوی رکھا گیا ہے۔ (دلی مبارک باد)

☆میری پیاری بھتیجی صفیہ سہیل نے اپنے اسلام آباد ماڈل کالج جی۔ تین۔ ٹو میں ایف ایس سی پری انجینئرنگ گروپ میں ٹاپ کیا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆شاعرہ زیب النساء زیبی، سندھ کا پہلا مجموعۂ کلام پیار میں، بہت جلد کتابی شکل میں آرہا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆معروف مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کا ناول کتابی شکل میں آنے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار شائلہ سہیل کے بیٹے سعد سہیل نے میٹرک کے امتحان میں اے ون گریڈ حاصل کیا۔ (ماشاء اللہ)

☆باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے مصنفہ غزالہ نگار اورکزئی ان دنوں امریکا سے پشاور آئی ہوئی ہیں، حیرت ہے کہ رابطہ نہیں کیا۔

☆گزشتہ دنوں پنجاب سے ثمرہ بخاری کراچی آئی ہوئی تھیں...... اپنے ٹی وی سیریل کے سلسلے میں۔

☆پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ، عائشہ خالد، میرپور خاص کی عید کے بعد رخصتی ہورہی ہے۔ (بہت سی دعائیں اور مبارک باد)

☆پاکیزہ میں دھوم مچا دینے والا سیما مناف کا ناولٹ یقین اب سیریل کی صورت میں ایک نجی ٹی وی چینل پر دکھایا جارہا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ رُخ چوہدری کا ڈراما سرتاج ایک نجی چینل پر دکھایا جارہا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ عنیزہ سید کا سیریل ایک نجی ٹی وی چینل پر جلد آنے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ رفاقت جاوید کا ٹی وی سیریل بہت جلد ایک نجی ٹی وی چینل پر آنے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ اقبال بانو کا ٹی وی سوپ بہت جلد ایک نجی چینل پر آنے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ نگہت عبداللہ کا ٹی وی سوپ بہت جلد ایک نجی ٹی وی چینل پر آنے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆ہماری مصنفہ عمیرہ احمد کا سیریل شہرِ ذات ایک نجی ٹی وی چینل پر دکھایا جارہا ہے اور پسندیدگی کی سند حاصل کرچکا ہے۔

☆آپ کی باجی انجم انصار کے دو ٹی وی سوپ اٹکھیلیاں اور چاندنی دو مختلف نجی ٹی وی چینلز پر روزانہ دکھائے جارہے ہیں اور بفضلِ خدا پسند بھی کیے جارہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆تبصرہ نگار اور افسانہ نگار گیتی آرا کراچی کے شوہر ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆شاعرہ اور تبصرہ نگار فرحت احمد کراچی آئی۔ آر میں ماسٹر کررہی ہیں۔ (مبارک باد)

☆افسانہ نگار، ٹی وی رائٹر سیما مناف بہت جلد اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہونے والی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ مسز شمع حسین کی آنکھ کا آپریشن کامیابی سے ہوگیا ہے اور اب وہ بفضلِ خدا ٹھیک ہیں۔

☆مصنفہ اختر شجاعت کی کتاب ذکرِ صالحین بہت جلد آنے والی ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆آپ کی باجی انجم انصار کی طنز ومزاح کی نئی کتاب کھری کھری شائع ہوگئی ہے۔ یہ بے حد ضخیم کتاب ہے اور اس میں ہنستی کھلکھلاتی تحریریں آپ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر سکتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف پانچ سو روپے ہے اور کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ مقبول اکیڈمی 199 سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر۔ 042.37324164 اور 0333/323.4393422



www.paksociety.com

☆ مصنفہ رفاقت جاوید کا ناول سفرِ جاوداں کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ ناول نئی نسل کے لیے ایک تحفہ ہے۔ جسے اپنے ملک کی آزادی کا احساس ہو اور وہ مضامین کی طویل آزمائشوں سے بھی روشناس ہو۔ اس کے صفحات 224 ہیں اور قیمت صرف 200 ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور، فون نمبر۔ 042.37668958

☆ ہماری کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے اور علاج شائع ہوگئی ہے۔ قیمت صرف دو سو روپے، صفحات 208 ۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور۔ فون نمبر۔ 042.37668958۔

☆ میرے پیارے بھائی کرنل کلیم اختر اور بھابی نسرین کی پیاری سی بیٹی حرا کی منگنی اپنے کزن سعد کے ساتھ پچھلے دنوں راول پنڈی میں ہوئی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی لاہور میں ناول نگار محمد حسیب کے ناول کی تقریبِ رونمائی میں شاعرہ فریدہ خانم کو بطورِ مہمانِ خصوصی بلایا گیا۔ لاہور کے اسپیشل اسکول میں چین فاؤنڈیشن لاہور نے شاعری کا ایک مقابلہ منعقد کیا۔ جہاں فریدہ خانم نے بطور جج شرکت کی۔ (ماشاء اللہ)

☆ اس ماہ شاعرہ اور تبصرہ نگار فائزہ شہزاد، پشاور کی ان کے بیٹے کی' ان کی بھانجی سعدیہ انجم، کوئٹہ کی اور بھانجے علی طاہر، لاہور کی سالگرہ ہے۔ آپ سب کو بہت مبارک باد۔

☆ ویمن رائٹرز فورم خیبر، پختونخواہ کی صدر اور نامور شاعرہ اور ادیبہ بشریٰ فرخ خواتین کی عالمی کانفرنس ایران میں شرکت کرنے کے لیے گئی تھیں۔ جہاں انہوں نے اپنا مقالہ پڑھا۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی قاری بہن ثریا وحید، لاہور کا گزشتہ دنوں نکاح ہوا۔ (مبارک باد)

## انتقالِ پُرملال

☆ ہماری پیاری مصنفہ لبنیٰ عروج اپنے دائمی سفر پر روانہ ہوگئیں۔

☆ انچولی سوسائٹی کی ہردلعزیز شخصیت پروفیسر رؤف الحسن چل بسے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری روبینہ اسلم، لیاری، کراچی کی والدہ حلیمہ بیگم کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ معروف صحافی اور شاعرہ شائستہ زریں کے والد عبدالستار مظہری طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆ ☆ ☆

✍ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے تو عذرا تمہیں اور تمہاری فیملی کو رمضان اور عید کی ڈھیروں مبارک باد اس کے بعد پاکیزہ کے پورے خاندان کے لیے میری دلی دعائیں اور مبارک باد، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مبارک مہینوں کو ہم سب کے لیے اور پاکستان کے لیے بابرکت بنائے، آمین۔ جولائی کا شمارہ بھی مجموعی طور پر بہت اچھا تھا کچھ تحریریں بہت خوب تھیں مگر یار ان سب پر بازی تمہاری آئٹم گرل اور آئٹم سونگ کی تشریح لے گئی بے اختیار واہ، واہ منہ سے نکل گیا۔ اس سے بہتر اس کی تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ بہن نسرین تابندہ کا دل بھی خوش ہوگیا ہوگا۔ اگست کے شمارے میں تمہارا کچھ کہنا ہے حسبِ معمول ٹھک سے دل میں اتر گیا۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں غیر مسلموں کی آر انفخر کا موجب ہیں' کاش مسلمانوں کو بھی اپنی اور اپنے دین کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور انہیں ہدایت ہو، آمین۔ عکس کی یہ قسط بہت زبردست تھی کب شروع ہوئی اور کب ختم پتا ہی نہیں چلا...... عقیلہ حق نے بھی اچھا لکھا۔ نگہت سیما کی یہ قسط کہانی کے نقش و نگار واضح کر رہی ہے اور بہنوں کے لیے ایک پیغام بھی ہے کہ اگر گھر میں جوان ملازمہ ہو





تو حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھیں۔ ''صلہ'' اچھی تحریر ہے۔ زندگی بہت دلچسپ ہوتا جا رہا ہے مسائلِ زندگی پر اچھی تحریر ہے۔ عنیزہ سید نے متاثر کیا ہے بابر کمال نے انجانے میں بے چاری صبیحہ کے ساتھ جو کیا تو اس کی تلافی بھی کر دی۔ ہم الزام ان کو دیتے تھے وہی پرانی فرشتے کی کہانی اب اگر مصنفات اس موضوع کو نظر انداز کر دیں تو شاید زیادہ بہتر ہے۔ دھوپ چھاؤں اور لاپتا اچھا موضوع ہونے کے باوجود متاثر نہ کر سکیں تہی دست اچھے موضوع پر اچھی تحریر ہے۔ بیٹیاں پھول ہیں اچھی اور بامقصد تحریر ہے۔ نگہت عظمیٰ کی کتاب آبگینے کی کوریج اچھی ہے۔ تمہارے بارے میں رجا کا کمنٹ بالکل صحیح ہے تمہیں سننا اور پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ اب باری ہماری محفل کی...... معاف کرنے اور درگزر کا سبق بہت اچھے انداز میں تم نے دیا ہے۔ ایک لمحے کو ہر شخص سوچنے اور عمل کرنے پر راغب ہوتا ہے خدا تعالیٰ توفیق عطا کرے، آمین۔ اپنی مصنفات کو ٹی وی کے مختلف چینلز پر دیکھنا اچھا لگ رہا ہے۔ شہر ذات اور اٹکھیلیاں خصوصی طور پر...... نزہت اصغر تر ساتر سا کر آتی ہیں مگر شان سے آتی ہیں۔ نزہت کئی دفعہ فون پر بات کرنا چاہی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بہن زبیدہ حبیب اور ڈاکٹر کول میرا دکھ محسوس کرنے اور بانٹنے کا بے حد شکریہ ایسے حساس دلوں کی وجہ سے ہی سکون ملتا ہے۔ عظمیٰ پاکیزہ ڈائری اچھی سجاتی ہو مگر اب کچھ لکھو نا...... اس دفعہ جلترنگ بہت ہی دلچسپ ہے بات کا بتنگڑ کا تو جواب ہی نہیں۔ میرا انتخاب کا انتخاب اور دیگر سلسلے بھی ٹھیک ہیں۔ انجم اب تم کب لکھ رہی ہو، انتظار ہے۔'' (پیاری بہن ضیا، سب سے پہلے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ اتنی مصروفیت کے باوجود تم پاکیزہ کے لیے تبصرہ ارسال کرتی ہو۔ طویل تبصرے کے لیے شکریہ میں انشاء اللہ جلد ہی کسی اچھی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی)

✍ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''اگست کا شمارہ محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہانیوں میں یوم آزادی کے حوالے سے کوئی تحریر نہیں ہے۔ شائستہ زریں نے روزے داروں کے لیے مفید سروے کر کے رمضان کا حق ادا کر دیا ہے۔ روحانی مشوروں میں تم نے چند عظیم تحفے بہت اچھے بتائے ہیں؛ جزاک اللہ۔ ٹاپ آف لسٹ عکس رہا۔ شہباز کے کردار کو واضح کیا۔ عمیرہ پتا نہیں کتنے پرت اور کھولیں گی۔ نبیلہ ابر راجا کی کہانی اچھی تھی۔ نگہت سیما کا ناولٹ اچھا لگا مگر اسے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے۔ شبانہ شوکت کی تحریر بھی اچھی لگی۔ صائمہ حیدر کی تحریر دھوپ چھاؤں نے رلا دیا۔ رفاقت جاوید نے بہت مشکل اردو لکھی ہے۔ ان سے کہیں کہ آسان اردو لکھا کریں۔ زندگی میں کہانی نے کروٹ لی ہے۔ تسنیم کو اپنی غلطی کی سزا ملی ہے۔ سلمیٰ غزل نے جو لکھا ہے، اس موضوع پر پہلے بھی بار بار لکھا جا چکا ہے۔ عنیزہ سید کے افسانے کا نام بھی اچھا اور کہانی بھی اچھی تھی۔ نمرہ احمد کی لاپتا تجسس سے بھرپور تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ نمرہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کا ہنر جانتی ہیں۔ جلترنگ میں لوڈشیڈنگ پڑھ کر ہنسی آئی جبکہ لوڈشیڈنگ کے وقت غصہ آتا ہے۔ کارنر میں جبین ہاشمی اور عروج ذکی کی باتیں اچھی لگیں۔ نو دسمبر کو میرے شوہر کی پہلی برسی ہے ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔'' (جی ضرور)

✍ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''کافی دن کے بعد خط لکھ رہی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا ٹیلیفون پر رابطہ رہتا ہے...... بے حد خوب صورت افسانوں سے مزین پاکیزہ ماشاء اللہ آپ کی زیرِ نگرانی ترقی کے مدارج دن رات طے کر رہا ہے۔ آج کل ہمارا انتہائی پسندیدہ ترین حصہ عکس اور جلترنگ ہیں۔ ویسے تو آپ پاکیزہ میں تمام ہی افسانے چن چن کے بہترین لگاتی ہیں۔ میری طرف سے آپ اور آپ کے تمام اہلِ خانہ کو رمضان اور پھر عید کی دلی مبارک باد۔ ہماری عید مبارک عذرا رسول صاحبہ تک بھی پہنچا دیجیے گا۔'' (عذرا رسول بھی عید مبارک کہہ رہی ہیں)

✍ نجمہ جبین علیزئی، ڈی آئی خان سے۔ ''کیسی ہیں آپ، مدتوں بعد پاکیزہ کے در پر دستک دے رہی ہوں۔ یقیناً آپ میرے نام اور تحریر سے آشنا ہوں گی..... نو دس سال بعد پاکیزہ کی محفل میں شرکت کرنا بے حد اچھا لگ رہا ہے۔ یہ نو دس سال بھی زندگی کی بھول بھلیوں میں گزر گئے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پھر ان کی شادیاں اور اب ان کے پیارے سے بچے جن کے بغیر ان کی نانو بالکل ادھوری ہے۔ ربیلی انجم یہ رشتے اتنے خوب صورت اتنے رگِ جاں کے قریب ہوتے ہیں کہ انسان ان سے تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ میں بھی ان رشتوں میں ڈوب کر قلم سے



www.paksociety.com

ناتا توڑ گئی۔ جانے کیوں ابوذر، عبداللہ، آیان، امامہ (نواسوں نواسی) کو سامنے پا کر سب کچھ دل سے اُتر جاتا ہے بس فرصت کی چند گنی چنی ساعتوں میں مطالعے کا شوق پورا کر لیتی ہوں کہ چھٹتی نہیں مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ خاصی تحریریں ادھوری پڑی ہیں جنہیں اب دھیرے دھیرے مکمل کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔ خیر چھوڑیں، زندگی کے یہی روپ ہی تو دلکش اور خوب صورت ہیں۔ آپ سنائیں ماشاء اللہ پاکیزہ کی جگمگاہٹ پوری آب و تاب کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تازہ شمارہ صرف تین دن میں ختم کرلیا۔ تحریروں کے معاملے میں کیا اعلیٰ پائے کا معیار برقرار ہے۔ اتنے سارے میرے فیورٹ رائٹرز جن کی تحریروں میں کھو کر بندہ خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی زندگی کا ہر روپ انوکھا ہے۔ میرے لیے وہ اور پاکیزہ لازم وملزوم ہیں اور مائی ہارٹ فیورٹ عمیرہ احمد، جنہوں نے پیرِ کامل جیسی تخلیق ہمیں دے کر احسانِ عظیم ہم پر کیا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی بچیوں اور بہنوں وغیرہ سے کہتی ہوں ہر گھر میں ایک پیرِ کامل ہونا چاہیے اور تقریباً ہر گھر میں ...... آپ کی اچھوتی اور انمٹ تحریر پیرِ کامل موجود ہے۔ نگہت جی کو بہت دنوں بعد پڑھا اور ہر لفظ نے جیسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اسی طرح یاسمین نشاط، صائمہ اکرم، نوشین ناز، نجمہ عروج، سکینہ فرخ ریکی انجم یوں لگتا ہے جیسے سب کو آپ نے اپنی پُرخلوص محبتوں کے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ جبھی میرے سمیت سب دوڑے چلے آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر خوشی کی بات کہ میری مخلص دوست اقبال بانو نے بھی قلم کا رشتہ پاکیزہ سے جوڑ رکھا ہے۔ ورنہ تو بانو آپ آج کل خال خال کیا دوسرے جرائد میں نظر ہی نہیں آتیں۔ یقیناً یہ انجم باجی کی محبتوں کا اعجاز ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ان تمام لکھاری بہنوں کی سحر انگیز تحریروں سے پاکیزہ کی جگمگاہٹ اور خوب صورتی کو قائم ودائم رکھے۔ (آمین) آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے تو ہم سب کے دل کی آواز ہے۔ اس کا ایک، ایک لفظ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین) باقی تمام سلسلے بھی خوب تھے۔ انشاء اللہ ہر ماہ باقاعدگی سے حاضری دینے کی پوری کوشش کروں گی۔ ایک مکمل ناول دو اقساط میں لکھ رہی ہوں جلد ہی ارسال کروں گی۔" (پیاری نجمہ خوش آمدید، جم جم آؤ، یہ تمہارا اپنا پرچا ہے۔ مجھے تمہاری تحریروں کا انتظار رہے گا)

ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "سب سے پہلے محبتوں، چاہتوں اور جذبوں بھرا اسلام، آپ سے آج تقریباً سولہ سال بعد قلم کے ذریعے مخاطب ہوں لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں پاکیزہ سے غافل رہی ہوں۔ جیسے انسان ہوا، پانی اور خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اسی طرح میں پاکیزہ کے بغیر...... پاکیزہ نے مجھے میرے ہونے کا مان دیا ہے، بہنوں کی محفل میں، میں نے 1995ء کا ایوارڈ بھی لیا تھا اور پاکیزہ کا ایک سلسلہ تھا، قارئین بہنوں سے ملاقات اس میں سب سے پہلے میرا انٹرویو چھپا تھا۔ اس سولہ سال کے عرصے میں پاکیزہ نے نہ صرف اپنا معیار برقرار رکھا ہے بلکہ اسے ادب کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ میرے چار بچے ہیں میری بیٹیوں کو بھی پتا ہے کہ ماما کا موڈ خراب ہو، تو فوراً پاپا کو فون کر دیتی ہیں کہ آتے ہوئے پاکیزہ لے کر آئیے گا۔ اب بچے قدرے بڑے ہو گئے ہیں تو میں نے اب دوبارہ قلم اٹھایا ہے۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے اے ون جا رہے ہیں افسانے اور ناول بھی۔ میرے اس خط کو ضرور شائع کیجیے گا۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آئندہ ہر ماہ آپ سے قلمی تعاون رکھوں اچھا اب اجازت دیجیے۔ میں پہلے آپ کو ارم ناہید کراچی کے نام سے خط لکھتی تھی اور اب شادی کے بعد سولہ سال کے بعد دوبارہ قلم اٹھا رہی ہوں۔ آخر میں میری طرف سے خصوصاً انجم باجی اور پاکیزہ کے تمام اسٹاف کو سلام۔" (پیاری ارم، اس محفل میں دوبارہ خوش آمدید، تم ہر ماہ اپنے تبصروں سے دھوم مچا دو۔ مجھے تمہاری تحریریں ہر ماہ چاہئیں)

کنول بہزاد، لاہور سے۔ "اپنا تعارف کرا دوں، میں کنول صبا تھی شادی کے بعد کنول بہزاد کہلاتی ہوں۔ بچپن سے ہی کچھ اچھا اور مختلف کرنے کا شوق تھا۔ اسکول لائف سے ہی بچوں کے صفحات پر لکھنا شروع کیا اور اچھا خاصا لکھ لیتی تھی۔ کبھی کوئی تحریر ریجیکٹ نہیں ہوئی تھی۔ ہائر کلاسز میں آئی تو پڑھائی میں زیادہ مصروف ہو گئی۔ البتہ یونیورسٹی کے میگزین میں باقاعدگی سے لکھا۔ ایم اے اکنامکس اور ایم ایڈ کیا ہوا ہے۔ شادی کے بعد زیادہ تر ہاؤس وائف کے طور پر ہر وقت گزارا ہے۔ البتہ درمیان میں جب بھی وقت ملا مختلف اسکولز میں پڑھاتی رہی ہوں۔ آج کل بھی ایک اسکول میں سبجیکٹ کوآرڈینیٹر کے طور پر





کام کر رہی ہوں۔ ماشاء اللہ چار بچوں کی اماں جان ہوں ایک بیٹی اور تین بیٹے۔ (اللہ میرے بچوں کی عمر دراز کرے، آمین) خدا کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے بے حساب نوازا ہے۔ بس ایک تشنگی سی ہے کاش لکھتی رہتی۔ کاش دوبارہ اس دنیا کی باسی بن جاؤں۔ شادی کے بعد بیس سال ایسے ہی گزار دیے۔ ہاں آدھی ادھوری کہانیاں اِدھر اُدھر پڑی جیسے مجھے آواز دیتی رہتی ہیں مگر گھریلو مصروفیات ایسی ہیں کہ ذہن یکسو نہیں ہو پاتا۔ نثر لکھنے کے لیے وقت بھی تو چاہیے ہوتا ہے۔ شاعری البتہ ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے کیونکہ وہ تو خود بخود دل پہ وارد ہوتی ہے مگر آپ نے اگر حوصلہ افزائی کی تو شاید میں بھی پاکیزہ کی لکھاری ہونے کا اعزاز پا لوں۔ اب ذرا بات ہو جائے اس ماہ کے پاکیزہ کی۔ عمیرہ احمد اور عکس تو ہیں ہی میرے پسندیدہ۔ ان کے کیا کہنے...... عمیرہ احمد کی تو بہت پرانی پرستار ہوں میں۔ باقی اس بار جیا کی امی، دُرِ نایاب، موسم گل حیراں ہے بہت اچھے لگے۔ ایکس اسٹوڈنٹ کا اینڈ تو آغاز پڑھتے ہی پتا چل گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے بھی اچھا تھا۔ بہنوں کی محفل کے سارے خطوط شوق سے پڑھتی ہوں۔ کاش اگست کی محفل میں میرا بھی نام ہو۔ پاکیزہ کے سارے سلسلے اچھے ہیں۔ چاہے وہ جلترنگ ہو یا خوش ذائقہ، پاکیزہ ڈائری ہو یا سندیسے۔" (اس محفل میں خوش آمدید پہلے ہمارے مستقل سلسلوں کے لیے اپنی تحریریں ارسال کریں۔ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہو گی)

صائمہ احمد سحر، گاؤں بھابڑہ سے۔ "میں گزشتہ چار سال سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں مگر اس میں کچھ لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ حوصلہ افزائی کریں گی۔ جولائی کا پاکیزہ بہت پسند آیا۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ زندگی اور عکس دونوں ناول بہت زبردست ہیں۔ صائمہ اکرم کا مکمل ناول بہت پسند آیا، سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ جلترنگ مجھے بہت پسند ہے۔ میری طرف سے آپ کو اور تمام قاری بہنوں کو ایڈوانس عید مبارک قبول ہو۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہو گی۔ آپ ہر ماہ اپنی تحریریں ہمیں ارسال کریں)

شازیہ سرور، ونڈالہ دیال شاہ سے۔ "آنٹی انجم انصار صاحبہ آپ بالکل میری استاد ہیں ویسی جیسی میری پرائمری کی ٹیچر تھیں جو کہ مجھے ہمیشہ گائیڈ کرتی تھیں۔ اللہ آپ کو زندگی دے اور تندرستی عطا فرمائے۔ آپ پلیز مجھے کچھ بتائیں میری تحریر قابلِ اشاعت کیسے ہو سکتی ہیں تاکہ میں اپنے اندر بہترین مصنف کی خوبیاں بیدار کر سکوں۔ آنٹی میرے خاندان میں کوئی ایسا نہیں جو پڑھا لکھا ہو، جو کامیابی سے زندگی گزار رہا ہو تو میری اصلاح کون کرے گا۔ ایم اے، بی ایڈ کر چکی ہوں مگر میری زندگی بیکار ہے۔ میں اپنی زندگی کو کسی مقصد میں لگانا چاہتی ہوں۔ مجھ میں بے انتہا خامیاں ہوں گی میرا اندازِ تحریر ناپختہ ہو گا مگر آپ میری رہنمائی کریں تو میں انشاء اللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گی... کوئی بھی استاد کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ آپ خود کہتی ہیں کہ میں ہر نئی لکھاری کو خوش آمدید کہتی ہوں تو آنٹی آپ اپنے وعدے کے مطابق پلیز، پلیز مجھے بھی اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دے دیں۔ آپ مجھے تراشیں گی تو میں ضرور ہیرا بن جاؤں گی۔ آنٹی مجھے آج تک کوئی اچھا رہنما اور گائیڈ کرنے والا کسی بھی معاملے میں نہیں ملا۔ آپ مجھے تھوڑی سی توجہ دیں انشاء اللہ میں آپ کو ہر معیار پر پورا اتر کر دکھاؤں گی۔" (شازیہ خوش آمدید...... گڑیا تم ہر ماہ مجھے خط لکھو۔ تم سے وعدہ ہر ماہ شائع ہو گا)

سنبل ملک، شاہدرہ سے۔ "زم زم آپ کو اللہ پاک صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ آمین، آپ کو دنیا نے ستایا۔ آپ کا اعتبار اٹھ چکا ہے لوگوں سے۔ تو ایسا ہوتا ہے مگر جب بھی لاہور کی طرف آنے کا ارادہ کرو تو پلیز سنبل ملک کو ضرور یاد رکھنا۔ آپ کا انٹرویو مجھ سے ملیے میں پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور بہت اچھا لگا۔ پلیز زم زم دل چھوٹا مت کرو۔ اللہ پاک آپ کو دائمی خوشیاں عطا فرمائے۔ آنٹی انجم انصار صاحبہ کیا میں مجھ سے ملیے، میں شامل ہو سکتی ہوں؟" (جی ہاں، ضرور شامل ہو سکتی ہیں بلکہ ہر قاری بہن اپنا انٹرویو، تصویر یا بغیر تصویر کے بھی شائع کروا سکتی ہے)

فائزہ شہزاد، پشاور سے۔ "جی دل بہت خفا ہو چکا ہے میرا کیونکہ تقریباً سال بھر ہونے کو آیا کوئی خط شائع ہی نہیں ہوتا۔ دو ماہ پہلے بھی اتنا تفصیلی خط لکھا مگر دو لائنیں بھی شائع نہ ہوئیں۔ بچپن سے پچپن کی ہونے کو آئی ہوں پاکیزہ کے ساتھ ساتھ مگر اب ہماری یہاں جگہ ہی نہیں۔ کوئی تو وجہ ہو اس شانِ بے نیازی کی۔ آتے ہیں جی اب تبصرے کی طرف! سب سے



www.paksociety.com

پہلے تو ہم بھاگم بھاگ بہنوں کی محفل میں گھستے ہیں تا کہ پورے ملک کی بہنوں اور رائٹرز کے بارے میں جان سکیں۔ اپنا خط نہ پا کر بے حد افسوس ہوا اور دل بے حد خفا ہو گیا کہ آخر اس محفل سے ہمیں کیوں آؤٹ کر دیا گیا ہے؟ البتہ شگفتہ شفیق آپ کا شفیق سا مشورہ دل خوش کر گیا کہ نوک جھونک کے بغیر واقعی کچھ مزہ نہیں آ رہا۔ آخر کریلوں کا موسم ہے کچھ کڑوا بھی ہونا چاہیے لہٰذا میں نے ہمت کر کے یہ بیڑہ اٹھایا ہے لو بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ بھیا آل از ویل، یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ تبصرے کا مطلب ہوتا ہے تعریف بھی تنقید بھی۔ مجھے تو کبھی بھی تمام کی تمام تحریریں پسند نہیں آئیں، نہ جانے بہنوں کو کیسے آ جاتی ہیں۔ اس مرتبہ سعدیہ رئیس نے بھی مایوس کیا۔ کہانی کا شروع بہت اچھا تھا مگر اینڈ تو فضول تھا۔ یہ تو ایک عام سا جملہ ہے جو تقریباً ہر گھر میں بولا جاتا ہے آج کی لڑکیاں لگتا ہے کانچ کی بنی ہوئی ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر ٹوٹ جاتی ہیں۔ اب جیسے مجھے کوئی پوچھتا ہے کہ داماد اپنا ہے یا غیروں میں کیا ہے؟ تو اب اس میں ایسی کوئی انوکھی بات تو ہے نہیں۔ نہ جانے مصنفہ قارئین کو کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ شکر ہے کہ مصنفہ کی ہیروئن نے خودکشی نہیں کر لی اس بات پہ کیونکہ آج کل تو میڈیا یہی دکھا رہا ہے کہ اب تو خودکشی عام سی بات ہو گئی ہے۔ اب کسی دن یہ نہ ہو کہ ہفتے میں دو بار آلو پکنے پر بہو نے خودکشی کر لی، ہاں اگر یہ ہوتا کہ ایک بہو اچھی ہے اور ایک غیر تو اپنی علیحدہ ہو جاتی گھر والوں سے لڑتی جھگڑتی ہے اور غیر خدمتیں بھی کرتی اور گھر بھی سنبھالتی اور گھر والیوں کی سختیاں بھی سہتی اور آخر میں ساس یہ کہتی کہ ہے تو غیروں سے مگر اپنوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ میری بہو لاکھوں میں ایک ہے۔ واہ جی واہ کیا کہنے اقبال بانو کے۔ کافی عرصے بعد ان کی تحریر پڑھ کر سواد آ گیا اور شمیم فضل خالق نے بھی ہمیشہ اپنی روایت برقرار رکھی ہے مگر ایک سمجھ نہیں آتی ہیروئن چاہے فلم کی ہو یا افسانے کی وہ اتنی معصوم کیوں ہوتی ہے؟ یا پھر ہم چالاک ہو گئے ہیں۔ سلسلے وار ناول اچھے جا رہے ہیں مگر عکس کہیں کہیں بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ عمیرہ احمد کی کہانیوں اور ناولز کی تو کیا بات ہے؟ مگر ایک بات کہ پلیز پلیز! آپ غیر ضروری طوالت سے اجتناب برتیں۔.. کیونکہ زیادہ طوالت بھی مزہ نہیں دیتی۔ اتنی بھول بھلیاں ہیں اس ناول میں کہ آگے جانے کے لیے بار بار پیچھے سے راستہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ آپی جی سندیسے اور میں اکثر گنگناتی ہوں واقعی ختم کر دیں کیونکہ آج کل شعر تو کوئی نہیں گنگناتا ہر کوئی چکنی چنبیلی اور منی بدنام گنگناتے ہیں۔ ہمارا وہ گنگنانے والا دور اب نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔" (فائزہ نانی بننے کے بعد منی بدنام والا گنگناتی ہو...... اب نانیاں اور دادیاں بھی تو اسٹار پلس جیسی ہو گئی ہیں۔ ہاں تبصرے کا شکریہ)

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "انجم آپی پاکیزہ کی طرف سے ایوارڈ کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا ہے کتنا مزہ آتا تھا نا؟ حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور انعامات کے دیگر سلسلے بھی بند ہو گئے ہیں۔ پلیز کچھ کیجیے نا۔ قرۃ العین رائے نے اچھے موضوع پر لکھا۔ اللہ تو بندوں کے بھرم رکھتا ہے مگر بندے بندوں کے بھرم نہیں رکھ سکتے کم ظرف ہوتے ہیں نا۔ نگہت سیما کا ناول اچھا لگا۔ ابا کا کریکٹر بڑا دبنگ ہے ہوتے ہیں کچھ ہٹلر باپ اپنی محرومیوں کا بدلہ اولاد سے بیوی سے وصول کرتے ہیں ایسا ہونا تو نہیں چاہیے مگر نہ جانے کیوں ہو جاتا ہے۔ جلترنگ میں ایسی یا ویسی مزے کا تھا... زیر لب گفتگو منظر عام پر آ جائے تو کس قدر سبکی ہوتی ہے بس دل ٹھنڈا کر لیتا ہے بندہ مارے مروت کے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیا، کیا جائے رشتے ہی نازک ہوتے ہیں۔ انجم باجی میرے افسانے کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ پلیز کچھ کریں۔ اختر بیگانہ کے انتقال کی خبر سن کر دکھ ہوا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے لواحقین کو صبر دے، آمین۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ صائمہ سلیم، فیصل آباد سے۔ "اس ماہ سارے افسانے ہی بہت اچھے ہیں مگر عنیزہ سید کے مکمل ناول نے تو کمال کر دیا۔ یہ بہترین ناول تھا اور عنیزہ سید ہماری فیورٹ رائٹر ہیں اور ہمیں ان کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔" (عنیزہ سید ہماری فیورٹ رائٹر ہیں اور ان کی تحریروں کے ہم بھی بہت بڑے مداح ہیں)

✍ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ "تمام سلسلے وار ناولز نہایت ہی شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ عمیرہ کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔ "عکس" عمیرہ احمد کی ایسی تخلیق ہے جس پر ہم سب کو ہی ناز ہے۔ اپنے حق کے لیے لڑنا اور ایک عورت کا ہر محاذ پر کامیاب ہونا یہ سب پڑھ کر ہمارے اندر خود بخود ایک توانائی پیدا ہوتی ہے





کہ عورت اگر چاہے اور مخلص، ایماندار اور سچائی کے رستے پر ہو تو وہ مردوں سے کسی بھی طور پر کم نہیں۔ کبھی کبھی بیچارے شیر دل پر ترس آنے لگتا ہے۔ بہرحال یہ عمیرہ کی ایسی تخلیق ہے جس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسری طرف ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی زندگی نے بھی زندگی کے کئی پہلو اجاگر کر دیے ہیں۔ تسنیم بے چاری تو بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئی۔ اتنی بڑی ٹھوکر کھا کر عقل آ جانی چاہیے۔ والدین کبھی بھی اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ یہ وقتی محبتیں چڑھتے ہوئے طوفان کی طرح ہوتی ہیں۔ افسانے بھی اس دفعہ شاندار تھے عقیلہ حق کی اچھی تحریر تھی۔ عنیزہ سید مکمل ناول کے ساتھ تشریف لائیں اور چھا گئیں۔ مولسری والی نانی کے گھر کے مرتبانوں کے مربے ہمارے منہ میں بھی پانی لا رہے تھے۔ ہم نے بھی گھر بیٹھے شندور فیسٹیول میں شرکت کر لی۔ صائمہ حیدر کی دھوپ چھاؤں بھی اچھی تحریر تھی۔ واقعی جن لوگوں کے گھر والے دیارِ غیر میں جہازوں میں ایک پُر خطر زندگی گزار کر اپنے گھر والوں کے لیے روزی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں ان کے پیچھے گھر والوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اللہ سب کے گھر والوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ بیٹیاں واقعی پھول ہوتی ہیں، عظمیٰ افتخار کی ایک اچھی کاوش۔ شائستہ صاحبہ کا سروے رمضان کے حساب سے بہترین تھا۔ نگہت اعظمی صاحبہ کو ڈھیروں مبارک باد بہنوں کی محفل پڑھ کر سب کی خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ جلترنگ میں بات کا بتنگڑ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عورتوں سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ لوڈشیڈنگ میں آپ نے جو نقشہ کھینچا ہے اسے پڑھ کر شکر ادا کیا کہ ہمارے علاقے میں بھی چھ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ ہوتی ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ فرخندہ انجم، لاہور سے۔ "پاکیزہ کے شائقین کے لیے عمر اور جنس کی پابندی کا کوئی رواج نہیں۔ سو حسبِ معمول ماہنامہ شوق سے پڑھا۔ آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میرے ساتھ میرے بچے بھی پاکیزہ پڑھتے ہیں اور جب کوئی کہانی میرے دل کو بہت چھو جائے تو میاں کو بھی پڑھا دیتی ہوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آخری سطور نے دل کو جھنجوڑ ڈالا اللہ ہماری قوم میں حب وطن کا شعور پیدا کرے آمین، زندگی کی ہر سطر زندہ تھی۔ عکس کی موجودہ قسط الجھنوں سلجھنوں سے گزرتی ہوئی منطقی انجام تک جاتی ہوئی دکھائی دی۔ عمیرہ احمد کا انٹرویو کر ڈالیے میری تو جب بھی بات ہو ہولے سے مسکرا کر ٹال جاتی ہیں۔ اس ماہ لاپتا، صلہ، دھوپ چھاؤں، بیٹیاں پھول ہیں نے معاشرتی حالات ورویوں کی مناسب عکاسی کی۔ افسانہ درد میں نبیلہ نے درد کو کسی انہونی کا پیش خیمہ ٹھہرایا کوئی مثال دے کر واضح کرتیں تو زیادہ بھلا لگتا۔ تہی دست میں مصنفہ نے نسائیت کی خوب ترجمانی کی۔ بہرصورت آپ اپنا نیا ناول جلدی سے لے آئیں کیونکہ سید ھے سبھاؤ کی معاشرتی، خانگی، معاشی جذباتی پہلوؤں کی عکاس رواں تحریر کی کمی کا احساس ہو رہا ہے۔ جولائی کا سرورق بھی خوب تھا اور اگست کا بھی بہت اچھا۔ آپ کی محنت رنگ لائی ہے۔ عنیزہ سید کے روشن جگنو اور جل پریاں نے محبت کی طاقت کا خوب صورت احساس دلایا، عقیلہ حق کا حصار محبت اچھا رہا۔ اگر وہ ماں کو سوتیلا نہ بھی دکھاتیں تو فرق نہ پڑتا کیونکہ کئی دفعہ سگے رشتے بھی بے رحم اور خود غرض ہو جاتے ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ...... ہم عمیرہ احمد کا انٹرویو جلد شائع کریں گے، انشاء اللہ)

✍ منیزہ نعیم، راول پنڈی سے۔ "جولائی کے شمارے میں اپنا انٹرویو، انٹرویو کارنر میں پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ بہرحال غلطی سے میرے شہر کا نام راول پنڈی کی جگہ گجرات چھپ گیا جبکہ میں نے جائے پیدائش گجرات لکھی تھی۔ اگست میں شامل نہ ہو سکی میری دونوں بیٹیاں معصومہ نعیم اور عطرو بہ نعیم میٹرک میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئیں اور ان کا داخلہ راول پنڈی کے سی بی ون کالج میں ہو گیا ہے۔ اگست کا شمارہ اچھی طرح سے پڑھ کر اب تبصرہ لکھنے بیٹھی ہوں۔ سب سے پہلے انجم آپی کا مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا پھر دین کی باتیں پھر پیارے نبیؐ کے اسمائے گرامی تمام مصنفات نے خوب لکھا۔ عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ، عنیزہ سید، نگہت سیما، نبیلہ ابر سب نے ہی اچھا لکھا۔ لگتا ہے عورتوں کے گھریلو دکھ گھروں میں گھس کر لکھتی ہیں اور اینڈ میں اتنے اچھے طریقے سے کہتیں ہیں کہ بہنوں کو پریشانی نہ ہو صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپی زندگی اتنی پریشان ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ ہماری رائٹر مزاح لکھنا بھول گئی ہیں، ایک آپ کا جلترنگ پڑھ کر بے ساختہ مسکراہٹ آ جاتی ہے آپ کا مزاحیہ بھی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے بہرحال۔ شائستہ زریں کی روزے داروں کے لیے احتیاطی تدابیر ڈاکٹرز کی رائے اچھا لکھا ہے۔ کتاب کی رونمائی کی تقریب کے بارے میں رجا فاطمہ نے اچھا لکھا۔ عظمیٰ افتخار کا بیٹیاں پھول ہیں اچھی کاوش ہے۔ عکس زبردست جا رہا ہے۔

www.paksociety.com

اپنے دل میں اشعر کی محبت رکھ سکتی ہے۔ اگر محبت تھی بھی تو اتنا تو جانتی ہی تھی کہ اشعر ایسا نہیں اور اس کا ہونے والا شوہر ہے پھر ایسا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ لاپتا، لاجواب تھی۔ کتنے گھرانے زندہ مدفون ہو چکے ہیں مگر وہ دادرسی کس سے ملے جو انہیں سکون دے سکے۔ ہمارے حکمرانوں کی بے حسی سے کتنے گھر اجڑ چکے ہیں مگر کوئی سننے والا نہیں۔ دھوپ چھاؤں، بھی نارمل لگی۔ درد، ہیں شروع میں لگا کہ اشعر کو ہی کچھ ہوگا مگر اینڈ بالکل مختلف ہوا۔ تہی دست، میں مومنہ کا ناشکرا پن ظاہر تھا مگر اس کی ساس کا رویہ بھی بالکل مناسب نہیں لگا کہ ہر بات آنکھ بند کر کے مان لی جائے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں اور نتیجہ سامنے تھا۔ بیٹیاں پھول ہیں' واقعی سبق آموز تحریر تھی اس کے علاوہ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ جلترنگ پڑھ کے مزہ دوبالا ہو گیا۔ زبردست آنٹی، میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمام پاکیزہ بہنیں خاص کر جو کراچی میں رہتی ہیں وہ تو کسی نہ کسی بہانے مل ہی لیتی ہیں مگر دوسرے شہروں میں رہنے والے نہیں مل سکتے تو کیوں نہ کم از کم ایک شہر میں رہنے والے ہی ایک دوسرے سے مل لیا کریں کبھی کبھی۔'' (بالکل، پسندیدگی کا شکریہ)

☒ تسنیم ماہ پارہ، کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا محبت بھرا اسلام عذرا رسول کے توسط سے ہمیں مل گیا ہے۔ دیکھیے آپ...... گلف مال میں عذرا رسول صاحبہ سے آپ کی ملاقات ہوئی...... اور آپ نے جو انہیں میسج دیا ہمیں مل گیا ہے...... اب آپ ہر ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ اس محفل میں حاضر ہوں تاکہ ہمیں دلی خوشی ہو۔

☒ ثمینہ، قائد آباد کراچی۔ خوش آمدید۔ آپ پاکیزہ میں شائع ہمارے روحانی مسائل و مشوروں سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ ہم آزمودہ اور قرآنی دعائیں بتاتے ہیں جس کے پڑھنے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

☒ ایس رابعہ، کراچی۔ میری نظر میں فی الحال کوئی ڈاکٹر، انجینئر یا کسی بڑی پوسٹ پر فائز لڑکی کا رشتہ نہیں ہے جو میں آپ کے ایم ایس بیٹے کے لیے بتاؤں۔ ایک مشورہ ہے کہ ان دنوں رائٹرز جو ٹی وی کے لیے لکھ رہی ہیں۔ وہ خوب کما رہی ہیں۔ اگر آپ اپنے بیٹے کی شادی کسی رائٹر سے کرنا چاہیں تو وہ میں بتا سکتی ہوں۔ اب ڈاکٹر اور انجینئر تو کچھ بھی نہیں کما رہے، رائٹرز کے مقابلے میں۔ سوچ لیں۔

☒ فائزہ فیروز، کراچی۔ آپ نے ہماری توجہ سلمیٰ غزل کے افسانے کی چند سطور کی طرف دلائی ہے۔ ادارہ ہمیشہ یہ احتیاط کرتا ہے کہ رنگ و نسل، ذات پات یا عقیدے کی بنیاد پر ایسا کوئی مواد شائع نہ کیا جائے جو کسی بھی قاری کی دل آزاری کا سبب بنے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ مذکورہ سطور سہواً شاملِ اشاعت ہو گئیں۔

☒ یاسمین ناز، سندھ۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ بہنوں کی یہ محفل کتنی پڑھی جاتی ہے اور کیسی کیسی شخصیات اس کو پڑھتی ہیں اور اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر ہماری ایک قاری بہن مسز فیروزہ شوکت جو تہجد گزار خاتون ہیں بلکہ ہمہ وقت عبادت کرتی ہیں۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل پڑھ کر ہر ایک کے نام کے ساتھ روزانہ دعا کرتی ہیں۔ ابھی کل میری ان سے بات ہو رہی تھی تو وہ بتا رہی تھیں ان کی ہر نماز کی دعا میں پروین شاکر، شازیہ چوہدری، خالدہ اسد، ایم کے صوفیہ، چاندنی، شگفتہ کنول اور اب لبنیٰ عروج بھی شامل ہو گئی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں بے لوث، جو کسی سے زندگی میں بھی نہیں ملے مگر پھر بھی ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ ان کی دعاؤں میں پاکیزہ میں شامل تمام افراد ہوتے ہیں کہ وہ ہم سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ اگر کوئی ہماری اپنی بہن بھی ہوتی تو وہ اتنی محبت نہ کرتی۔ یاد رکھیے کہ دعاؤں سے بڑھ کر انمول اور قیمتی تحفہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے آپ کا یہ کہنا کہ بہنوں کی محفل کی جگہ کوئی ناولٹ لگا دیا جائے بالکل غلط ہے یا کم از کم میری سمجھ میں تو بالکل ہی نہیں آیا ہے کہ تبصرے پڑھ کر بھی ہماری مصنفات کو اپنی تحریروں کے بارے میں ایک رائے مل جاتی ہے جو کہ بہت ضروری ہوتی ہے۔

✍ عائشہ خالد، میرپور خاص سے۔ ''آپ مجھ سے اور میری زندگی سے بہت حد تک آگاہ رہی ہیں۔ میرے ابو کا جب میں 6 سال کی تھی انتقال ہو گیا تھا۔ میری امی نے بہت محنت کر کے ہمیں پڑھایا لکھایا۔ میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے ایم اے کیا اور جاب کی۔ 9th کلاس سے میں پاکیزہ کے سلسلوں میں شرکت کرنے لگی تھی اور 7th کلاس سے ہی



پاکیزہ کے تمام شعبہ جات کے لوگوں نے اپنے اپنے شعبے خوب سنبھالے ہیں۔ ماشاء اللہ سے باقی تمام ادارے کے اراکین کو عذرا آپی، انجم آپی، معراج بھیا سب کو دلی عید مبارک اللہ تعالیٰ آپ سب کو عید کی خوشیاں بھرپور طریقے سے منانے کی توفیق عطا کرے، آمین۔'' (اور آپ کو بھی)

✍ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ''اختر بیگانہ اور دیگر مرحومین کے متعلق پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ ایک اور مصنفہ ہم سے بچھڑ گئیں، اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔ قرآن پاک اور اسمائے محمدؐ سے فیض یاب ہونے کے بعد مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا جس میں آپ نے مل جل کر رہنے اور اپنی غلطیوں کی تلافی کے متعلق درس دیا بہت اچھا لگا۔ اس پر عمل کرتے ہوئے جلدی سے تیار ہو کر بہنوں کی محفل میں حاضری دی کچھ ان کی سنی کچھ اپنی بتائی۔ پھر اچانک ہی کوئی سایہ سا لہرایا اور اس سائے کی طرف یوں لپکی جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کی طرف لپکتا ہے، جی ہاں میں عمیرہ احمد کے عکس کی بات کر رہی ہوں جو پورے ایک ماہ کے انتظار کے بعد نظر آتا ہے۔ عکس مراد نے اتنی اہم پوسٹ پر ہونے کے باوجود بھی اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تو معطل کر دی گئی۔ بہرحال، امید ہے عکس کے ساتھ کچھ اچھا ہی ہوگا۔ ناہید سلطانہ کی زندگی میں عباد پہلی قسط میں تو بہت سلجھا ہوا دکھایا مگر اس نے بھی عام لوگوں کی طرح جہیز کی لسٹ بھجوا دی، حالانکہ کسی بہتر طریقے سے بھی انکار کر سکتا تھا۔ مدثر کا ڈیڈی کی شاندار آفر پر غور کرنے کا مطلب ہے تسنیم کا مستقبل ٹائیں ٹائیں فش۔ جیا کی امی نے تو کمال کی جرأت دکھائی۔ جیا کی امی نے جو یہ کہا کہ بس سروائیو کرنا چاہیے تو اس کے بس کی بات نہ تھی اس کی فطرت ہی ایسی تھی بعض لوگ فطری طور پر جرأت مندانہ مظاہرہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ سعدیہ رئیس کی اپنے بیگانے میں قرینہ ضرورت سے زیادہ حساس نکلی۔ تابندہ جبیں کی ایکس اسٹوڈنٹ میں ٹین ایج میں ایسا ہو جاتا ہے کہ لڑکیاں کسی کے التفات کی نظر کو کچھ اور معنی دے دیتی ہیں حالانکہ سر آذر اس کو لائق اسٹوڈنٹ کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ سکینہ فرخ کی دُرِ نایاب تو واقعی ہی نایاب موتی نکلی کھیر پکوائی میں دُرِ نایاب کی ماں کا دل تو دھڑک ہی رہا تھا یہ سب پڑھتے ہوئے میرا اپنا دل رکا ہوا تھا کہ کیا ہونے والا ہے مگر اینڈ پڑھ کر حوصلہ ہوا کہ میری بیٹی بھی اپنا مقام مستقبل میں بنا سکتی ہے۔ کیونکہ جب بھی ہاسٹل سے آتی ہے چلتے پھرتے ٹوٹکے بتاتی رہتی ہوں۔ صائمہ اکرم چونکہ مسز ڈاکٹر ہیں میرا مطلب ہے ڈاکٹر کی مسز ہیں لہٰذا اب بیماریوں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی رہتی ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ حمیرا کلیم، ملتان سے۔ ''ٹائٹل اتنا خوب صورت اور کلرفل لگا کہ دل خوش ہو گیا۔ اداریہ اور دین کی باتیں پڑھ کر سب سے پہلے عکس پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت انداز نے رسالہ ہاتھ سے رکھنے نہیں دیا، زبردست۔ امید ہے عکس کی شادی شیر دل سے ہی ہوگی۔ ہمارے ہاں صرف اپر کلاس میں ہی نہیں بلکہ ہر طبقے میں لوگ گھناؤنے جرم چھپانے کے لیے جھوٹ پہ جھوٹ بولتے ہیں۔ شہباز کے فعل کے تناظر میں اس کا انجام دیکھیں تو اس کے ساتھ ٹھیک ہوا اور امید ہے منزہ کو بھی اب سکون آجائے گا۔ حصارِ محبت اچھی تحریر تھی۔ ہمارے معاشرے میں ہر گھر میں ایسے ہی مرد زیادہ تر پائے جاتے ہیں جو کبھی بھی بیویوں کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے کہ اپنی توہین محسوس ہوتی ہے انہیں۔ مگر کہانیوں کا یہی تو مزہ ہوتا ہے کہ شخص لمحے میں کایا پلٹ جاتی ہے اور حقیقی زندگی میں ڈھٹائی پھر بھی برقرار رہتی ہے۔ کوئی شہر ایسا بساؤں میں، اچھی تحریر ہے۔ معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی۔ صلہ بہت نارمل سی کہانی لگی۔ زندگی، انتہائی شاندار ہے اور واقعی زندگی کے نشیب و فراز دکھاتی ہے۔ اور ایک جملہ کہ جن گھروں میں مردوں سے باتیں چھپائی جائیں وہاں حادثات رونما ہوتے ہیں۔ زبردست لگا۔ مونس کا تسنیم کو پڑھائی کے لیے قائل کرنا اچھا لگا۔ حجاب کا فیصلہ اور جرأت قابلِ دید ہے اور اس کے گھر والوں کا رویہ کس قدر حقیقی منظر پیش کرتا ہے کہ عورت ہی ہر غلط فیصلے پر سر جھکائے، کیوں اسے کمزور بنا کر پیش کیا جائے کہ جب کسی کا دل کرے محض اپنی تسکین کی خاطر اسے استعمال کرے۔ عباد آج کل کے نوجوانوں کی طرح سوچ رہا ہے مگر ہو گی اس کے ساتھ بُری۔ روشن جگنو اور جل پریاں، نام ہی بہت خوب صورت تھا کہ بار بار ٹائٹل پڑھا اور عنیزہ تو لکھتی ہی بہت زبردست ہیں۔ ہم الزام ان کو دیتے تھے، خاص اچھا نہ لگا۔ نازش جو کہ پرائمری میں پڑھتی تھی اور حویلی کے مردوں سے جا چکی تھی اور حویلی کے مردوں سے نفرت کرتی تھی وہ اتنی سی بچی کیسے

www.paksociety.com

میں اپنی امی کی کڑھائی سلائی میں مدد کرنے لگی تھی۔ ایک دفعہ ہمارے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دن پاکیزہ کی طرف سے ملنے والا 300 کا انعام بہت مددگار ثابت ہوا تھا اور مجھے یاد ہے ایک دفعہ گھر میں نہ بل کے پیسے تھے نہ راشن کے اس دوران 2000 کی مدد شاید کسی شگفتہ نے پاکیزہ کی طرف سے آپ کے کہنے پر کی تھی وہ میری زندگی کا نہ بھولنے والا لمحہ تھا۔ مجھے لگا تھا غیب سے مدد ہوئی ہے۔ اس کے بعد لٹریسی میں میری جاب ہوگئی پہلی تنخواہ ایک ہزار اور تین سال بعد میں منیجر بن کر اسی ادارے سے 35 ہزار تنخواہ لے رہی تھی پھر اچانک NCHD مشکلات کا شکار ہوگئی۔ اور میں نے سیلاب زدگان کی محبت میں ایک اور ادارے میں اپلائی کیا۔ پہلے والنٹیئر بن کے کام کیا اور اس ادارے نے میری لگن دیکھتے ہوئے مجھے 50 ہزار اور دیگر مراعات دیں اور میں نے تقریباً 2 سال جیکب آباد جیسے گرم ترین شہر میں فیلڈ ورک کیا۔ جیکب آباد کے لوگوں کی دعائیں تھیں یا اللہ کی مرضی کہ ایک جیکب آباد کی بہت اچھی فیملی نے مجھے پسند کیا۔ جن کا بیٹا کراچی میں رہتا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی بہو بنالیا۔ 28 جون کو میر پور خاص میں میرے والدین کی مرضی سے یہ رشتہ طے پایا اور نہایت سادگی سے نکاح ہوگیا اور عید کے بعد رخصتی ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے جب میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی اس دور میں ایسا ہونا بہت عجیب لگا۔ بہن بھائیوں اور والدہ کو چھوڑنا گھر کے حالات، والدہ کی بیماری سب میرے سامنے تھے کیا میرے بعد میرے گھر کے حالات دوبارہ ویسے ہو جائیں گے یہ سوچ کر بہت پریشان ہوں۔ اس کے علاوہ میں 50 ہزار میں سے 3 فیملیز کی مدد کرتی ہوں۔" (گڑیا مدد کرنے والا اللہ ہے۔ سب کام ہو جائیں گے)

✍ عروج ذکی آفندی، کراچی سے۔ "ہر دفعہ ٹائٹل الگ سا ہوتا ہے۔ سرورق کافی کلیئر ہوگیا ہے کوئی ایسا شہر بساؤں میں، نگہت سیما کی اچھی کاوش ہے۔ دلچسپی کا عنصر نمایاں ہے۔ پڑھنے میں مزہ آرہا ہے۔ عکس نے تیزی سے موڑ کاٹا ہے کہانی تیزی سے آگے بڑھی رہی ہے۔ عمیرہ احمد کی کہانی پر مکمل گرفت ہے اتنی مشکل باتوں کو کہانی میں آسان زبان میں کہہ دینا واقعی عمیرہ کا کمال ہے۔ لاپتا، نمرہ احمد کی حقیقت سے قریب ترین کاوش ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں کیا کب ہو جائے کچھ پتا نہیں اور اسی طرح بہت سے گھروں سے افراد کی گمشدگی آج کل بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ موجودہ حالات کی خرابی میں یہ مسئلہ اٹھانا یقیناً نمرہ نے اچھی کوشش کی ہے۔ انجم آپی آپ کب ناول یا کہانی کی صورت میں انٹری دے رہی ہیں۔ بھئی کوئی اچھا سا انعامی سلسلہ دیا جائے تو قارئین کی پسندیدگی اور بڑھے گی۔ جلترنگ پڑھ کر کتنی دیر تک ہنسی آتی رہی کہ انجم باجی کیسے تاک تاک کر نشانے لگاتی ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ جلترنگ کے لیے بس آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش شروع کروں میرا دماغ بھی اس طرف زیادہ چلتا ہے۔ کہیے شاگردی میں قبول کریں گی۔ (ضرور) اداکاروں کے انٹرویو کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے یا میڈیا کے مشہور لوگوں کے انٹرویو شائع کیے جائیں۔ ہومیو کلینک میں بھی ڈاکٹر صاحب کافی تفصیلات سے بیماریوں کا احوال دے رہے ہیں جس سے ہم جیسے بہت سے قاری مستفید ہوتے ہیں۔ زندگی، بھی بڑے تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے مگر اتنی اچانک تسنیم کی طلاق پر افسوس ضرور رہا۔ ناہید سلطانہ آنٹی اپنے ہر کردار کے ساتھ بخوبی انصاف کر رہی ہیں۔ مگر اب حجاب خود خلع پر تلی ہوئی ہے دوسروں کو انصاف دلانے کے چکر میں۔ خیر اسی کا نام زندگی ہے۔" (بالکل)

✍ فرحت نسیم، ڈیفنس لاہور کینٹ سے۔ "ماہ اگست کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں آپ ہمیشہ ایک راہ دکھاتی ہیں جس پر عمل کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت ایک قوم ہمارا مزاج یکسر بدل گیا ہے۔ مجھ سمیت ہر کوئی قولاً دعوے کرنے کا عادی ہوگیا اور عمل صفر۔ پیارا پاکستان تو ہمارے ہتھے چڑھ کر اس حالت کو پہنچ گیا۔ ایک اینٹ نئی لگانے کی کسی نے تکلیف نہیں کی بلکہ لگی اینٹ کو اکھاڑنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ملک کا کیا حال ہوگیا یہ سب ہماری شاطرانہ اور منافقانہ چالیں ہیں جن کے سبب عوام کا خون بہہ رہا ہے۔ نہ رمضان کی عقیدت اور نہ محرم کی حرمت ماہ جون و جولائی کے دونوں پرچے بہت شاندار تھے۔ عکس اور زندگی اب نئے موڑ لے رہے ہیں۔ سب تحریریں آپ کی ہمت افزائی اور لکھاری بہنوں کی ہمت و محنت کی عکاس ہیں۔ جزاک اللہ دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کی ترغیب ایک کار ہائے نمایاں ہے۔ مجھے یقین ہے نہ صرف قاری بلکہ کئی اور بہنیں بھی اس عادت کو اپنا لیں گی۔ بہنوں کی محفل میں شریک ہوں یا نہیں لیکن ہمیں اپنے پاس ہی پائیں





گی۔ یوں تو جلترنگ ہر ماہ نئے موضوع کے سبب بہت پسند ہے مگر بھئی جولائی کے جلترنگ میں ایسی یا ویسی تو بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ انجم آپ نے انسانی نفسیات کے ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ کوئی مانے یا نہیں مگر میرے ساتھ تو اکثر یہ ہوتا ہے اور پھر میں تو یہ کرتی ہوں اپنے دل میں پیدا ہونے والے ایسے خیالات پر۔ الماری کی صفائی کا نقطہ سمجھایا ہے اب کسی بند بکس کو ہوا لگوا دیں۔ عظمیٰ آفاق سعید بیٹی آپ نے لکھا تھا لگتا ہے اب مجھے ہی اٹھنا پڑے گا۔ تو بیٹا یقیناً آپ کو ہی اٹھنا ہے کسی نئے سلسلے کے ساتھ۔" (پسندیدگی کا شکریہ، آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ فرحت احمد، کراچی سے۔ "بہنوں کی محفل کے ذریعے تمام پاکیزہ بہنوں، آپ کے اور متعلقہ افراد کے حالات سے باخبر رہی ہوں۔ تمام لوگوں کے دکھ اور سکھ میں شریک رہی ہوں اور دعا گو رہی ہوں آپ کو اور جن جن مصنفات کے سیریل ٹی وی چینلو پر دکھائے جا رہے ہیں ان کو بہت بہت مبارک باد۔ رخ چوہدری کا خط پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ ان تمام متعلقہ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اب آئیے کچھ تبصرے کی جانب۔ سب سے پہلے عکس کا ذکر ہو جائے۔ پلاٹ، ڈائیلاگ، کہانی، کردار، ترتیب ہر لحاظ سے مکمل اور پرفیکٹ۔ (آخر عمیرہ احمد ہیں) نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں، اچھا جارہا ہے، تبصرہ مکمل ہونے پر۔ حصار محبت، صلہ، لاپتا، دھوپ چھاؤں، درد، تہی دست، بیٹیاں پھول ہیں اچھے لگے۔ زندگی اپنے تمام تر مسائل سمیت پسند آرہا ہے۔ اب آئیے سب سے زیادہ پسند آنے والا مکمل ناول روشن، جگنو اور جل پریاں، جی ہاں عنیزہ سید کا مکمل ناول مجھے بے حد پسند آیا۔ ان سے کہہ دیجیے گا۔ باقی تمام سلسلے تو پسند ہی آئے ہیں۔ نگہت اعظمیٰ کی کتاب آبگینے کی تعارفی تقریب اچھی لگی۔ باجی اگر میں کوئی افسانہ بھیجنا چاہوں تو اسی پتے پر بھیج سکتی ہوں؟" (بالکل بھیج سکتی ہیں۔ عام ڈاک سے یا رجسٹرڈ مگر دونوں صورتوں میں فوٹو اسٹیٹ نقل آپ اپنے پاس ضرور رکھیں)

✍ ایشل شادیان، گولارچی سے۔ "اپنے بزرگوں سے بھی پاکستان بننے کے حالات سے سکھوں کے مظالم کی روداد یں سنیں تو دکھ ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے کتنی قربانیوں کے بعد یہ وطن حاصل کیا جس کا نام بھی رکھا گیا تو کیا؟ پاکستان اور آج اسی پاکستان کے حالات رلاتے ہیں۔ اس طرح اس پاکستان میں بھی لاشے گرائے جاتے ہیں۔ مظلوموں کا خون بہایا جاتا ہے۔ حکمران سوچتے کیوں نہیں؟ جو سب کچھ پاکستان بننے کے وقت ہوا تھا وہی آج پاکستان میں ہو رہا ہے مگر کیوں؟ کیا اب بھی کسی اور وطن کی ضرورت ہے؟ پاکیزہ کی ہر تحریر پسند آئی۔" (شکریہ)

✍ عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔ "آپ نے انٹرویو کارنر کے لیے میری تصویر طلب کی ہے تو جواب یہ ہے کہ میں حجاب لیتی ہوں۔ اسی وجہ سے اپنی تصویر شائع نہیں کروانا چاہتی۔ آپ برائے مہربانی اسی طرح انٹرویو لگا دیں۔ اگر کھو گیا ہے تو بتا دیں میں پھر سے بھیج دوں گی۔ اب تبصرے کی طرف آتی ہوں۔ عکس، بلاشبہ پاکیزہ کی جان ہے اور عمیرہ جی ٹی وی پر تو آپ آجاتی ہیں ہمیں پاکیزہ میں اپنا دیدار کیوں نہیں کرواتیں؟ ایک لمبے چوڑے انٹرویو کے ساتھ حاضری لگائیں تاکہ ہماری بے چین دھڑکنوں کو قرار آئے۔ زندگی، میں حجاب کی زندگی عجب دوراہے پر آکھڑی ہوئی ہے۔ مجھے بے چاری سے بے حد ہمدردی ہے۔ خدا جانے وقت کس کروٹ بدلتا ہے۔ تسنیم کی مشکل کچھ تو آسان ہوئی۔ ویسے اس جیسی عاقبت نا اندیش لڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جو گھر جیسی مضبوط پناہ گاہ کو چھوڑ کر اوروں میں تحفظ ڈھونڈتی ہیں اس مرتبہ تو پاکیزہ میں بڑے بڑے نام دیکھ کر دل اش اش کر اٹھا۔ مکمل ناول روشن جگنو اور جل پریاں، عنیزہ سید کے مخصوص اسٹائل میں پڑھنے کو ملا۔ ویسے عنیزہ جی اور عمیرہ احمد میں کچھ کچھ مشابہت لگتی ہے۔ لاپتا، نمرہ احمد کی تحریر کی طرح پراسرار ہی لگا۔ آخر میں لالہ کا روکھا انداز اور آدم بیزاریت نے منہ کا ذائقہ کڑوا کر دیا۔ خیر تحریر اچھی تھی اور نمرہ احمد نے اتنے کم عرصے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ یہ بھی خداوند کریم کی دین ہے۔ آنٹی آپ نے میری تحریر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نبیلہ ابر راجہ کو اتنے عرصے بعد پاکیزہ میں پاکر خوشی ہوئی۔ باقی مستقل سلسلے اور دیگر تحریریں ہمیشہ کی طرح اے ون تھیں۔ بہنوں کی محفل تو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ گویا یہ پاکیزہ کی جان ہے۔ بہنوں کی کھٹی میٹھی باتیں تبصرے و نگارشات دل کو خوش کر دیتے ہیں۔" (آپ کا پیغام عمیرہ احمد تک پہنچایا جارہا ہے۔ ہاں آپ اپنا انٹرویو بغیر تصویر کے دوبارہ بھیج دیں۔ دوسری اہم بات آپ کا خط اور مراسلات صفحہ چھوڑ کر آخری حصے میں



www.paksociety.com

چھپتے ہوتے ہیں۔ آپ حاشیہ ضرور چھوڑیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدھے سے زیادہ حصہ چھوڑ دیا جائے)

✍ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ”سرورق قابلِ قبول لگا۔ رمضان المبارک کی مبارک ساعتیں ہم بھی سمیٹ رہے ہیں کاش کہ بخشش کا سامان کرسکیں، میں روایتی انداز میں عمیرہ احمد اور ان کے عکس کی تعریفیں نہیں کروں گی کیونکہ عمیرہ لکھنے کے فن میں بے مثال ہیں اور عکس ان کی تحاریر میں ستاروں کے بیچ چاند کے مانند ہے۔ ہاں عکس کی قوتِ ارادی خواتین کے لیے مہمیز کا کام دے گی، یوں بھی اپنے حق کے لیے لڑنا سراسر انصاف ہے۔ ناہید سلطانہ نے زندگی میں حجاب کو بھی کم و بیش اسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار کیا ہے، حجاب کا طرزِ عمل درست ہے۔ الطاف نے نکاح کر کے اسے خریدا نہیں۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ صد افسوس تسنیم کے ساتھ مدثر نے بہت بُرا کیا۔ اس کا احتساب بھی ضروری ہے۔ دونوں سلسلے بہت خوب صورتی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ پلیز ان دونوں محترم لکھاریوں کو مع تصاویر پاکیزہ میں لائیں۔ اشتیاق بڑھتا جارہا ہے۔ عمیرہ احمد اور ناہید سلطانہ اختر جی کو۔ حصارِ محبت، عقیلہ حق نے نہایت چابکدستی سے نازک جذبات کا اظہار کیا۔ بعض جگہوں پر بے بسی پر رونا بھی آگیا۔ لاپتا نے بہت افسردہ کیا۔ دھوپ چھاؤں، نے رُلا کر ہنسایا۔ سچ جن گھرانوں پر قیامت گزرتی ہے وہی جانتے ہیں۔ نبیلہ کے ورد نے بھی الگ تڑپایا۔ اس ماہ کہانیوں کے اندر المناک حقیقتیں پوشیدہ رہیں۔ آبگینے کی رونمائی کی تقریب واقعی حسین رہی ہوگی۔ جہاں ستارے اکٹھے ہوجائیں تو کائنات ازخود مسکرانے لگتی ہے۔ جلترنگ کی کیا بات ہے۔ اتنی افسردگی کے بعد تو مسکرانا بلکہ ہنسنا لازمی ٹھہرا۔ چاندنی اور اٹھکیلیاں کی تعریف نہ کرنا آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مزید ارانداز میں دکھائی دے رہے ہیں۔“ (نوازش)

✍ سلمٰی کنول، جام پور سے۔ ”سب سے پہلے تو پاکیزہ رسالہ کے لیے بہت سی دعائیں بہت اچھا جارہا ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے اس رسالہ کے تمام ناولز بہترین ہوتے ہیں خاص طور سے عکس بہت زبردست ہے۔ آپ کا ڈائجسٹ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ آپی میں آپ کے پاکیزہ کے لیے لکھنا چاہ رہی ہوں اور لکھ بھیجا بھی ہے پڑھ پڑھ کر اتنا ہوگیا ہے کہ لکھنے کو دل کرتا ہے ہمارے اندر کا شوق جاگ اٹھا ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔ سلمٰی پہلے آپ ہمارے ہاں شائع ہونے والے افسانے پڑھیں اس کے بعد ضرور لکھیے گا)

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار اگست کا شمارہ پاکیزہ کا سرورق تو دھنک کے ساتوں رنگوں سے سجا آنکھوں کو بھلا لگا۔ کہانیوں میں روشن جگنو اور جل پریاں، لاپتا، دھوپ چھاؤں، تہی دست، ہم الزام ان کو دیتے تھے، بیٹیاں پھول ہیں اور درد پسند آئیں۔ ہماری دعا ہے منیزہ عادل کے والد، صائمہ تبسم کے بھائی اور مصباح رضا سعید کی چچی کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ کیا دن تھے جب اشعار پر سوالات پر ہم لوگ ملتانی سوہن حلوہ جیتتے تھے۔ اب وہ حافظ ملتانی سوہن حلوے والے نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ کبھی تو پاکیزہ کا رخ کریں گے۔ ہم منتظر ہیں۔“ (موٹی ہو جاؤ گی حلوے کھا کر، تمہاری وجہ سے تو حلوے بند کیے ہیں)

اب اجازت دیجیے، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی و سماوی آفات، تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں اور حاسدین کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے...... آمین، ثم آمین۔

دعاگو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

# پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

## حمدِ باری تعالیٰ

تیرے سوا تو میرے رب اور کوئی خدا نہیں
ساری خدائی ہے تیری تجھ سے کوئی بڑا نہیں
خالقِ ہست و بود تو تیرا ہی اِک وجود ہے
کوئی کہے کہ کوئی اور میں تو یہ مانتا نہیں
جھکتا ہوں تیرے سامنے اور کہیں بھی جھک سکوں
ایسا کبھی کہا نہیں، ایسا کبھی کیا نہیں
خاطی ہوں در سے مغفرت مجھ کو نواز دے خدا
کردے نہ تو معاف جو ایسی کوئی خطا نہیں
کوئی نہیں جو حمد میں حق تیرا کر سکے ادا
ساری ثنا ترے لیے رب کوئی دوسرا نہیں
تیرے لیے مرا قلم اٹھے تو اس پہ ہو کرم
رکھنا مرا سدا بھرم، کچھ بھی مجھے پتا نہیں
محسنِ بے کمال کو، آیا ہے گو ترا خیال
پھر بھی یہی خیال ہے میں نے تو کچھ لکھا نہیں

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

## نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

فراقِ نبیؐ میں تڑپتی ملیں گی
یہ آنکھیں ہمیشہ برستی ملیں گی
چلو چل کے دیکھیں محمدؐ کا روضہ
جہاں رحمتیں ہی برستی ملیں گی
بشر اُن کے جلوؤں کی کیا تاب لائیں
فرشتوں کی نظریں لرزتی ملیں گی
جو اِک بار کرلیں طوافِ مدینہ
تو روتی ہوائیں بھی ہنستی ملیں گی
ذرا دھوپ لگنے دو نظرِ کرم کی
گناہوں کی فصلیں جھلستی ملیں گی
دکان عطا ہے جو چاہو خریدو
یہاں نیکیاں خوب سستی ملیں گی

شاعرہ: بشریٰ فرخ

فائزہ شہزاد، حیات آباد پشاور

## قرآن مجید

1۔ سورۂ یٰسین ہر صبح پڑھنے والا جنتی ہوگا۔

2۔ سورۂ واقعہ پڑھنے والا فقر وفاقے سے دور ہوگا۔

3۔ سورۂ عصر پڑھنے والے کا خاتمہ سلامتی ایمان پر ہوگا۔

4۔ سورۂ اخلاص بکثرت پڑھنے سے حضور ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے۔

5۔ سورۂ قریش پڑھ کر کھانا کھانے سے آدمی نظرِ بد سے محفوظ رہتا ہے۔

6۔ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت عطا کرے گا۔

مرسلہ: قیصر قدیر، ٹورنٹو

## زیادہ گفتگو

حضرت عیسیٰؑ نے ایک مرتبہ فرمایا۔ کثرت سے گفتگو نہ کرو اس سے دلوں میں قساوت آجاتی ہے۔ دلوں میں سختی آجایا کرتی ہے۔ اور فرمایا۔ سخت دل (انسان) اللہ (کی رحمت) سے بہت دور ہوجاتا ہے۔

## زبان کی حفاظت

زبان تیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ”مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں کسی آدمی پر تیر چلاؤں (اسے زخمی

www.paksociety.com

کروں) بہ نسبت اس کے کہ میں اس پر زبان کے تیر چلاؤں (یعنی اپنی زبان سے اسے تکلیف پہنچاؤں) اس لیے کہ کمان کا تیر کبھی خطا بھی ہوسکتا ہے لیکن زبان کا تیر کبھی خطا نہیں ہوتا۔"

مرسلہ: عفت شعیب، پنجاب

## عقل اور خواہش

امام غزالیؒ نے فرمایا جانوروں میں خواہش ہوتی ہے اور عقل نہیں، فرشتوں میں عقل ہوتی ہے اور خواہش نہیں۔

انسان میں عقل اور خواہش دونوں ہوتی ہیں اگر عقل، خواہش پر غالب آجائے تو انسان، فرشتہ اور اگر خواہش، عقل پر غالب آجائے تو انسان جانور۔

مرسلہ: مسز نیلم کامران، شاہد، گوجرانوالہ

## حدیث نبویﷺ

ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ نیکی میں شرم اور برائی میں فخر محسوس کریں گے، اس وقت ہر طرح کی عیاشی میسر ہوگی، ہر گھر میں ناچ گانا ہوگا، لوگ مختلف بیماریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں گے۔ ماں اور نوکرانی میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ لوگ ایک دوسرے سے اونچی عمارتیں بنائیں گے آپﷺ نے فرمایا جب ایسا وقت آئے تو کثرت سے استغفار پڑھنا یہ سب سے مفید عمل ہوگا۔ میری پیاری بہنوں! شاید وہ وقت آگیا ہے جتنا بھی ہوسکے استغفار پڑھا کرو پتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کس وقت سن لے اور آپ کے گناہوں کو معاف فرمادے اور شاید ہماری بخشش کا وسیلہ بھی بن جائے۔

مرسلہ: سدرہ خالد، ڈسٹرک وہاڑی

## ہم سے ملیے

میرا نام انعم حنیف ہے۔ میرا تعلق بھکر سے ہے، ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میری تعلیم بی اے ہے۔ ایل ایچ وی ڈپلومہ ہولڈر ہوں۔ بھکر شہر میں اپنا کلینک چلا رہی ہوں اور جاب بھی کرتی ہوں۔ اتنی مصروفیت میں بھی پاکیزہ سے بھی لگاؤ ہے کیونکہ پاکیزہ ایک ایسا شمارہ ہے جس میں پاکیزہ لوگوں کے پاکیزہ خیالات ہیں مجھے اپنے بہن بھائیوں اور والدین سے محبت ہے کیونکہ میں آج جس مقام پر ہوں والدین کی دعاؤں کی مہربانی ہے۔ مجھے شاہین اختر جیسی مخلص دوست ملی، وہ بہت ہی اچھی ہے اور دوستی نبھانا جانتی ہے۔ میں اپنی اس دوست سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔ مجھے دھوکا، جھوٹ، دغابازی سے سخت نفرت ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ لوگ بلاوجہ ایک دوسرے سے کیسے نفرت کرتے ہیں؟ میں نماز باقاعدگی سے خود بھی پڑھتی ہوں دوسروں کو بھی پڑھنے کی تلقین کرتی ہوں۔ مجھے پنک، گرین، سی گرین کلر پسند ہیں۔ کھانے میں جو کچھ مل جائے کھالیتی ہوں۔ غصہ بہت آتا ہے پر کنٹرول کرلیتی ہوں۔ کسی کا دل نہیں توڑتی۔ بس ایک ہی سوچ رہتی ہے کہ خدا مجھ سے راضی رہے۔ پاکیزہ رسالے کی بہت سی رائٹرز ایسی ہیں جن کے الفاظ خواہ لکھے گئے ہوں یا بولے گئے ہوں۔ میری ذات کے صحرا میں جھاڑیوں کے مانند اُگے ہوئے ہیں اور میں نے ان رائٹرز سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جیسے ...

1۔ عمیرہ احمد نے خدا کا بہترین تصور دیا۔

2۔ انجم انصار نے رشتوں کو ہم آہنگی سے نبھانا سکھایا۔

3۔ اقبال بانو، عالیہ حرا، عطیہ عمر نے محبت کی پاکیزگی اور روحانی ربط کا وسیع ترین تصور دیا۔

4۔ ناہید سلطانہ اختر کے کرداروں کے اندر عجیب سی پُراسراریت اور گہرائی ہے۔ جسے ماپنے کے اندازے ہی لگاتے رہتے ہیں۔ میری اپنے خدا سے دعا یہ ہے کہ اے رب العزت پاکیزہ اور پاکیزہ سے وابستہ ہر فرد ہر رائٹرز سب قارئین کو سلامت رکھنا۔ (آمین)

تحریر: انعم حنیف، بھکر

www.paksociety.com





## قائد اعظم

ایک دفعہ ایک اسکول میں ایک ہندو طالب علم نے قائد اعظم سے سوال کیا۔

"ہم ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھلا کیا فرق ہے۔" قائد کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے اور پانی کا گلاس منگوایا تو ہندو طلبا تالیاں بجانے اور سیٹیاں مارنے لگے کہ آج ہم نے قائد اعظم کو لاجواب کردیا۔ اِک دم قائد اعظم گویا ہوئے اور پانی کا آدھا گلاس پینے کے بعد ایک ہندو لڑکے کو بلایا اور باقی پانی پینے کو کہا۔ لڑکا برہمن (اونچی ذات) کا تھا۔ اس نے پانی پینے سے انکار کردیا پھر آپ نے ایک مسلمان بچے کو پانی پینے کو کہا۔ اس نے فوراً پی لیا۔ آپ نے کہا۔ "صرف اتنا ہی فرق ہے۔" ان کے اس جواب سے سب ہندوؤں کو سانپ سونگھ گیا۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی

## محبت ہم سفر میری

محبت ہم سفر میری اگر ہوتی تو ممکن تھا
تسلسلِ زیست کی خاطر نئے کچھ خواب بُن لیتے
دیا ہوتا کبھی لفظوں کا پیراہن محبت کو
کبھی کچھ خود کہا ہوتا، کبھی کچھ مجھ سے سن لیتے

شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

## سرپرائز

ایک عورت نے نئی سم خریدی اور سوچا کہ اپنے شوہر کو سرپرائز دوں گی۔ شوہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا وہ کچن میں گئی اور شوہر کو نئے نمبر سے کال کی۔ "ہیلو ڈارلنگ......" شوہر نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"پلیز تم مجھے بعد میں کال کرنا، ابھی چڑیل کچن میں ہے۔"

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

## غزل

تم میری پہچان بنو
ایسے عالی شان بنو
ملے مجھے تسکین بہت
دیکھو تم نروان بنو
بنجر دل میں ہریالی ہو
میرے لیے دہقان بنو
بادل بن کر برسوں گی میں
تم کھیت بنو، کھلیان بنو
قسمیں کھاؤں گی میں تمہاری
دین بنو، ایمان بنو
سانس تمہاری میری ہو اِک
تم گر میری جان بنو
یہ گلشن، یہ باغ تمہارا
جذبوں کا گلدان بنو
ہر جانب ہو بات تمہاری
ایک ایسے انسان بنو
کچھ نہیں مانگتی خانم تم سے
رب میرے، نگہبان بنو

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

## پیار کیا ہے؟

☆ پیار وہ ہے جب میری ماں پیشانی پر بوسہ دیتی ہے۔

☆ جب میں دیر سے گھر آتا ہوں تو پاپا میرا انتظار کررہے ہوتے ہیں۔

☆ جب میری بہن میرے کام کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "جب میری شادی ہوجائے گی تو کون کرے گا تمہارے یہ کام۔"

☆ جب میرا بڑا بھائی کہتا ہے۔ "تجھے یہ شرٹ پسند ہے، چل رکھ لے...... میں اور خریدلوں گا۔"

☆ جب میرا دوست کہتا ہے۔ "ٹینشن نہ لے یار! میں ہوں نا تیرے ساتھ۔"

مرسلہ: نائلہ ملک، شہر جتوئی

## دعا

کوئی ضبط نہ جلال دے
مجھے صرف اتنا کمال دے
میں ہر ایک کی صدا بنوں کہ زمانہ میری مثال دے
تیری رحمتوں کا نزول ہو
مجھے مال وزر کی ہوس نہ ہو
مجھے بس تو رزقِ حلال دے
میرے ذہن میں تیری فکر ہو
میری سانسوں میں تیرا ذکر ہو
تیرا خوف میری نجات ہو سبھی خوف دل سے نکال دے
تیری بارگاہ میں اے خدا! میری زور وشب ہے یہی دعا
تو رحیم ہے تو کریم ہے
تو سبھی بلاؤں کو ٹال دے

مرسلہ: قمر شمس الحق جھنگ صدر

## غزل

بیتے ہوئے لمحوں کو پھر یاد کر کے روئے
مزارِ دل پہ آخری چراغ جلا کے روئے
جس طرح بچہ ہو کسی مفلس کا
دل کو جھوٹی باتوں سے بہلا کے روئے
مدتوں بعد ملا جب کوئی مزاج آشنا ہمیں
کچھ اس کی سن کر، کچھ اپنی سنا کے روئے
دکھوں نے اس قدر سہا دیا ہے روح کو
کوئی خوشی بھی ملی تو چھن جانے کے خوف سے روئے
اے دل! سنبھل کے چلنا اس رہ گزر پہ
بہت سوختہ مقدر یہاں، ارماں اپنے جلا کے روئے
آیا ہے موسم خزاں کا لیے خنجر ہاتھوں میں
بچھڑنے سے ذرا پہلے، خشک پتے اشجار سے لپٹ کے روئے
روشنیوں میں عیاں ہونے کے ڈر سے
اندھیروں میں ہم جی بھر کے روئے
تری راتوں کے مقدر میں سحر نہیں
ڈوبنے سے ذرا پہلے، ستارے بتا کے روئے
کوئی غمگسار ہی نہ ملا تری دنیا میں بختاور
ہم اپنے آپ سے ہی گلے مل کے روئے

شاعرہ: بختاور بلوچ

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

## خوش نصیبی

مریض نے بڑی تشویش سے ڈاکٹر سے کہا۔

''مجھے عجیب وغریب مرض لاحق ہوگیا ہے۔ جب بھی میری بیوی بولتی ہے مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ مرض نہیں، نعمتِ خداوندی ہے۔''

مرسلہ: سائرہ احمد، جرمنی

## کوزے میں سمندر

کوئی تجھ کو جان کیا پائے گا
وہ لفظ کہاں سے لائے گا
جو تجھ کو بیان کر پائیں
کوزے میں سمندر بھر پائیں

مرسلہ: تانی چوہدری، آکسفورڈ، یوکے

## تسلی

ایک صاحب ایک ماہ کے لیے بیرونِ ملک جارہے تھے۔ ائرپورٹ جانے کے لیے وہ گھر سے نکلے تو کچھ لیٹ ہوچکے تھے۔ راستے میں گھڑی دیکھتے ہوئے وہ اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہوئے۔

''گاڑی تیز چلاؤ...... کہیں میری فلائٹ نہ نکل جائے۔'' ڈرائیور جو پہلے ہی گاڑی تیز چلا رہا تھا فوراً بولا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاحب، میں آپ کی فلائٹ نکلنے ہی نہیں دوں گا کیونکہ بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ اگر آپ کی فلائٹ نکل گئی تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گی۔''

مرسلہ: صبا نور، لیہ

# جلترنگ

انجم انصار

## چلو...... چلو......

''سنو...... وہ سلمٰی بہت اچھی لڑکی ہے، تم اپنے بیٹے سے اس کو بیاہ لو بہت سکون سے رہو گی۔''

''ہاں، بہو لانے کے بعد بھی کون سا سکون ہے۔''

''مگر کیسے سکون ملے گا۔ پہلی دو بہوؤں نے تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔''

''سلمٰی بہت اچھی ہے، آپ ڈانٹیں، وہ مسکرائے گی، آپ اسے گالیاں دیں، وہ مسکرائے گی، آپ اس کے گھر والوں کو طعنے دیں، وہ مسکرائے گی، آپ آرام کریں وہ کام کرے گی۔''

''مگر کیوں بھئی......؟ وہ اتنی اچھی کیوں ہے؟ اس میں اتنی برداشت کیسے آگئی، وہ دنیا کی بہوؤں سے مختلف کیسے ہے؟''

''بات صرف اتنی سی ہے کہ اس کے ہاتھ میں دماغ کی لکیر ہی نہیں ہے، اسے کچھ بھی کہہ دو، اسے پتا ہی نہیں چلتا، اور فی زمانہ ایسی بہو کسی کو ملے تو...... وہ ساس قسمت والی ہوتا......! اس لیے چلو چلو...... گدو بندر چلو......''

## جلتی ہے نا!

تاجدار بھائی جب بھی ملتے بڑی محبت سے کہتے۔ ''چھوتم میرے گھر کیوں نہیں آتیں؟''

''بھائی جان...... ابھی آئی تو تھی۔'' میں جز بز ہو کر کہتی جب سے بڑے بھیا علیحدہ گھر میں شفٹ ہوئے تھے میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ ان کے گھر جاؤں۔ اماں کے گھر جاتی تو ان کو خلاؤں میں تکتا دیکھ کر مجھے پتا چل جاتا کہ وہ بھیا کے جانے پر اداس ہیں۔

''اچھے گھر میں جانا ہر ایک کا حق ہوتا ہے کہ لوگ کماتے کس لیے ہیں، اچھا رہنے سہنے کے لیے اگر تاجدار بھی یہاں سے نکل کر بڑی سی کوٹھی میں چلا گیا ہے تو کیا برائی ہے۔'' وہ ہم چاروں بہنوں کے سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے تقریریں کیا کرتیں۔ امی جیسا حوصلہ میں نے بہت کم خواتین میں دیکھا تھا۔ انہوں نے از خود کہنا شروع کر دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں الرجی ہوگئی جس کی وجہ سے آنکھوں سے اکثر پانی بہتا رہتا ہے۔ یہ بات تو ہمیں بعد میں پتا چلی کہ وہ اپنے آنسوؤں کو الرجی کا نام دیتی تھیں۔ تاجدار بھائی کی کوٹھی میں ہم بہنیں جب بھی گئیں بھیا بے حد خوش ہوا کرتے ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ہم بہنوں کو کیا کچھ کھلا دیں مگر بھابی کے چہرے کے زاویے ہمیشہ بگڑے بگڑے سے رہتے۔ وہ کھانا تو ضرور کھلاتیں مگر ہمیشہ اپنی ان بیماریوں کی تفصیل سنانا ضروری سمجھتیں جو کسی کو دکھائی نہیں دیا کرتی تھیں۔

''آج تو صبح سے میرا سر چکرا رہا ہے کھانا پکا تو لیا مگر کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ابھی تو آئی ہوں میں ڈاکٹر کو دکھا کر وہ تو کہہ رہی تھیں کہ جا کر بیڈ ریسٹ کیجیے گا کسی سے بات تک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' تب میں نے ہنس کر کہا، اللہ میری ایسی قسمت کہاں۔

''کس ڈاکٹر کو دکھایا تھا آپ نے......؟'' ایک بار ان کا ہمیشہ کا یہی قصہ سن کر میں نے پوچھا۔

''محلے میں خالہ کے گھر گئی تھی ان کے چاروں بچے ڈاکٹر ہیں تو خالہ بھی بس ڈاکٹروں ہی کی طرح باتیں کرتی ہیں۔ تجربے کار جو ہیں تو اُن کی تشخیص بھی بالکل صحیح ہوتی ہے۔ اب کل پڑوسن کے پیر کی ہڈی میں انہوں نے برین ہیمبرج بتایا...... اور واقعی بالکل صحیح بتایا تھا، ان کی ٹانگ اور سر میں ایک ساتھ درد ہو رہا تھا اور کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا، محلے کا ڈاکٹر بھی



www.paksociety.com

مان گیا تھا۔ آج تو انہوں نے میری شکل دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ نازو اس وقت تمہارا بلڈ پریشر بھی ہائی ہے، ڈپریشن بھی ہے اور ہلکے ہلکے ہارٹ اٹیک بھی چل رہے ہیں۔ تمہارا اس وقت دل چاہ رہا ہے نا کہ چیخ چیخ کر روؤ، خوب آنسو بہاؤ اور واقعی ایسا سب مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میں کتنی بیمار ہوں۔" بڑی آپا کھانا کھا کر بقیہ بچا ہوا کھانا تھیلیوں میں باندھ کر اپنی باسکٹ میں رکھ رہی تھیں کہ نازو بھابی نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

بھیں...... بھیں اور ہم چاروں بہنیں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے منہ چھپا کر ہنس رہے تھے۔

"اداکارہ بھابی کی ادائیں شروع ہو گئیں ہماری بھابی...... اپنی سب نندوں سے جلتی ہیں ناں۔"

## ہمت

جب گھر میں کار نہیں آئی تھی ہم صرف کار کی ہی افادیت جانتے تھے اچھی اور بری کار کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے کہ نئی نکوری بڑی سی کار کو اچھا کہتے ہیں اور کم قیمت کی ڈینگ ماری کار کو بری کار کا نام دیا جاتا ہے۔ ہماری کار پرانے ماڈل کی تو ضرور تھی جو کبھی کبھار دھکا اسٹارٹ بھی ہو جاتی تھی مگر ہم سب لوگ بڑے مزے سے اس میں گھوما کرتے تھے۔

میاں جی کو دو گلی چھوڑ کر دہی نان لینے بھی جانا پڑتا تو پیدل جانے کے بجائے کار میں ہی جاتے تھے۔ جیٹھ کی کار قدرے نئی تھی اس لیے انہوں نے ہماری کار کو گدھا گاڑی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ سیمنٹ کی بوریاں، بلاکس منگوانے کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنی کار کے بجائے ہماری کار کو استعمال کرتے۔ ایک مرتبہ دبے دبے لفظوں میں، میں نے میاں جی سے شکایت بھی کی۔ "یہ بڑے بھائی اپنی کار کی تو خوب حفاظت کرتے ہیں اور ہماری کار کو گدھا گاڑی سمجھتے ہیں۔"

"رضیہ تم بھی پاگل ہو، بڑے بھائی کی کار نئی تو ضرور ہے مگر بہت کمزور ہے اس میں زیادہ لوگ بھی بیٹھ جائیں تو وہ پچک جائے گی اور ہماری گاڑی بہت مضبوط ہے۔ یہ بلاکس تو کیا مکان اٹھا کر لا سکتی ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ کسی تقریب میں جانا ہوتا تو ہماری گاڑی کی ڈگی تک میں لوگ ٹھنس کر بیٹھتے...... اور میاں جی اس طرح سے گاڑی چلاتے جیسے وہ سڑک پر بحری جہاز چلا رہے ہوں جو مسافروں کی بڑی تعداد لے کر بحیرۂ عرب پار کر رہا ہو، پھر یوں ہوا کہ میری نازو آپا لاہور سے کراچی شفٹ ہو گئیں، ان کی بڑی سی خوب صورت گاڑی دیکھی تو میرے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا...... نازو آپا مجھ سے بہ مشکل سال بھر بڑی تھیں مگر میری گاڑی کا ان کی کار کے مقابلے میں پندرہ سال یا اس سے بھی زیادہ پرانا ماڈل تھا۔ ان کی گاڑی کی قیمت بیس لاکھ روپے تھی جبکہ میاں جی نے یہ گاڑی اسی ہزار کی بھی کسی سے قسطوں میں خریدی تھی۔ جس کے دروازے خراب تھے شیشے چڑھتے نہیں تھے۔ ہارن بجنا شروع ہو جاتا تو رکتا نہیں تھا ورنہ وہ بجتا نہیں تھا۔ سیٹیں اس قدر بیٹھی ہوئی تھیں گھر کے کشن رکھ کر مہمانوں کو بٹھاتے تھے ورنہ بڑی چچی تو گاڑی سے اترتے وقت کراہ رہی تھیں...... بقول ان کے ان کے کولھے کی ہڈی ہماری کار میں بیٹھنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ خیر وہ سدا کی جھوٹی تھیں ہم نے نہ ان کی بات کا یقین کیا تھا اور نہ ہی ان کو اسپتال میں دیکھنے کے لیے گئے جب ان کا کوئی اوندھا مارا آپریشن ہوا تھا۔

بچوں کو اسکول چھوڑنے، لانے...... شاپنگ کرنے یا ٹہلنے کا بھی کوئی پروگرام ہوتا تو ہم اپنی گاڑی میں ٹھسے سے بیٹھ کر جاتے...... مہینے میں ایک مرتبہ تیسرے درجے کے ہوٹل میں جا کر کھانا ضرور کھایا کرتے تھے، اب یہ کھانا پینا گاڑی میں بیٹھ کر ہونے لگا۔ ایک مرتبہ نازو آپا رہنے کے لیے میرے گھر آئیں تو جاتے وقت وہ بڑی مسرور تھیں۔

"رضیہ تم بڑی لکی ہو، کیسی شاداں و فرحاں زندگی گزار رہی ہو۔"

"مگر نازو آپا ہماری گاڑی تو خاصی کھٹکی ہوئی سی ہے۔"

"پاگل ہو تم...... گاڑی کا مطلب ہے کہ وہ چلتی رہے...... اور تم خوب مزے سے جب دل چاہے چلی جاتی ہو اور کیا چاہیے...... سچ کہوں۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولیں۔

"جی کہیے......" میں نے بھی اپنے کان لگا دیے۔

"تمہاری گاڑی مجھے اپنی گاڑی سے زیادہ اچھی لگتی۔"

"یہ بات میرا دل بڑھانے کے لیے کہہ رہی ہیں ناں؟" میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا۔

"جب تک کوئی چیز برت نہ لو اس وقت تک کوئی بات بھی نہیں کہی جا سکتی......" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں اور پھر مجھے تو نہیں میری بڑی لڑکی کو ان کے ہاں جا کر ان کی گاڑی کے بارے میں خاصی معلومات ہو گئیں۔

شبو چار دن کے لیے نازو خالہ کے ہاں گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ موسم سرما کی پوری چھٹیاں ہی ان کے ہاں گزار کے آئے گی...... مگر وہ تو دوسرے دن ہی آ گئی اور آ کر اس نے بتایا۔

"خالہ کی گاڑی میں بیٹھو تو ایسا لگتا ہے کہ وہاں مارشل لا لگ گیا ہو۔ کوئی بچہ گاڑی کا شیشہ نہیں کھول سکتا۔ اتنی مہنگی گاڑی ہے شیشے بار بار کھولنے اور بند کرنے سے خراب ہو جائیں گے۔ سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر نہیں بیٹھ سکتے...... بالوں کا تیل سیٹ کور خراب کر دے گا...... پیچھے مڑ کر بات نہیں کر سکتے۔"

اور سب سے بڑی بات ہماری گاڑی میں بیٹھ کر جو کھانے پینے کی آزادی تھی، ان کے ہاں بالکل نہیں تھی...... ان کے بچے پاپ کارن اور چپس بھی اس میں بیٹھ کر نہیں کھا سکتے۔

ایک ہماری گاڑی تھی کہ کباب پراٹھا کھا کھا کر ہاتھ سیٹوں سے پونچھتے ہوئے ہمارے مہمان گاڑی سے اترا کرتے تھے۔

"امی، خالہ کی گاڑی میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے کسی خلائی گاڑی میں بیٹھ گئے ہوں۔ خالو کی ڈانٹ بے وجہ چل رہی تھی اور سب اس میں خوفزدہ سے بیٹھے تھے۔ وہ بے چاری خالہ کو یہاں تک ڈانٹ رہے تھے کہ اپنی ٹانگیں موڑ کر کیوں بیٹھی ہو...... ایسے تو لوگ بس میں بیٹھتے ہیں، تمہیں ابھی تک گاڑی میں بیٹھنے کے آداب نہیں آئے۔ تمہارے خاندان میں کسی کے پاس اتنی عمدہ گاڑی ہوتی تو تمہیں کوئی تمیز و تہذیب آتی......" تب مجھے اپنے بہنوئی پر بہت غصہ آیا اور اسی وقت ان کو فون کر کے کہا۔

"بھائی صاحب! جس طرح ہمارے ملک میں فنکاروں کے لیے کوئی انسٹی ٹیوٹ نہیں ہے جس میں وہ فن کی باریکیاں سیکھ سکیں اسی طرح ہمارے ملک میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو شوہروں کی تربیت کر سکے۔ وہ بیوی کی عزت کو آنی جانی شے سمجھے ہوئے ہیں کہ کبھی آ گئی اور کبھی چلی گئی جو شوہر اپنی بیوی کے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے پر باتیں بناتا ہو تو دیگر امور میں وہ کتنا ظالم ہوگا...... یہ وہ خود نہ سوچے مگر دوسرے ضرور سوچتے ہیں۔"

"رضیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......" وہ تو میری بات بغور سننے کے بجائے بار بار کہہ رہے تھے اور میں ریسیور کریڈل پر پٹخ کر دھوم دھام سے رو رہی تھی...... کہ میری نازو باجی پر کیسے کیسے ظلم ہو رہے تھے اور وہ بے چاری کسی کو دو لفظ بتانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔

## میں نہ ہاروں گی

"یہ مرغی تو چکھیں، بشریٰ نے کیسی اچھی روسٹ کی ہے۔" فرحت آپا کی توجہ ان کی سمدھن دلا رہی تھیں۔

"بشریٰ کے ہاتھ کے پکے میٹھے...... آہا...... اس کی تو ہمارے پورے خاندان میں دھوم ہے۔" بشریٰ کی خالہ نے کہا۔ ان کے لہجے تک میں ذائقہ بھرا تھا۔ اور فرحت آپا کے من میں سکون سا اتر آیا کہ ان



www.paksociety.com

کے گھر میں آنے والی بہو کو ہر چیز پکانی آتی تھی۔ بیٹے کی منگنی کے بعد وہ جب جب سمدھیانے گئیں، اپنی ہونے والی بہو کے ہاتھ کی لذیذ چیزیں کھا کر انہیں حیران کُن مسرت ہوتی تھی...... یوں بھی ان کے بیٹے کی واحد شرط بھی یہی تھی کہ اس کی شادی جس لڑکی سے کی جائے اس کو اچھا کھانا پکانا آتا ہو۔ اور یہ اچھی بات تھی کہ بشریٰ آل راؤنڈر قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے میکے والوں کا یہی کہنا تھا کہ وہ گھر داری میں خوب طاق ہے اور جب بشریٰ بیاہ کر سسرال آئی...... تو فرحت آپا کو جلد اندازہ ہو گیا کہ بشریٰ کو چائے تک بنانی اور اسے پیش کرنی بھی نہیں آتی تھی۔ روٹی پکانے کھڑی ہوتی تو...... ایسے نقشے بناتی کہ ان کا بیٹا...... چپ چاپ بازار سے نان لے کر آتا۔

فرحت آپا نے ایک بار اپنی سمدھن سے شکایتاً کہا بھی کہ آپ نے اپنی بیٹی کو باورچی خانے کا کوئی کام نہیں سکھایا اس پر بشریٰ کی والدہ جاہل سے لہجے میں بولیں۔

”آپ کا باورچی خانہ جس طرح کا غیر آرام دہ ہے وہاں تو کسی اچھا پکانے والے کا بھی دل پکانے کو نہ چاہے۔ کس قدر تو آپ کے باورچی خانے میں گرمی ہے۔“ ان کا دل چاہا کہ وہ پوچھیں کہ آپ کے گھر کے باورچی خانے میں کیا برف باری ہوتی ہے مگر وہ چپ رہیں کہ جاہل کے منہ لگنا انہیں گوارا نہیں تھا۔

وہ 29 نومبر کی دوپہر تھی اس دن صبح سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی کہ ان کی بیٹی نے بتایا۔ ”آج بشریٰ بھابی کی امی اور بہنیں رات کے کھانے پر آرہے ہیں اور بشریٰ بھابی صبح سے ایک پتیلے میں کھیر پکا رہی ہیں۔“ فرحت آپا کو غصہ تو بہت آیا کہ بہو نے دعوت کے بارے میں ان سے مشورہ کرنا تو کجا ان کو اطلاع دینی بھی ضروری نہیں سمجھی۔

”پتا نہیں کیا الٹا سیدھا بنا رہی ہو گی۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔ ”میری بلا سے جو دل چاہے کرے۔“ تھوڑی دیر بعد بیٹی نے آکر بتایا۔

”بھابی اپنے کمرے میں سو چکی ہیں اور کھیر خوب جل رہی ہے۔“ وہ بھاگم بھاگ باورچی خانے میں گئیں۔ کھیر کو چکھا اس قدر جلے دودھ کی کڑواہٹ محسوس ہوئی...... انہوں نے فوراً چولھا بند کر دیا مگر دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی کہ اچھا ہوا کھیر جل گئی۔

شام کو چھوٹا بیٹا آیا...... تو پہلی بات انہوں نے اس سے یہی کہی۔ ”آج کھیر جل گئی ہے۔“

بیٹے نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔ ”امی آپ مجھے ایسے بتا رہی ہیں جیسے یہ کوئی اچھی بات ہو۔“

میاں دفتر سے آئے تو فرحت آپا نے بڑے لہک کر بتایا۔ ”آج خوب مزے سے کھیر جل گئی۔“

میاں نے انہیں یوں دیکھا جیسے صدمے سے ان کا دماغ چل گیا ہو اور فرحت آپا دل ہی دل میں مسکراتی رہیں۔ رات کو مہمان آئے، کھانے کے بعد کیک کھایا گیا، پھل کھائے گئے، ابھی بشریٰ چائے بنانے جا رہی تھی تھی۔ فرحت آپا ایک بڑے سے پیالے میں کھیر لے کر آگئیں اور بولیں۔ ”آپ لوگوں کے لیے یہ کھیر بڑے پیار سے بشریٰ نے بنائی ہے۔ بے چاری بچی نے ساری دوپہر اس کھیر کو پکانے میں صرف کر دی۔ آپ لوگ اسے کھائیں تو سہی......“ سمدھن جی نے پیالا بھر کر کھیر نکالی پہلے چمچے میں ہی ان کے چہرے کے جغرافیہ بدلا اور پھر وہ سنبھل کر بولیں۔

”ارے واہ...... کس قدر مزے کی کھیر بنی ہے، بڑے بڑے پکوان والوں کی کھیر میں ایک عجیب سی لذت اور مہک آجاتی ہے، ہماری بشریٰ نے تو بڑے بڑے باورچیوں کو چونا لگا دیا۔ ان سے بھی اچھی کھیر پکا ڈالی۔ کس قدر لذیذ کھیر بنی ہے اس کے آگے تو ربڑی بھی ہیچ ہے۔“

اب فرحت آپا اپنی شاطر سمدھن کی تقریر سن رہی تھیں اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں جو کسی میدان میں ہارنا نہیں چاہتی تھیں۔

☆☆☆



www.paksociety.com

# میرا انتخاب

آمنہ حماد

محبت ایک عزم ہے جو ہماری زندگی کو ماضی اور مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ عزم ٹوٹنے لگتا ہے۔ کچھ یہی تاثر فانی بدایوانی کی غزل میں نمایاں ہے اس کا انتخاب نیلوفر نے اسلام آباد سے کیا ہے۔

## غزل

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا
دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا
آ کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالۂ خوشگوار تھا نہ رہا
ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امیدوار تھا نہ رہا
آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا نہ رہا
کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا نہ رہا
اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا نہ رہا
موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا
مہرباں یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

امید ایک ایسی چھاؤں ہے جو اپنے دامن میں انسان کو پناہ دے کر مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔ امید کی ایسی ہی کرن سرشار صدیقی کی دل دریا میں نظر آرہی ہے اسے تہذیب فاطمہ نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

## دل دریا

لوگوں نے کہا
اس در سے کبھی
کوئی نا امید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پہ گردِ ملال لیے
اِک پُرامید خیال لیے
اِک خالی دستِ سوال لیے
جب قافلہ اس در پہ پہنچا
میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
یہ گھر تو میرا اپنا تھا......!

الفاظ خیالات اور جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کبھی ان کے استعمال سے دل زخمی ہو جاتا ہے اور کبھی زندگی انہی الفاظ کے سرور میں گزر جاتی ہے افتخار عارف محبت کی ایک نظم میں کچھ ایسا ہی کہہ رہے ہیں جسے میمونہ عزیز نے اسلام آباد سے منتخب کیا ہے۔

## محبت کی ایک نظم

مری زندگی میں بس اِک کتاب ہے اِک چراغ ہے
ایک خواب ہے اور تم ہو
یہ کتاب و خواب کے درمیاں جو منزلیں ہیں
میں چاہتا تھا
تمہارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اثاثۂ زندگی ہے اسی کو زادِ سفر کروں
کسی اور سمت نظر کروں تو مری دعا میں اثر نہ ہو
مرے دل کے جادۂ خوش خبر پہ
بجز تمہارے کسی کا گزر نہ ہو
مگر اس طرح کہ تمہیں بھی اس کی خبر نہ ہو
اسی احتیاط میں ساری عمر گزر گئی
وہ جو آرزو تھی کتاب و خواب کے ساتھ
تم بھی شریک ہو وہی مر گئی
اسی کشمکش نے کئی سوال اٹھائے ہیں
وہ سوال جن کا جواب میری کتاب میں نہ خواب میں
مرے دل کے جادۂ خوش خبر کے رفیق
تم ہی بتاؤ پھر
کہ یہ کاروبارِ حیات کس کے حساب میں
مری زندگی میں بس اِک کتاب ہے اِک چراغ ہے
ایک خواب ہے اور تم ہو

حوادث کی دھند میں جب آگے راستہ نہیں ملتا تو ہر شخص اپنے محبوب کے سہارے کا متلاشی ہوتا ہے لیکن اگر وہ سہارا بھی میسر نہ ہو تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی تلاش ہمیں اعتبار ساجد کی غزل میں نظر آتی ہے جس کا انتخاب ارم عقیل نے حیدر آباد سے کیا ہے۔

## غزل

مجھے حوصلہ تو دیتے جو میرے شریکِ غم ہیں
میں بھگت رہا ہوں تنہا جو عذاب بیش و کم ہیں
کوئی پھول جیسی تتلی نہ ستارے جیسا جگنو
ترے بعد بس اندھیرے مرے ساتھ ہر قدم ہیں
مجھے چھوڑنے سے پہلے یہ جتا دیا تھا اس نے
یہ کٹھن رہِ سفر ہے کئی اس میں پیچ و خم ہیں
جو بچا رہے ہیں شعلوں سے گلاب اس چمن کے
وہی لوگ ہیں معزز وہی ہاتھ محترم ہیں
مرا کمرا بارشوں میں کبھی بھیگتا نہیں ہے
مری ادھ کھلی بیاضیں مرے آنسوؤں سے نم ہیں
وہ تو خود ہے کرچی کرچی مرے رنج کیا سمیٹے
مرے دکھ کو کیسے سمجھے اسے اپنے لاکھ غم ہیں

چاہت جب کسک بن جائے تو خوابوں اور خواہشوں کی یہ رہ گزر پُر خار راہوں میں تبدیل ہو جاتی ہے جاوید اختر کے کلام میں بھی یہی رنگ نظر آ رہا ہے اسے سعدیہ خاور نے اکاڑہ سے منتخب کیا ہے۔

## دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
کمبخت!
بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں
وہ اِک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

شکستِ اعتمادِ ذات ایسا احساس ہے کہ اس سے دوچار ہو کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا...... محبت میں ایسے مواقع آتے ہیں...... جو انسان کو توڑ دیتے ہیں اسی احساس کی طرف متوجہ کرتی پروین شاکر کی غزل جسے عظمٰی نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

## غزل

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو یہ وہ درخت نہ تھا
وہ خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پچھلے پہر
کہ اس کے بعد مقدر میں تاج و تخت نہ تھا
ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا
مرے لیے تو وہ خنجر بھی پھول بن کے اٹھا
زبان سخت تھی ، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا
اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دیا جلا تو ہوا کوئی ساز و رخت نہ تھا
گئے وہ دن کہ مجھی تک تھا مرا دکھ محدود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ تھا

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر رنگ اپنی کشش کھو دیتا ہے اور پرانا ہو جاتا ہے لیکن...... وہ تصویر جو سوزِ دل سے بنائی اور خونِ جگر سے کھینچی گئی ہو کبھی فنا نہیں ہوتی...... رانا سبحان اشرف اپنی اس نظم میں بھی بدلتے موسموں کے ساتھ نئی روشنیوں کے ابھرنے کا ذکر کر رہے ہیں جسے ثمانہ نے اوکاڑہ سے منتخب کیا ہے۔

## بہت سے لوگ ہیں ایسے

بہت سے لوگ ہیں ایسے
جو میرے ساتھ رہتے ہیں
وہ جن کی مسکراہٹ
میرے دل کو زندہ رکھتی ہے
میرا اندر کہیں سے ٹوٹ کر
جب چور ہو جائے
تو ایسے میں انہی لوگوں کی چاہت
تھام لیتی ہے
تو میں محسوس کرتا ہوں
میرا اندر بہت ہی دور تک
روشن ہی روشن ہے
محبت ان کی میرے دل میں
ایسا رنگ بھرتی ہے
کہ جیسے بارشوں کے بعد
ست رنگا کوئی منظر
کبھی ہم دیکھتے ہیں
آسماں کی گود میں آکر
فضا میں ایک دلکش
رنگ بھر کر چھوڑ جاتا ہے
وہ ایسے لوگ ہیں اشرف
جنہیں میں دیکھتا ہوں جب
تو پھر سے زندہ ہو جاتا ہوں
کہ ان کی مسکراہٹ
میرے دل کو زندہ رکھتی ہے
بہت سے لوگ ہیں ایسے
جو مجھ کو زندہ رکھتے ہیں

حسن و عشق کے معاملات میں پرانی داستانوں کی فضا ہے جہاں شاعر کا شعور تھوڑی دیر کو سکون حاصل کرنے کے لیے ٹھہر جاتا ہے...... یہ پُر سکون لمحے تخلیق کے لیے ضروری ہیں۔ انہی لمحوں میں تخلیقِ فن اور تخلیقِ عمل سے متعلق کچھ نیا تخلیق ہوتا ہے جو ایک لطیف سمت کا اضافہ کر دیتا ہے۔ باقی احمد پوری کی اس غزل کو مہرین نے اسلام آباد سے منتخب کیا ہے۔

## غزل

ہمیں کیا ، کیا بنانا تھا مگر کیا ، کیا بناتے ہیں
کبھی دنیا بناتے ہیں کبھی عقبیٰ بناتے ہیں
یہ شاید اس طرح ہوگا وہ شاید اس طرح ہوگا
اسے ایسا بناتے ہیں اسے ویسا بناتے ہیں
تعین کیوں کرے کوئی ہماری رہگزاروں کا
کہ ہم دریا ہیں اور دریا تو خود رستہ بناتے ہیں
یہی اِک دل سلامت رہ گیا ہے یارو جس کو ہم
کبھی پتھر بناتے ہیں کبھی شیشہ بناتے ہیں
خدا کو ماننے والوں کی بستی اور ہی ہوگی
یہاں تو درہم و دینار کو آقا بناتے ہیں
ہمیں اس کے علاوہ اور کچھ آتا نہیں باقی
تیری آنکھیں بناتے ہیں تیرا چہرہ بناتے ہیں



www.paksociety.com

# سندیسے

## پاکیزہ بہنیں

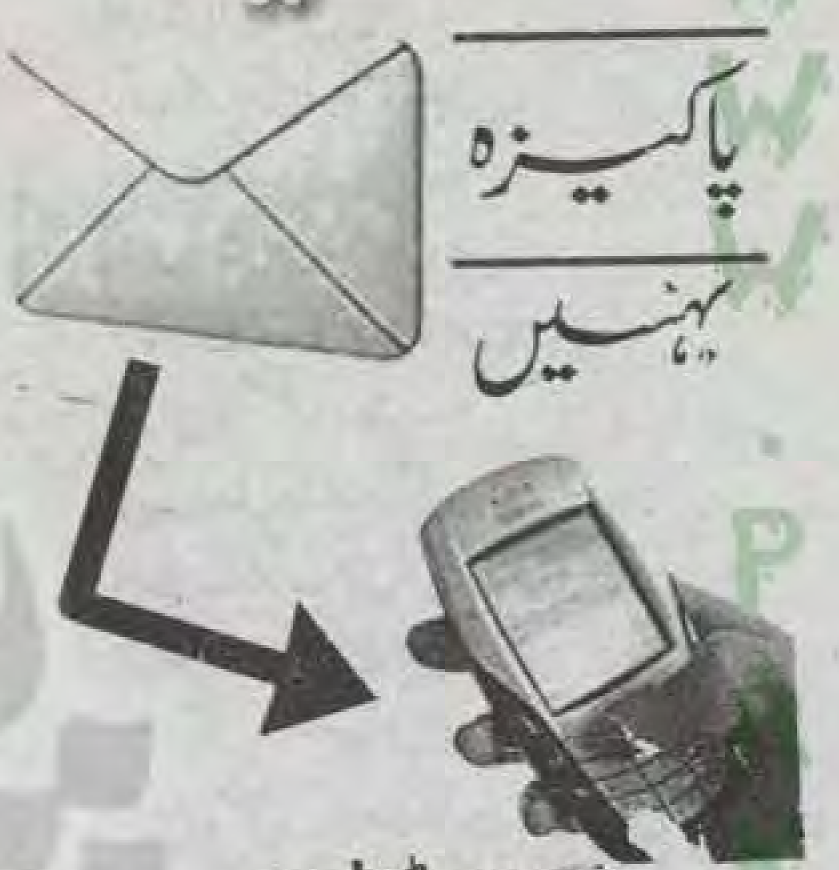

## عیدی بڑھا دیں

سنیے!
میری عیدی بڑھا دیں
مجھے بہت شرم آتی ہے
جب میں اپنے میکے والوں کو
یہ بتاتی ہوں کہ انہوں نے
دی ہے عیدی صرف 250 روپے

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

## ہمیں بھی

عید پر جب کوئی نہ آتے...... تو کیا کریں دل بھی چپ سا ہو جائے تو کیا کریں سویاں ہر ایک کو کھلا کے بھی مزہ نہ آئے تو یہی خیال آتا ہے کہ ہمیں بھی کہیں جانا چاہیے۔

مرسلہ: صبا نور، لیہ

## پھول

اچھی بات کہنا نیکی بھی ہے اور صدقۂ جاریہ بھی تو کیوں نہ ہم نیکی کے پھول ایک دوسرے کو دیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کو گلزار بنا دیں۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

## جاناں

تجھ سے وعدہ تو کیا تھا کہ اداس نہ ہوں گے لیکن جاناں معاف کرنا ہم نے اپنی ہتھیلیوں کو حنا کے رنگ سے سونا رکھا، آنکھوں میں کاجل کی جگہ نمی کو دے دی کھنکھناتی چوڑیاں، اداس سی پائل، کچھ کہتے کانوں کے جھمکے، تاروں بھرا سسکتا آنچل، مایوس سی بندیا، مہکتے پر گھبرائے سے پھولوں کے گجرے ہم نے کسی کی بھی نہیں سنی۔ سب کو لپیٹ کر الماری میں بند کر دیا اور کہا۔

جاناں تو لوٹ کر آئے گا
تو ہی عید منائیں گے

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

## بجلی کی یاد میں

کچھ عرصے بعد پاکستانی قوم بجلی کی یاد میں بچوں کے نام رکھا کرے گی۔ لڑکوں کے نام، سرکٹ شاہ، میٹر خان، فیض البلب، حاجی تاربٹ، چوہدری ٹرانسفارمر، مولانا ڈیپ فریزر، شیخ اسٹیبلائزر۔

لڑکیوں کے نام۔ فریج النسا ، استری بیگم، وائرنگ خانم، ٹرپ جی، واپڈا پروین، مس بیٹری لو۔

مرسلہ: ایشل شادیاں، گولارچی

## رم جھم ساون برسے رے

رم جھم ساون برسے رے
جیا ملن کو ترسے رے
بیٹھی ہوں آس لگائے
طرح طرح کے پکوان پکائے
ساجن پھر بھی گھر نہ آئے
بھاپ اڑاتی کافی ہے
گرما گرم پکوڑے ہیں
گرما گرم پکوڑے ہیں
ساجن جلدی آجاؤ
مل کر دونوں کھائیں گے
ساون خوب منائیں گے

شاعرہ: فریدہ فری، یوسف زئی، لاہور

## کون

چپکے سے اٹھائے ایڑیوں کو
ہولے سے ورق الٹ کر دیکھوں
اس وقت میں جو ہے آنے والا
جان لیوا مسافتوں کے رستوں......
پر کون کہاں تلک چلے گا

شاعرہ: صائمہ اسما بدر

مرسلہ: ڈاکٹر کومل ستار، جام شورو

## دوستی

ایک بچے کا دوست سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ وہ روز سمندر کنارے جاتا اور کھڑا ہو جاتا۔ لہریں آتیں اور اس کے پاؤں بھگو کر چلی جاتیں اور وہ روتے روتے سمندر سے کہتا۔

"کتنے بھی پاؤں چھولو پر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" دوستی بھی ایک زندگی ہے اور دوستی ایک حسین رشتہ۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، بفرزون کراچی

## ہنسانے والے

تو نے دیکھا ہے، صحرا میں جھلتا ہوا پیڑ
اس طرح جیتے ہیں، وفاؤں کو نبھانے والے
کوئی دیکھے تو سہی ان کی صبحوں کو محسن
کتنا روتے ہیں، لوگوں کو ہنسانے والے

مرسلہ: فرزانہ تسنیم، سیالکوٹ

## محبت

نگاہیں بولتی ہیں بے تحاشا
محبت پاگلوں کی گفتگو ہے

شاعرہ: نوشی، بدر مرجان

## اے بنت حوا

اے بنت حوا!
برسا برس سے
کانچ کے رستوں پر
کیوں محو رقص ہے؟
کیوں نہیں ہوتے
ترے پاؤں فگار
کیوں سہتی ہے
روز و شب یہ آزار
کیوں نہیں تھکتی
تیرے لبوں سے آہ!
کیوں نہیں چھوڑتی
کانٹوں بھری یہ راہ

شاعرہ۔ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی

## رضا

دعائیں مانگتے دیکھا جو بیگم کو مصلے پر
ہوئی حیرت مجھے اور پوچھ بیٹھا ماجرا کیا ہے
وہ بولیں کچھ نہیں بس یہ دعا کی تھی میرا شوہر
یہ پوچھے رات دن مجھ سے بتا تیری رضا کیا ہے

مرسلہ: جمیلہ جمالی، بلوچستان

## کب تک

کب تک اٹھائیں گے جنازے ہم لوگ
روز ہی مناتے ہیں ہم مل کر یوم سوگ
ایسا لگ گیا ہے کراچی کو تو روگ
دعا ہے تمام قومیتوں کا ہو جائے سنجوگ

مرسلہ: شمائلہ سہیل جاوید، کراچی

## یہ دل

ہر چند کہ حالات موافق نہیں پھر بھی
دل تیری طرف داری میں سفاک بہت ہے

شاعرہ: نوشین اقبال، گاؤں بدر مرجان

☆☆☆



www.paksociety.com

# میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

ماریہ دانش...... چکوال
شادابیاں ہیں اور کہیں آنکھوں میں اشک ہیں
لایا ہے چاند عید کا کتنے عجیب رنگ
☆ شاہینہ ریاض...... جہلم
میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے
☆ سائرہ خان...... گجرات
کاش اس عید سعید کے حسین لمحوں میں
میری ذاتِ گم گشتہ بھی تجھے یاد آئے
☆ غزالہ باجوہ...... راول پنڈی
ہلالِ عید کو دیکھو تو روک لو آنسو
جو ہو سکے تو محبت کا احترام کرو
☆ سعدیہ خاور...... اوکاڑہ
جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں
پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رُت آئی ہے
پھر سے دلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں
☆ فائزہ شاہ...... ساہیوال
جب بھی ٹھہرا ہے ذرا آکے تیری دید کا رنگ
دور تک پھیل گیا ہے میری جاں عید کا رنگ
☆ حنا عزیز...... کراچی
میرے دل کی راکھ کرید مت، اسے مسکرا کر ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر چراغ ہیں کہیں ہاتھ تیرا جلا نہ دے
ذرا دیکھ چاند کی پتیوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
ترا نام لکھا ہے ریت پہ کوئی لہر آ کر مٹا نہ دے
☆ عنبر وسیم...... گوجرانوالہ
نظر جو چاند پہ کی دل میں مسکرائے تم
دعا کو ہاتھ اٹھائے تو یاد آئے تم
بہار آئی، صبا آئی، ہر خوشی آئی
سب آئے عید کے مہماں مگر نہ آئے تم
☆ امیمہ اشرف...... اسلام آباد
کتنے ترسے ہوئے ہیں خوشیوں کو
وہ جو عیدوں کی بات کرتے ہیں
☆ فائزہ طاہر...... ملتان
فقط میں اس لیے خود کو بہت مصروف رکھتی ہوں
کہ فرصت میں کسی کو دھڑکنیں آواز دیتی ہیں
☆ راحیلہ...... لاہور
تعبیر جو مل جاتی تو اِک خواب بہت تھا
جو شخص گنوا بیٹھے ہیں نایاب بہت تھا
میں کیسے بچا لیتا بھلا کشتیِ دل کو
دریائے محبت میں سیلاب بہت تھا
☆ رفعت ناز...... کراچی
کچھ نہ پا کر مطمئن ہیں ہم
عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے



www.paksociety.com



☆ نازیہ شفیق...... جہلم
خواہشات کے سب دیپ بجھا دیے میں نے
تجھے پانے کے بعد کسی شے کی کمی نہ رہی
☆ فرزانہ رحمن...... سرگودھا
وابستہ ہو چکی تھیں کچھ امیدیں آپ سے
امید کے چراغ بجھانے کا شکریہ
☆ شاہین رشید...... حیدرآباد
میں کہ تنہا اعتبارِ ذات کھونے سے ہوا
جو ہوا وہ دل میں شک کا بیج بونے سے ہوا
☆ کومل ستار...... مانسہرہ
کچھ تو تنہائی کا احساس مجھے کم ہوگا
میرے سائے کو گر مجھ سے ملا دے کوئی
☆ تبسم...... بھلوال
جہاں جاتا ہے میرا ذکر وہ کرتا ہے نفرت سے
یہ اس کی مہربانی ہے مجھے بھی ساتھ رکھتا ہے
☆ سائرہ رانی...... خانیوال
ملتا رہا وہ خواب میں کتنے خلوص سے
آنکھیں کھلیں تو خواب کی تعبیر ہم نہ تھے
☆ اریبہ ضیا...... سکھر
چار روزہ زندگی پر کیا گمانِ زندگی
چند قدموں ہی چلے گی داستانِ زندگی
☆ نازیہ کنول...... میاں چنوں
ہمارے پاس کیا تھا جو اسے غارت کوئی کرتا
تمہارے بعد کیا ہے جو ڈریں برباد ہونے سے
☆ صائمہ امین...... لاہور
اتنا تسلسل تو میری سانسوں میں بھی نہیں فراز
جس روانی سے وہ شخص مجھے یاد آتا ہے
☆ فاخرہ ممتاز...... شیخوپورہ
میں کب کی زرد فضا میں بکھر چکی ہوتی
مجھے تو میری شکستوں نے پھر سنبھالا ہے
☆ رافعہ شہاب...... ساہیوال
بعض مخلص بھی نظر میں نہ جچے اے دانش
پائے کثرت سے وہ اپنوں میں پرائے ہم نے
☆ ثمرینہ نعیم...... کراچی
ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دلوں کے بادباں سمٹے ہوئے ہیں
☆ میمونہ عزیز...... اسلام آباد
یہ بوند بوند سی بارش کسی کی یادوں کی
مرے یقین کا کچا مکاں گرائے گی
☆ سونیا سرور...... کراچی
ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر کام میں عجلت کرنا
☆ میراں شاہ...... کوئٹہ
بے خبر سا تھا مگر سب کی خبر رکھتا تھا
چاہے جانے کے بھی عیب و ہنر رکھتا تھا
اس کی نفرت کا بھی معیار جدا ہے سب سے
وہ الگ اپنا اِک اندازِ نظر رکھتا تھا
☆ عائشہ نعیم...... کراچی
وقت نے دھندلا دیے کیسے شناسائی کے رنگ
جس طرح یہ خواب ہو پہلے کبھی دیکھا ہوا
☆ کرن داؤد...... نواب شاہ
نامرادانِ محبت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں
☆ ارم شہزاد...... چکوال
کاش وہ وقت بھی آئے کہ میں اپنے گھر میں
لوٹ کر آؤں، تجھے سامنے بیٹھا دیکھوں
☆ نازنین سراج...... فیصل آباد
دنیا میں اب خلوص ہے بس مصلحت کا نام
بے لوث دوستی کے زمانے گزر گئے



WWW.PAKSOCIETY.COM

# خوش ذائقہ

## پاکیزہ بہنیں

### بالائی کی سویاں

اشیا: سویاں، ایک کلو۔ کشمش، ایک پاؤ۔ شکر، ایک کلو۔ گھی، ایک چھٹانک۔ بالائی، ایک کلو۔ بادام پستے، تین چھٹانک دودھ، ایک کلو۔ زردے کا رنگ، آدھا چائے کا چمچ۔ لونگ، الائچی، تین سے چار عدد۔

ترکیب: پہلے گھی میں لونگ، الائچی کا بگھار دے کر سویوں کو اس میں ڈال دیں، جب سویاں بادامی رنگ کی ہوجائیں تو دودھ بھی ملادیں، بعد ازاں کشمش صاف کرکے اور بادام پستے کی ہوائیاں کاٹ کر اس میں ملادیں، جس وقت دودھ خشک ہوجائے تو شکر ملا کر دس منٹ تک خوب چلائیں، جب سب ایک جان ہوجائیں تو اس میں زردے کا رنگ ملا کر اور خوشبو کے لیے کیوڑہ اور زعفران حل کر کے ملادیں، دو تین ابال آنے پر اتار لیں۔

ہما انصار.....کراچی

### چپلی کباب

اشیا: قیمہ صاف اور باریک، آدھا کلو۔ گھی، حسبِ ضرورت۔ پیاز باریک کٹی ہوئی، ایک درمیانی۔ ادرک، ایک چھوٹا سا ٹکڑا۔ ثابت دھنیا موٹا کوٹا ہوا، چائے کا آدھا چمچ۔ گرم مسالا پسا ہوا، چائے کا آدھا چمچ۔ انار دانہ کوٹا ہوا، ایک چمچ۔ نمک، ہری مرچ، ہرا دھنیا، حسبِ ضرورت۔ ٹماٹر باریک کٹا ہوا، ایک بڑا۔ مکئی کا آٹا، ایک بڑا چمچ۔ انڈے، ایک یا دو۔

ترکیب: انڈے میں ایک چٹکی نمک ڈال کر پھینٹ لیں پھر توے پر ذرا سا گھی ڈال کر انڈے کی چپٹی سی روٹی (آملیٹ) بنالیں۔ اسے باریک باریک کتر کر قیمہ میں ملانے کے لیے الگ رکھ لیں۔ قیمے میں سارا مسالا، مکئی کا آٹا اور آملیٹ ملادیں اور اچھی طرح مسل کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر ان کے چپٹے چپٹے کباب بنالیں۔ توے پر ذرا سا گھی ڈال کر کباب دھیمی آنچ پر تل لیں۔

ریحانہ وسیع، حیدرآباد

### شیر خورمہ

اشیا: چھوارے، آدھا پاؤ۔ کھوپرا، آدھا پاؤ۔ کنسنٹڈ ملک، ایک چھوٹا ڈبا۔ کشمش، ایک چھٹانک۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ پستہ، پچاس گرام۔ بادام، پچاس گرام۔ سویاں، ایک پاؤ۔ دودھ ڈیڑھ کلو۔ شکر، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: دودھ کو ہلکی آنچ پر دیر تک پکائیں پھر اس میں کنسنٹڈ ملک اور چینی شامل کرکے پکائیں۔ ناریل اور چھوارے باریک کاٹ لیں۔ بادام اور پستے بھی کاٹ لیں۔ اب حسبِ منشا گھی لے کر اس میں بادام، چھوارے، پستہ، ناریل، تل کر نکال لیں۔ لونگ اور الائچی کے دانے ملا کر ہلکی آنچ پر سرخ کرلیں پھر سویاں اس گھی میں تھوڑی سی بھونیں پھر دودھ میں ملادیں۔ ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر پکائیں اتنا پکائیں کہ سویاں اور دودھ یک جان ہوجائیں اور





گاڑھا پن آجائے، اپنی مرضی کے مطابق جتنا گاڑھا کرنا چاہیں کرلیں، مزیدار شیر خورمہ تیار ہے۔

نازیہ وحید، کراچی

### فروٹی کریمی سویاں

اشیا: سویاں، آدھا پیکٹ۔ دودھ، دو کلو۔ فریش کریم، ایک کپ۔ بادام، (کٹا ہوا) دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک کپ۔ گھی، دو کھانے کے چمچ۔ انگور، آدھا کپ۔ آم، ایک چوتھائی کپ۔ سیب، ایک چوتھائی کپ۔ کیلے، آدھا کپ۔ چھوٹی الائچی، پانچ عدد۔ لونگ، دو عدد۔

ترکیب: دودھ میں دو الائچی ڈال کر پکالیں۔ اب ایک پتیلی میں گھی گرم کرکے اس میں الائچی اور لونگ ڈال کر کڑکڑا لیں۔ اب اس میں سویاں ڈال کر بھونیں پھر اس میں دودھ ڈال دیں تھوڑی دیر پکانے کے بعد اس میں چینی ڈال کر پکالیں۔ تھوڑی ٹھنڈی ہونے پر اسے ڈش میں نکال کر اس میں کریم تمام پھل اور بادام ملالیں۔ فروٹی کریمی سویاں تیار ہیں۔

شازیہ افضل......کراچی

### مدراسی بریانی

اشیا: چاول، ایک کلو۔ گوشت، ایک کلو۔ گھی، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ دودھ، حسبِ ضرورت۔ ٹماٹر، ایک پاؤ۔ ہرا دھنیا، ایک گڈی۔ لال مرچ، چند ایک۔ الائچی چھوٹی، پانچ دانے۔ لہسن، آدھا پاؤ۔ ادرک، دو چھٹانک۔ ہری مرچ، آدھا پاؤ۔ پودینہ، ایک گڈی۔ سیاہ زیرہ، آدھا چمچ چائے کا۔ سفید زیرہ، دو چمچ چائے کے۔ لونگ، پانچ عدد۔ دار چینی، تین ٹکڑے۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ زعفران یا زرد رنگ، مناسب مقدار۔

ترکیب: پہلے گھی میں پیاز بھون کر اس میں ثابت ہری مرچ ڈال دیں پھر تھوڑی دیر بعد پودینہ ڈال دیں پھر سفید زیرہ اور باقی گرم مسالا بھی ڈال دیں اور گوشت کو بھون لیں۔ اس میں ٹماٹر اور دہی بھی ڈال دیں۔ جب اچھی طرح بھن جائے تو اس میں تقریباً تین کلو پانی ملادیں اور پکنے دیں۔ جب پانی میں دو چار ابال آجائیں تو اس میں چاول دھو کر ڈال دیں۔ کچھ دیر تک پکنے دیں جب دم ہونے کے قریب آجائیں تو دم دینے سے پہلے دودھ میں زعفران یا زرد رنگ گھول کر ڈال دیں اور مزید پکنے دیں۔ جب چاولوں کی ایک کنی رہ جائے تو دم پر لگادیں اور پندرہ منٹ کے بعد اتار لیں۔ بریانی تیار ہے۔

نوٹ: لیموں کا رس بریانی کی لذت میں اضافہ کرتا ہے اور اس سے چاول کے دانے بھی الگ الگ رہتے ہیں۔ یہ ڈش بہت لذیذ ہوتی ہے اور بہت پسند کی جاتی ہے۔

☆☆☆

SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E
WELCOME BOCK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com



www.paksociety.com

# روحانی مشورے

ادارہ

## شبِ عید

رمضان المبارک کی آخری رات کو شبِ عید کہا جاتا ہے۔ یہ رات بڑی فضیلت والی ہے لہٰذا اس رات میں شب بیداری کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنا چاہیے۔ اس کی فضیلت کے متعلق چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو عیدین کی راتوں میں شب بیداری کر کے قیام کرے اس کا دل نہیں مرے گا، جس دن سب لوگوں کے دل مردہ ہو جائیں گے۔ (ابن ماجہ)

۲۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو پانچ راتوں میں شب بیداری کر کے اللہ کی عبادت کرے اس کے لیے جنت واجب ہے یعنی ذی الحج کی آٹھویں، نویں اور دسویں راتیں، عید الفطر کی رات اور شبِ برات (اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیں تاکہ یاد رہے)

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا... کہ رمضان المبارک کی آخری شب میں اس امت کی مغفرت ہوتی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ شبِ قدر ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ کام کرنے والے کو اس وقت پوری مزدوری دی جاتی ہے جب وہ کام پورا کر لیتا ہے۔ (مسند امام احمد)

نوٹ: اس رات کو زیادہ سے زیادہ استغفار اور نوافل پڑھنے چاہئیں تاکہ رمضان المبارک کے روزے اور عبادت بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوں۔

## توبہ مانگنے کا ایک طریقہ

☆ علامہ یافعیؒ نے "الترغیب والترہیب" میں ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ ایک نوجوان نہایت بدکار تھا لیکن جب وہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب کرتا اس کو ایک کاپی میں نوٹ کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک عورت نہایت غریب، اس کے بچے تین دن سے بھوکے تھے۔ وہ اپنے بچوں کی پریشانی برداشت نہیں کر سکی تو اس نے اپنے پڑوسی سے ایک عمدہ ریشم کا جوڑا ادھار لے لیا۔ وہ اسے پہن کر نکلی تو اس نوجوان نے دیکھ کر اپنے پاس بلایا۔ جب اس کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا تو وہ عورت روتے ہوئے تڑپنے لگی اور کہا کہ میں فاحشہ یا زانیہ نہیں ہوں۔ میں بچوں کی پریشانی کی وجہ سے اس طرح نکلی ہوں۔ جب تم نے مجھے بلایا تو مجھے خیر کی امید ہوئی، اس نوجوان نے اسے کچھ درہم دے کر چھوڑ دیا اور خود رونے لگا اور گھر آ کر اپنی والدہ کو پورا واقعہ سنایا۔ اس کی والدہ اس کو ہمیشہ معصیت (برائی) سے روکتی اور منع کرتی تھی۔ آج یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا بیٹا تو نے زندگی میں یہی ایک نیکی کی ہے، اس کو بھی اپنی کاپی میں نوٹ کر لے۔

بیٹے نے کہا کاپی میں اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ والدہ نے کہا کاپی کے حاشیے پر نوٹ کر لے چنانچہ حاشیے پر نوٹ کر لیا اور نہایت غمگین ہو کر سویا، جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پوری کاپی سفید اور صاف کاغذوں کی ہے۔ کوئی چیز لکھی ہوئی باقی نہیں رہی۔ صرف حاشیہ پر جو آج کا واقعہ نوٹ کیا تھا وہی باقی ہے اور کاپی کے اوپر کے حصے میں یہ آیت لکھی ہوئی تھی۔ (سورۃ ھود ۱۱۴) ترجمہ (بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں) اس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور اسی پر قائم رہ کر مرا۔

## نفلی نمازیں

اشراق: اشراق کی نماز یہ ہوتی ہے کہ فجر کی نماز پڑھ کر اسی جگہ بیٹھے رہیں اور ذکر وغیرہ میں مصروف رہیں۔ دنیا کا کوئی کام نہ کریں پھر سورج نکلنے کے پندرہ بیس منٹ بعد دو رکعت نماز پڑھیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے فجر کی نماز باجماعت پڑھی اور پھر سورج نکلنے تک وہیں بیٹھ کر اللہ



تعالیٰ کا ذکر کرتا رہا۔ پھر دو رکعت پڑھیں تو اس کے لیے ایک حج و عمرہ کے مانند ثواب ہے۔" اس میں اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ جس جگہ فرض پڑھے وہیں بیٹھا رہے۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ اس مسجد میں کسی بھی جگہ بیٹھ جائے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر چلا جائے لیکن ذکرِ الٰہی برابر کرتا رہے۔ سورج نکلنے کے پندرہ بیس منٹ بعد دو رکعت نفل پڑھے تو مذکورہ ثواب حاصل ہوگا۔

چاشت: چاشت کی نماز پڑھنے کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج اچھی طرح سے نکل آئے اور اس پر نگاہ نہ جم سکے تو اس وقت یہ نوافل پڑھے جائیں جن کی کم سے کم تعداد دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہے۔ چاشت کے نوافل زوال کا وقت ہونے تک پڑھے جا سکتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا جس نے چاشت کی دو رکعتوں کا اہتمام کیا اس کے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

اوابین: مغرب کے فرض اور سنتوں کے بعد جو نوافل پڑھے جاتے ہیں انہیں اوابین کہتے ہیں۔ ان کی کم از کم تعداد دو اور زیادہ سے زیادہ چھ ہے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے صاحبزادے محمد بن عمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد محترم....... کو دیکھا کہ وہ مغرب کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے اور بیان فرماتے تھے کہ میں نے محبوبِ خدا حضرت محمدﷺ کو دیکھا کہ آپﷺ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے جو بندہ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھے اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

تہجد: نصف شب کے بعد سو کر اٹھ کر جو نماز پڑھی جاتی ہے اسے تہجد کہتے ہیں، اس کی کم از کم چھ رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہیں۔ بعض جگہ کم از کم دو رکعت بھی لکھی ہیں (واللہ اعلم) حضور اکرمﷺ عموماً آٹھ رکعت پڑھا کرتے تھے حضرت عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری درمیانی حصے میں ہوتے ہیں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ تم ان بندوں میں ہو جاؤ جو اس مبارک وقت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو تم ان میں سے ہو جاؤ۔" حضرت ابو ہریرہؓ تہجد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا۔ "فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل درمیان رات میں پڑھی جانے والی نماز (تہجد) ہے۔" حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ رسولﷺ نے فرمایا۔ "تم ضرور تہجد پڑھا کرو کیونکہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ اور شعار رہا ہے اور قربِ الٰہی کا خاص وسیلہ ہے اور وہ گناہوں کے برے اثرات مٹانے والی، معاصی سے روکنے والی چیز ہے۔ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے سونا شرط نہیں ہے اگر کوئی شخص ساری رات جاگتا رہے تو وہ بھی تہجد کی نماز پڑھ سکتا ہے۔

## قرآن پاک میں حروف تہجی کے مطابق حروف کی تعداد:

| حروف تہجی | حروف کی تعداد | حروف تہجی | حروف کی تعداد |
|---|---|---|---|
| الف | 48740 | ب | 11420 |
| ت | 14400 | ث | 10480 |
| ج | 3322 | ح | 4138 |
| خ | 2503 | د | 5998 |
| ذ | 4934 | ر | 2206 |
| ز | 1680 | س | 5799 |
| ش | 2115 | ص | 2780 |
| ض | 1882 | ط | 1204 |
| ظ | 842 | ع | 9470 |
| غ | 1099 | ک | 8022 |
| ل | 33,922 | م | 28,922 |
| ن | 70,000 | و | 25,506 |
| ہ | 26,925 | لا | 14,707 |
| ی | 25717 | | |

(از۔ کتاب مجموع العلوم و مطلع النجوم رائٹرز عاصمیؔ)



www.paksociety.com

# شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

from Nature for Health

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

## پائیوریا و لیکوریا

میرا مسئلہ لیکوریا ہے۔ پیریڈ سے پہلے اور بعد میں پانی بہت زیادہ آتا ہے۔ یہ میرا 15 سال پرانا مسئلہ ہے اس دوران ٹانگوں اور کمر میں بہت

**ٹوکن**

**برائے شوابے ہومیو کلینک**

**اکتوبر 2012**

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

______________

درد رہتا ہے۔ پیریڈ مجھے نارمل آتے ہیں۔

میرا دوسرا مسئلہ معدے کا ہے۔ صبح میں جب سو کر اٹھتی ہوں تو میرے منہ میں گندہ پانی جمع ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے دانتوں سے بدبو آتی ہے اور منہ کا ذائقہ بھی خراب رہتا ہے۔ ہونٹوں کے گرد بھی یہ پانی جمع ہو جاتا ہے میرے مسوڑھوں سے اکثر خون بھی آتا ہے اگرچہ میں دانتوں کو خوب صاف رکھتی ہوں اور ماؤتھ واش بھی استعمال کرتی ہوں پھر بھی گندے پانی کی وجہ سے دانتوں پر پلاک جم جاتا ہے، رات کو عموماً میں دودھ کے ساتھ سلائس کھاتی ہوں یعنی رات کو بہت ہلکی پھلکی غذا لیتی ہوں۔ دن میں بھی پانی، دودھ، دہی، اور فروٹ کا استعمال کرتی ہوں لیکن پھر بھی منہ کا ذائقہ خراب ہی رہتا ہے۔ ڈینٹسٹ کو بھی دکھا چکی ہوں۔ اس نے دانتوں پر لگا پلاک صاف کر دیا تھا، کچھ دن منہ سے بو نہیں آئی لیکن اب پھر وہی حال ہے۔ برائے مہربانی میرے دونوں مسئلوں کے لیے بہت اچھی ہومیو پیتھک کی دوا تجویز کریں۔ میں نے ہر طرح کے ٹوٹکے



SCHWABE

پیسٹ، مسواک اور منجن وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی مجھے جلد از جلد جواب کر دیں۔ شکریہ۔

والسلام سائرہ کریم (لاہور)

جواب: آپ اپنے منہ کا خیال نہیں رکھ رہی ہیں۔ رات کو سوتے وقت دانتوں کو اچھے پیسٹ یا منجن سے ضرور صاف کریں اور مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے کی استعمال کریں۔

**Calendula-Q** کے 10 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر ہر کھانے کے بعد کلیاں کریں۔

**Mercsol 6 Bovista 30** کے 5،5 قطرے آدھے کپ پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

## قد کیوں نہیں بڑھ رہا؟

السلام علیکم! میری عمر 18 سال ہے، میرا قد 4 فٹ 10 انچ ہے، وزن 39 کلو ہے۔ میں اپنا قد بڑھانا چاہتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ میرا وزن بھی تھوڑا بڑھ جائے، برائے مہربانی کوئی دوا تجویز فرمائیں جس سے میرا قد تیزی سے بڑھے۔

میری بہن کی عمر 16 سال ہے، قد 4 فٹ 10 انچ اور وزن 31 کلو ہے، اسے بھی قد اور وزن بڑھانے کے لیے دوا تجویز فرمائیں۔ مہربانی فرما کر اسی شمارے میں جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

والسلام مریم محمود (ضلع لیہ)

جواب: بی بی نامکمل علامات پر دوا تجویز نہیں کی جاسکتی۔ قد کیوں نہیں بڑھ رہا؟ خاندانی وجہ، ہارمونز کا مسئلہ یا غذائی مسئلہ کوئی ذہنی خلفشار، ورزش کا نہ ہونا اور بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں جن کو دیکھنا پڑتا ہے لہٰذا الگ الگ تفصیل سے اپنے بارے میں بتائیے۔

## جسم کے حساب سے چہرہ پتلا ہے

میری عمر 25 سال ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں، میرا وزن 60 کلو گرام ہے اور قد تقریباً 5 فٹ 2 انچ ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چہرہ جسم کے حساب سے کافی کمزور اور پتلا ہے۔ میں ایک اسکول ٹیچر ہوں، بچوں کے ساتھ کافی محنت کرنا پڑتی ہے، میری مجموعی صحت بالکل ٹھیک ہے بس چہرہ اور گال اندر کو دھنسے ہوئے ہیں جو کہ کافی عجیب لگتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے کوئی ایسی میڈیسن بتائیں کہ میرا چہرہ صحت مند ہو جائے اور باقی جسم پر کوئی اثر نہ ہو۔ میں آپ کی اور ماہنامہ پاکیزہ کی بہت مشکور ہوں گی۔

والسلام سیدہ سبین بخاری (ضلع نارووال)

جواب: ورزش کریں، کام اور آرام میں توازن کریں، متوازن غذا کا استعمال کریں **Kali Phos 30 Calc Phos 30** کے 5، 5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

## قد کا نہ بڑھنا اور سانس

جواب: میری بیٹی 18 سال کی ہو چکی ہے اور قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ قد چار فٹ 9 انچ ہے وزن 53 کلو ہے۔ بیٹی کو سانس کا مسئلہ بھی ہو جاتا ہے، یہ گندم کے موسم میں یعنی اپریل اور مئی میں بیمار ہو جاتی ہے۔ کھانسی اور سانس لینے میں دقت ہوتی ہے پھر دوائیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں ان دوائیوں کی وجہ سے قد بڑھنے سے رک نہ گیا ہو۔

نجمہ شاہین (بہاولپور)

جواب: 2010ء میں آپ کو نسخہ تجویز کیا تھا۔ چار ماہ استعمال اور وہ بھی نامکمل علامات کے ساتھ، ایسے میں مریض کو کیسے صحیح دوا تجویز کی جاسکتی ہے؟ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی **Bacillinum**



www.paksociety.com

200 کے 5 قطرے ہر ہفتے ایک گھونٹ پانی میں لیں اس کے ایک دن بعد Arundo 30، 30 Ferrum Calc Phos
30 Phos کے 5،5 قطرے ½ کپ پانی میں دیں۔ 3 ماہ بعد حال بتائیں۔ ورزش کرائیں اور متوازن غذا بھی دیں۔

## جسم پر بال و چھوٹا قد

السلام علیکم! مسئلہ میری بیٹی کا ہے جو مئی میں ساڑھے دس سال کی ہو جائے گی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے سارے جسم پر ہلکا رُواں تھا پھر جوں جوں بڑی ہوتی گئی بال بڑے اور گھنے ہوتے گئے۔ ٹانگوں پر رانوں تک ہیں بازوؤں پر کاندھے تک۔ زیادہ مسئلہ بازوؤں کا ہی ہے۔

دوسرا مسئلہ بچی کے قد کا ہے جو کہ اپنے ہم عمر بچوں سے چھوٹا ہے۔

یاسمین مسعود (اسلام آباد)

جواب: بچی کو متوازن غذا دیں، کھیل کود اور ورزشیں کرائیں۔ ساتھ میں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 4 ماہ تک دیں۔
Calc.Phos 30,Oleum jec 3x
5،5 قطرے ½ کپ دن میں 3 مرتبہ دیں۔

## سر کی جوئیں اور چہرے کے دانے

میرا مسئلہ بڑا سنگین ہے اور بہت پرانا۔ میری عمر چوبیس سال ہے میرے منہ پر بے شمار دانے نکلتے ہیں بھی میرے منہ پر بھی میری ٹھوڑی پر۔ دانے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں پھر بعد میں ان میں پیپ پڑ جاتی ہے اور بعد میں داغ بھی رہ جاتے ہیں۔ یہ میری زندگی کا سنگین مسئلہ ہے کچھ اچھا حل بتا دیں جو کہ مستقل حل ہو۔

میرا دوسرا مسئلہ ہے کہ میرے سر میں جوئیں بہت جلد پڑ جاتی ہیں۔ آپ یقین کریں میرا سر ہمیشہ صاف ہوتا ہے میں اپنے سر کی بہت کیئر کرتی ہوں لیکن اس سب کے باوجود جوئیں ختم نہیں ہوتیں۔ ہر دیسی ٹوٹکا آزما چکی ہوں، کچھ لوگ کہتے ہیں میرا خون میٹھا ہے اس لیے مچھر بھی جلد کاٹتے ہیں اور جوئیں بھی پڑتی ہیں۔

ربیعہ (ساہیوال)

جواب: بالوں کو کسی اچھے شیمپو سے ایک دن بعد دھوئیں اور کنگھی کریں۔ چہرے کو بھی دن میں پانچ مرتبہ اچھے فیس واش سے دھوئیں۔ عمومی صحت کا خیال رکھیں، متوازن غذا اور ورزش کیا کریں۔ صبح سویرے کی چہل قدمی ایک اچھی ورزش ہے۔ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ Staphisagria30, Acid Carbolic 30
CalcSulph30 کے 5،5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور شوابے کی CalendulaQ کا لوشن بنا کر چہرے پر لگائیں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔

## لمبے قد کی خواہش

میرا نام محمد علی ہے اور میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں MBA کے آخری سمسٹر کا طالبعلم ہوں۔ اس سال نومبر میں میری عمر 26 سال ہو جائے گی۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد 5 فٹ 3 یا 4 انچ ہے اور میرا وزن 48 کلوگرام ہے۔ میں نے ایک سال قبل قد بڑھانے کے لیے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے رابطہ کیا تھا جنہوں نے میرے ٹانسلز کا مسئلہ بتایا تھا، انہوں نے میرے ٹانسلز دبا کے دیکھے تھے تو مجھے تھوڑا سا درد بھی ہوا تھا پھر انہوں نے قد بڑھانے کے لیے سبز رنگ کی دوا کے 10 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں تین بار پینے کو دیے، اس کے علاوہ سفید رنگ کی گولیوں کی ڈبی بھی دی تھی جو 5،5 گولیاں دن میں تین بار کھانی تھیں۔ مجھے دونوں دوائیوں کے نام یاد نہیں ہیں۔ میرے ابو اور بہن بھائیوں کا قد مجھ سے بڑا ہے مگر میری امی کا قد میرے جتنا ہے۔ میں اپنا قد 5 فٹ 7 انچ یا 8 انچ تک کرنا چاہتا ہوں اگر اس کے لیے سخت محنت کرنا پڑے تو کروں گا اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے لیے اچھی دوا تجویز کریں تاکہ میں اپنی زندگی اچھے اور خوبصورت انداز میں گزار سکوں۔ مجھے لگتا ہے میرے قد کا بڑھنا بہت مشکل ہے۔

محمد علی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی (اسلام آباد)

جواب: آپ ماشاءاللہ پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی ہیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ دراز قد سے آدمی کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کا قد ایک اچھا مناسب قد ہے اور باقی اعضا بھی نارمل ہیں۔ میرے محترم آپ کسی فراڈ میں نہ آئیے اس لیے کہ صرف 19 سال تک قد بڑھتا ہے اس کے بعد ناممکن ہے لہٰذا اپنے اندر کمال فن پیدا کریں۔ قد سے کچھ نہیں ہوتا عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

## سورائسس

میں نے ایک مرض Psoriasis کی تشخیص اور علاج کے لیے خط لکھا تھا جس کا جواب نومبر 2011 کے پاکیزہ شمارے میں شائع ہوا تھا۔ نقل منسلک ہے قدرے تاخیر سے آپ کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال شروع کیا جس کو تقریباً دو ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دواؤں کے استعمال سے افاقہ بہت معمولی ہوا ہے۔ پہلے خارش ہوتی تھی دونوں پاؤں میں تو کھجانے سے خون بھی نکل آتا تھا اب ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں پاؤں میں ورم موجود ہے اور ورم کے ساتھ سرخی بھی بدستور قائم ہے۔

اس کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ سے گزارش ہے کہ کیا ان ہی دواؤں کا استعمال جاری رکھوں۔ اگر ایسا ہے تو کب تک؟ یا آپ دواؤں میں کوئی ردوبدل تجویز کریں گے۔

مسز صادقہ رحمٰن کراچی

جواب: Bacilinum 1M کی ایک خوراک ہر 2 ہفتے بعد لیں بقیہ وہی دوائیں استعمال کریں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

## جسم پر بال اور آنکھوں کی کمزوری

میری عمر اکیس سال ہے۔ میں نے بی۔اے کیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے، بازوؤں، ٹانگوں اور پورے جسم پر بال ہیں، چہرے پر چھوٹے چھوٹے، بازوؤں پر آدھا انچ اور ٹانگوں پر ایک ایک انچ لمبے بال ہیں، بال بہت سخت اور گھنے ہیں۔ مجھے ماہواری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ماہواری ہر مہینے ٹھیک آتی ہے۔ میرا دوسرا مسئلہ آنکھوں کا ہے میری نظر کمزور ہے اور اتنی کمزور ہے کہ میں دس فٹ دور سے کوئی تحریر لکھی ہوئی صاف نہیں پڑھ سکتی۔ اس کے علاوہ میرے سر میں درد ہوتا ہے۔ سر کے درد سے اچانک آنکھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ درد دائیں آنکھ سے شروع ہو کر بائیں آنکھ میں ہونے لگتا ہے۔ درد بہت تیز ہوتا ہے اگر دوائی لے لوں تو ٹھیک ہو جاتا ہے پھر اگر میں موبائل زیادہ استعمال کروں یا کمرے میں بیٹھ کر پڑھ لوں تو آنکھوں میں درد ہونے لگتا ہے اور آنکھیں تھوڑی میلی بھی ہوگئی ہیں۔ پلیز میرے مسئلے کی طرف ضرور توجہ دیں میں بہت پریشان اور دکھی ہوں۔ میں نے بہت امیدوں سے آپ کو خط



www.paksociety.com

لکھا ہے۔

نور فاطمہ (بہاولنگر)

جواب: آنکھوں کی کمزوری کے متعلق تو نہیں بتایا کہ کب سے کمزوری شروع ہوئی ٹیسٹ کرایا کہ نہیں، کتنا نمبر ہے جب یہ اتنی کمزور ہیں تو چشمہ کیوں نہیں لگایا بہر حال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں اور 3 ماہ بعد تفصیل سے بتائیں۔

Oleum jec 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ، Calc Phos 30 Calc Flour 30, Ruta 30 کے 5،5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ کھانے میں بادام، ہری سبزیاں، گاجر، آم وغیرہ کا استعمال خصوصی طور پر رکھیں۔

## حافظہ کی کمزوری

میرے بیٹے کی عمر بارہ سال ہے اور پانچویں میں پڑھتا ہے۔ اس کا حافظہ بہت کمزور ہے اس کو سبق یاد نہیں ہوتا۔ رات کو یاد کرے تو صبح بھول جاتا ہے۔ تھوڑا سا پڑھ لے تو کہتا ہے کہ میں تھک گیا ہوں یاد نہیں ہو رہا۔ اور اس کو بھوک بھی بہت کم لگتی ہے ہر وقت تھکا تھکا سا رہتا ہے۔ بہت اچھی سی دوا لکھ کر دیں۔

نجمہ شاہین (بہاولپور)

جواب: آپ کے بچے کی عمومی صحت اچھی نہیں لگتی اس لیے اسے متوازن غذا دیں اور ورزش کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے کا Alfafa Q کے 10،10 قطرے ½ کپ پانی صبح، دوپہر، شام ہر کھانے کے بعد پلائیں۔ Cratex کی ایک گولی صبح و شام کھلائیں۔

ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

## گلے میں انفیکشن

محترم: میری نواسی کی عمر دو سال ساڑھے چھ ماہ ہے۔ اس کے ٹانسلز اور ناک کے غدود بڑھ گئے ہیں، آئے دن اس کے گلے میں انفیکشن رہتا ہے اور بخار اور نزلہ بھی اکثر ہو جاتا ہے۔ وہ ان دنوں اپنے والدین کے ساتھ جدہ میں رہائش پذیر ہے اس کی والدہ خود M.B.B.S ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں اور اب جدہ میں بھی کافی ڈاکٹروں سے علاج کروایا ہے وقتی طور پر آرام آجاتا ہے تمام ڈاکٹر مستقل علاج کے لیے آپریشن تجویز کرتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ہومیو پیتھی میں اس کا کوئی علاج ہے اگر ہے تو تجویز کریں۔ مہربانی کر کے جواب ضرور دیں ہم بہت پریشان ہیں۔ ٹانسلز کی وجہ سے بچی کچھ کھا بھی نہیں سکتی اگر زبردستی کھلائیں تو قے آجاتی ہے۔ شکریہ

سلمٰی لطیف (شالیمار ٹاؤن لاہور)

جواب: ہومیو پیتھی میں یقیناً بڑا شافی علاج ٹانسلز و ناک کے غدود کا ہے لیکن اس کے لیے آپ نے بچی کی بڑی ناکافی علامات لکھی ہیں۔ بہر حال فی الحال ایک ماہ تک بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ptk 31 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسنے کو دیں۔ کھٹی اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ ان میں کولڈ ڈرنک، آئس کریم، کیچپ، پیزا، برگر شامل ہیں۔

***

Dr. Willmar Schwabe , Germany.
Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM